

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

APRIL 2011

پاکستان کا ایشیا نامہ

شعاع

سوسائٹی

ڈاٹ کام

www.paksociety.com

Digests of Pakistan

www.Paksociety.com

عقیدت کے سبھی قبول پر نور ہو گئے
اشعار میری نعت کے منظور ہو گئے
نعت حبیب جب بھی کہی میں نے خجوم گئے
آزار میری جاں کے سب دور ہو گئے

مہک پھولوں کی، بے بس کی نوا تو
سحر کا نور تو، جانِ صبا تو
درونِ داغِ دل مایہ ناز شبنم
دُورِ یاس میں آو رسا تو

عشقِ رسول میں گرے آنسو فور میں
آنکھوں کے جو دریچے تھے پر نور ہو گئے

کبھی ساحل پہ تو حرفِ تمنا
کبھی گرداب میں حرفِ دعا تو

جو پڑھ سکے نہ آج تک کلمہ طیب
رحمت سے اپنے رب کی بہت دور ہو گئے

کہیں قوسِ قزح میں رنگ تیرا
کہیں کالی گٹھاؤں میں ملا تو

یہ آپ کا کرم ہے کہ الفاظِ نعت کے
مدینے کے طول و عرض میں مشہور ہو گئے

توئی سب بے سہاروں کا سہارا
نہیں جس کا کوئی اُسس کا ہوا تو

جب سے حریمِ پاک سے وابستگی ہوئی
غم لمبے روز و شب میرے کا فور ہو گئے

گی میں عکسِ شبنم میں، ہوا میں
ہوا محسوس مجھ کو بار بار تو

سہرابِ مت دُرّ و سنویرِ غیب کی صدا
اشکِ وفا سبھی تیرے پر نور ہو گئے
سہرابِ جنگِ لدھیانوی

میں اک قطرہ، تو بے پایاں سمندر
میں مشتِ خاک اور ارض و سما تو
بشیرِ عجا

شاعر کا پرل کا شمار دے حاضر ہیں۔
استدانی دُور سے آج تک انسان نے مثالِ ترقی کی ہے اس کے باوجود آج بھی قدرتی آفات
کے سلسلے میں ہے۔ فطرت کی اسی تہ ناک کا شکار مایاں ہوا ہے لیکن زندہ قومیں آفات کا متاثر نہ ہوتی
ہمّت اور خود داری سے کرتی ہیں۔ جاپانی حکومت اور قوم اس کی مثال ہے۔ ہمارے پاس سیلاب آیا اور
بتیاں ڈلو گئیں۔ متاثرین کی بحالی کے لیے آج تک کچھ نہ ہو سکا اس کے برعکس جاپان میں حکومت اور حکومتی
ادارے جس طرح لوگوں کی مدد کے لیے متحرک ہوئے اور عوام بھی انتہائی دیانت داری اور اپنی مدد آپ کے
اصولوں کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔
میں اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے۔ قدرتی وسائل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ہمارے عوام محنت کش
اور دیانت دار ہیں۔ ہماری بد نظمی تو وہ چند کوتاہ بین اور مفاد پرست لوگ ہیں جو حقوقِ اقتدار میں ہر مد
سے گزر جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ نا انصافیوں، محرومیوں اور نا اہلی کی نا اہلی نے ہمیں اس مال کو پہنچا
دیا ہے کہ آج ہمارا پورا ملک دہشت گردی کی آگ میں جل رہا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین۔

سائنس اور محال

ادارہ خواتین و تحریک کے انتہائی اہم کارکن شہیرا محمد مختصر عالمات کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہ گئے۔
شہیرا صاحبہ گزشتہ بیس سال سے ادارہ سے وابستہ تھیں۔ نہایت مخلصی اور دیانت دار جو اپنے فرائض
جہادِ خند داری سے انجام دیتے تھے۔ ان کے خلوص اور محنت کی وجہ سے ادارہ کے تمام لوگوں کے دلوں
میں ان کے لیے خاص عزت اور محبت تھی۔ ان کی وفات ہم سب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اہلِ فاقہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- عفتِ حرمِ طہر کا مکمل ناول۔ یوں ہی الفت سی ہو گئی تھی،
- جلیلہ عزیز کا مکمل ناول۔ شرارت،
- سائرہ عارف، رضوانہ نگار، عدنان اور لبنی طاہر کے ناولٹ،
- عائش قاضی، شاہد ملک، سعیدہ رئیس، ام طیفور، سیرتہ بیگم خان اور سائرہ رضا کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے سلسلے وار ناول،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- مبتکران کی یادیں باقیں،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ امادیت کا سلسلہ،
- شاعری سچ بولتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- آپ کی رائے ہمیں آپ کی استدراود سائنس سے آگاہ کرتی ہے۔ اور ہم اسی کی روشنی میں پر جا ترتیب
دیتے ہیں آپ کی رائے جاننے کا فورہ آپ کے خطوط اور ای میلز ہیں۔ انہیں خط ضرور لکھیے گا۔

کوڑھ کا مرض

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کوڑھی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ ہالے میں ڈال دیا (اور اسے کھانے میں شریک کر لیا) پھر فرمایا۔
”کھا“ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے۔“

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جذام کے مریضوں کو بھٹکی یا نہ کر نہ دیکھو۔“

فوائد و مسائل

- (1) ایسے مریض کو مسلسل دیکھنے سے اس کا دل دکے گا لہذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔
- (2) کسی بھی مصیبت زدہ کو دیکھ کر اہستہ آواز سے یہ دعا پڑھنی چاہیے۔

ترجمہ : ”اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس بیماری سے عافیت میں رکھا جس میں مجھے مبتلا کیا اور اپنے پیدا کیے ہوئے بہت سے لوگوں پر مجھے فضیلت بخشی۔“
اس کی برکت سے دعا ہے کہ وہ اس بیماری سے محفوظ رہے گا۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث 38920)

حضرت عمرو اپنے والد حضرت شریف ثقیفی سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔
قبیلہ تغلبہ کے وفد میں ایک مجذوم آدمی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیغام بھیجا۔
”وایس چلا جا“ ہم نے تمہاری بیعت لے لی۔“

فوائد و مسائل

- (1) ”مجذوم کو چاہیے کہ عام لوگوں سے الگ رہے تاکہ لوگوں کو اس سے تکلیف نہ پہنچے۔“
- (2) بیعت ایک وعدے کا نام ہے اس میں مصافحہ صرف تاکید کے لیے ہوتا ہے بغیر مصافحے کے بھی بیعت ہو جاتی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے بیعت لیتے وقت ان سے مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، الاحکام، باب بیعتہ النساء، حدیث 7240)

جاوہ کا بیان

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ ”قبیلہ بنو زریق کے ایک یہودی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جلاو کیا۔ اس شخص کا نام لیدین اعصم تھا۔ حتی کہ یہ حالت ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ آپ فلاں کام کر لیں گے اور اسے کرنہ سکتے ایک دن یا ایک رات کی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب دعا کی۔ اس کے بعد فرمایا۔

”عائشہ! کیا تجھے معلوم ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے جس کام کے بارے میں رہنمائی طلب کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں میری رہنمائی فرمادی ہے میرے پاس دو آدمی آئے ایک میرے سر کے قریب بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ میرے سر کے پاس بیٹھے ہوئے نے میرے پاؤں کے پاس بیٹھے ہوئے سے پاپاؤں کے پاس بیٹھے ہوئے نے سر کے پاس بیٹھے ہوئے سے کہا۔

”ان کو کیا تکلیف ہے؟“
دوسرے نے کہا۔ ”ان پر جاوہ کیا گیا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”جاوہ کس نے کیا؟“

جواب دیا۔ ”لیدین اعصم نے۔“

اس نے کہا۔ ”کس چیز میں؟“

اس نے کہا۔ ”تنگی میں تنگسی کے ساتھ اترے ہوئے (سر کے) بالوں میں اور نہ کجیور کے خوشے کے خلاف میں۔“

اس نے کہا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ذی اردان کے کنوس میں۔“
ام المؤمنین بیان فرماتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند صحابہ کے ہمراہ اس کنوس پر تشریف لے گئے وہاں آنے کے بعد فرمایا۔

”قسم اللہ کی عائشہ! اس کنوس کا پانی ایسا تھا جیسے پانی میں مندی بھگوئی گئی ہو اور کجیور کے درخت ایسے تھے جیسے شیطانوں کے سر۔“

میں نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے اسے جلا کیوں نہ دیا؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”نہیں! مجھے تو اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی ہے اور میں نہیں پسند کرتا کہ لوگوں میں اس کی وجہ سے شرم پھیلاؤں۔“
پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ چیزیں دفن کر دی گئیں۔

فوائد و مسائل

- (1) جاوہ ایک شیطانی عمل ہے جس کی وجہ سے انسان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔
- (2) جاوہ حرام اور کفر ہے کیونکہ اس میں شیطانوں سے مدد مانگی جاتی ہے اور اس طرح کے الفاظ کہے جاتے ہیں جن میں شیطانوں کی تعریف ہوتی ہے اور تکبر یا تکبر ہوتی ہے۔
- (3) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جاوہ کا اثر ہو جانا منصب نبوت کے متنافی نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جاوہ گروں کے جاوہ کی وجہ سے ان کی رسیوں اور لائیوں کو سناپ سمجھ کر ڈر گئے تھے۔ (سورہ

طہ 66، 67)

(4) یہودی جاوہ کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ محفوظ رکھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت ہے۔

(5) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی جاوہ کے اثر سے کمزوری اور کسلندی محسوس کی یہودی کو معلوم ہو چلا کہ جاوہ کے عمل میں کوئی نہیں رہ گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے جاوہ کے ہونے کے باوجود اپنے نبی کو محفوظ رکھا جس طرح

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر ہلا گوشت کھا دیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم زہر کے اثر سے محفوظ رہے۔ (6) بعض لوگوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا کہ اس سے کفار کے اس الزام کی تائید ہوتی ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جاوہ کا اثر ہے جس کا ذکر فرقان آیت نمبر 5 میں ہے لیکن یہ اعتراض اس غلط ہے کہ کفار قرآن مجید کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور محنت کو جنوں اور جاوہ کا اثر دیتے تھے اس حدیث کا کفار کے اس قول سے کمال تعلق نہیں۔

(7) نبی انسان ہوتے ہیں اس لیے وہ جسمانی تھک اور ذہنی پریشانی سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ جس طرح طاقتور اور احد میں کفار کے ہاتھوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے یہ چیز منصب نبوت کے متنافی نہیں۔

(8) نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشکلات کے حل کے لیے اللہ سے دعا فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ پریشانی دور فرماتا تھا۔

(9) نبی صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں تھے البتہ وحی کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیبی امور کی اطلاع دے دی جاتی تھی۔

(10) جن چیزوں کو جاوہ کے عمل میں استعمال

جائے انہیں جلاوطن کیا زمین میں وہاں پلور سے بھرے
(11) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے
کو زیادہ اہمیت نہیں دی تاکہ بے فائدہ تشریف نہ ہو بلکہ
مہر فرمایا اور یہودیوں کو سزا بھی نہیں دی۔
(12) اس کو اس کے پانی کا رنگ غالباً عدم استعمال
کی وجہ سے تبدیل ہو گیا تھا اور مہندی کے پانی کی طرح
سرخ معلوم ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

تقدیر

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ ام
المومنین ام سلمہؓ نے عرض کیا۔
”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے
جو زہریلی بکری کا گوشت کھایا تھا اس کی وجہ سے آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال تکلیف ہو جاتی ہے۔ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”مجھے اس کی وجہ سے جو مصیبت پہنچی ہے وہ تو
اس وقت میری تقدیر میں لکھی جا چکی تھی جب کہ آدم
علیہ السلام ابھی مٹی (کی شکل) میں تھے۔“

پریشانی اور بے خوابی

حضرت خولہ بنت حکیمؓ سے روایت ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اگر کوئی شخص کسی منزل پر ٹھہرتے وقت یہ دعا
پڑھے۔ تو اس کے کوچ کرنے تک اس منزل میں
کوئی چیز تکلیف نہیں پہنچائے گی۔ (یعنی ہے)
”وایک کلمہ اللہ الامت من شرا خلق“
ترجمہ: ”میں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز کے شر سے“
اللہ کے کمال کلمات کی پناہ میں آتا ہوں۔“

فوائد و مسائل

(1) سفر میں کسی مقام پر دوپہر یا رات کو آرام کرنے
کے لیے رکن یا پڑے تو جانوروں کو بٹھا کر سالن آباد کر دینا
وعاجزہ سنگ چاہیے۔

(2) کسی ہوٹل میں ٹھہرتے وقت بھی اپنے کمرے
میں داخل ہو کر یہ دعا پڑھ لیں۔
(3) اللہ کی تعریف کے کلمات اور اللہ تعالیٰ کے
اسمے حسنی اور صفات مقدسہ کے ذکر میں بہت
برکات ہیں۔
(4) اللہ کی صفات کی پناہ لینے سے عرواۃ اللہ کی ذات
کی پناہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف
ہے۔

شیطان سے بچاؤ

حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ سے
روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔
”جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
طائف میں عامل مقرر فرمایا تو مجھے نماز میں (پریشان
کرن) خیالات آنے لگے حتیٰ کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چلا
کہ میں نماز میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ جب میں نے یہ
صورت حال دیکھی تو میں سڑک کے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب سے)
فرمایا۔

”ابن ابی العاص ہو؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں“ اے اللہ کے رسول صلی
اللہ علیہ وسلم؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم آئیں
مجھے“
میں نے کہا۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم؟“
مجھے نماز میں ایسی صورت حال پیش آتی ہے کہ مجھے یاد
نہیں رہتا کہ میں نماز میں کیا پڑھ رہا ہوں۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ شیطان کی
طرف سے (شرارت) ہے۔ میرے قریب آؤ۔“

میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گیا اور
چبھوں کے بل بیٹھ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
میرے سینے پر ہاتھ مارا اور میرے منہ میں تھنکارا اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کے دشمن اٹکل چل۔“

آپ نے تمہیں یاد اس طرح کیا پھر فرمایا۔

”اپنے کام پر چلے جاؤ۔“

حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ ”میری عمر گواہ ہے کہ اس
کے بعد شیطان نے مجھے پریشان نہیں کیا۔“

فوائد و مسائل

شیطان مومن کو نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش
کرتا ہے۔
شیطان کے وسوسے پریشان کن حد تک بھی پہنچ
سکتے ہیں۔ اس صورت میں دعا کرنا اور معوذتین وغیرہ
پڑھنا مفید ہے۔

باب : ۱۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے وصیت فرمائی تھی؟

۳۳۵۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت
ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حج کے میں) نہ
کوئی دنار پھوڑا نہ درہم نہ کوئی بکری نہ اونٹ اور نہ
آپ نے کسی چیز کے بارے میں وصیت کی۔“

فوائد و مسائل : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس بارے میں یہ فرمایا تھا۔ ”میرے وارث و تار
اور درہم تقسیم نہیں کریں گے۔ میری بیویوں کے
خرج اور عیال کے اخراجات کے بعد جو بچے وہ صدقہ
ہے۔“ (صحیح البخاری) ”وصایا“ باب نفقۃ القیم
للوقت حدیث : ۲۷۷۱

۳۳۶۔ حضرت طلحہ بن مصنفؓ سے روایت ہے
انہوں نے کہا۔ ”میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ
سے کہا۔

”کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز
کے بارے میں وصیت فرمائی؟“

انہوں نے فرمایا۔ ”نہیں۔“
میں نے کہا۔ ”تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

مسلمانوں کو وصیت کا حکم کیسے دیا؟“
انہوں نے فرمایا۔ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
اللہ کی کتاب (پر عمل کرنے) کی وصیت کی تھی۔“
حضرت زہریؒ بن شریح بن لہب۔

”کیا حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے وصی کو نظر انداز کر کے امیر بن سکتے تھے؟ حضرت
ابو بکر صدیقؓ تو یہ چاہتے تھے کہ انہیں رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی کسی کے حق میں وصیت مل جاتی، خواہ
وہ ان کی ناک میں ٹیکل ہی ڈال لیتا۔“

فوائد و مسائل : مسائل کا سوال خلافت کی
وضیعت کے بارے میں تھا۔ حضرت ابن ابی اوفیٰؓ نے
واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم
کی کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ مسائل کا دوسرا سوال ایک
افعال کا اظہار ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے عام مسلمانوں کو وصیت کا حکم دیا ہے تو خود بھی
وصیت کی ہوگی، مخصوصاً ”خلافت جیسے اہم معاملے میں
ضرور فرمایا ہو گا کہ میرے بعد قتال خلیفہ ہو گا تو جواب
میں فرمایا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
پورے قرآن پر عمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی جس
میں یہ حکم بھی ہے۔ ترجمہ ”تمہ (مسلمانوں) میں سے
جو صاحب امر ہوں ان کا حکم ہوں۔“

۳۳۷۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے
انہوں نے فرمایا۔ ”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی وفات کا وقت آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
سانس اٹک رہا تھا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے سب سے زیادہ یہ وصیت کی۔

”نماز اور تمہارے مملوک۔“

۳۳۸۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے
انہوں نے فرمایا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
آخری کلام یہ تھا۔

”نماز اور تمہارے مملوک۔“

فوائد و مسائل : اسلام میں سب سے زیادہ
اہمیت نماز کی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مجلس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق سے برستی سے محفوظ رکھیں۔

نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔
”میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کریں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا مجھے بھی ثواب ملے گا؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہاں۔“
فوائد و مسائل : انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا ثواب پہنچتا رہتا ہے جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے اسی طرح اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے جو والدین کی وفات کے بعد ان کی طرف سے کرے۔

فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔
آج کل ایصالِ ثواب کے نام سے جو محفلیں برپا کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں ان کی نیشیت شخص ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کسی شخص کی مناسبت اور گویا جائے۔

قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی میں جس طرح زندگی میں نیابت ممکن ہے اسی طرح وفات کے بعد بھی کسی کا قرض و سراودی ادا کرے تو فوت شدہ شخص بری القصد ہو جاتا ہے۔

نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی نماز کی تاکید فرمائی۔ غلاموں کا طبقہ معاشرے کا ایک مظلوم طبقہ تھا جسے اسلام نے اپنی عزت دی کہ غلام بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے۔ خاندانِ غلامان کی بلوغت پر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ترجمہ : ”اے اللہ! بند مرتبہ ساتھیوں سے ملادے۔“ (صحیح بخاری)

جس طرح ہم خاندانی معاملات کے بارے میں وصیت کرتے ہیں، اسی طرح دین کے احکام پر عمل کرنے کی بھی وصیت کرنی چاہیے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت دین اور دنیا دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام میں دونوں کو برابر اہمیت حاصل ہے۔

باب : ۸۔ جو شخص وصیت کے بغیر فوت ہو جائے کیا اس کی طرف سے صدقہ کیا جاسکتا ہے؟

۱۷۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے ”ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ ”میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟“
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہاں۔“

۱۷۲۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے ایک آدمی



خط بھجوانے کے لیے پتا

ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khanawateeridigest.com
shuaamonchly@yahoo.com

آپ کی عالیت مسلماتی اور خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ حاضر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم کو، آپ کو اور ہمارے ہمارے وطن کو سلامت رکھے وہ لوگ جو کسی بھی تعصب کی بنیاد پر قوم کو ٹکڑوں میں بانٹنا چاہتے ہیں ان کو اور ان کے اراکوں کو نیست و نابود کرے۔ آمین۔

پسلا خط و کینٹ سے یا سمین مغل کا ہے، نکستی ہیں۔

اس بار مہیج کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے تو دوڑ کا کر رخسانہ نگار دکان کے ”کوئی دیکھ ہو“ تک پہنچے اپنا آٹا چڑھاؤ ”ایسا مینس“ ایسے پرچی موڑ۔ ایسی گالی جس کا اسلوب نہایت سادہ، پلاٹ نہایت مضبوط اور کردار نگاری نہایت دلکش ہے۔ جس کی نیت ایسی مہارت سے کی گئی ہے کہ کوئی ایک سین بھی ڈانڈ محسوس نہیں ہوتا۔ ”دوبار شب“ تو پتہ ہی حرف حرف پسند ہے۔ گو قرار تھوڑی سی ہے۔ حتیٰ کے مستقبل کا سوچ کر ہول ہی اٹھتے ہیں۔ جانے بلی صاحب اور نگید اس کے حق میں کیا فیصلہ کریں۔ ”ستارہ شام“ بھی ٹھیک سی جا رہا ہے۔ ابھی تک سارے کردار تعارفی مقام پر ہی ہیں۔ بس کچھ پیش رفت ہوئی ہے تو لہجہ کے دل پر اچانک ہونے والی واردات۔ مطلب قیضان کی طرف اس کا اچانک سائل ہونا۔ ورنہ تو ناول خاصا سا جا رہا ہے۔
فائدہ انگار کا کرمز والی۔ بھی کیا زبردست گمانی شہ

برہنہ ”بے ساختہ انداز“ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نہایت ٹھنڈے انداز میں پیش کرتے ہوئے۔ اس گمانی نے تو حرف آخر تک اپنے حرمیں بکڑے رکھا۔
سلطنتِ دل پڑھ کر بے جا طوالت کا احساس ہوا۔ وہی ازلی آنکھ پھولی اور آخر میں بیوہ۔ اور یہ وہی کارنامی ہو جاتا۔

افسانے البتہ سب کے سب بہت اچھے تھے۔ ”چچا ککی“ اور ”گالی چادر“ تو بہت سی خوب صورت تھے۔

ارے میں ایک ناول کا ذکر تو نہیں ہی گئی۔ ”کرناؤ“ میں نیلہ عزیز نے نہایت مثبت جائیداد بیک گراؤنڈ دکھایا۔ داؤد بخش کا کردار واقعی بہت اچھا تھا اور اس سے بھی اچھا سہارا بیگم کا۔

ج: بیاری یا سین اشعار کی پندیرگی کے لیے شکر ہے ”آپ کی گمانیاں ابھی پڑھی نہیں۔“ تھوڑا انتظار کر لیں۔ میں آپ کو فون کر کے بتا دوں گی۔

روینہ حنیف منٹو کا کثرتِ رحمت و ہمت شاہ ضلع قصور سے شریک محفل ہیں۔

نعل ناول بہت استراٹجک زبردست تھے کردار نیلہ عزیز نسیم ہیرے کے لوگ اچھے اور حیات نعل شلیاش۔
بانی دونوں ناول بھی اچھے بلکہ بہت اچھے تھے۔ رخسانہ صاحبہ زونہ کے ساتھ بہت اکرین ستارہ شام ”دوبار شب“ بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ عالیہ بی پلین خام اور معاذ کو زیادہ دکھایا کریں یہ۔ میرے پسندیدہ ترین کردار ہیں۔

افسانوں میں چپا کئی بازی لے گیا۔ آپ لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہے ہیں کہ ”عزیز و سید“ عمیرہ امیر وقت سراج کو لے آئیں اور یہ شعلہ فکس کر دیا جائے گی ہیں۔ تاریخ کے جھوکے میں محمد بن قاسم کی وفات کے بارے میں بتائیے۔ خوب صورت سببے میں خود کوئی سی تبدیلی لائیے۔

ج: روایت منورہ اور عائشہ امین ماہ کی غیر حاضری کے بعد اتنا مختصر جبرہ اچھا نہیں لگا۔ زینار کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ آپ مزید راکھنا ہوتی ہیں؟

خوب صورت سببے میں اس مرتبہ حاملہ خواتین کی غذائی ضروریات پر مضمون دے رہے ہیں۔ اس سلسلے کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی اور تجویز ہے۔

تاریخ کے جھوکوں میں محمد بن قاسم کے بارے میں سببے دے چکے ہیں۔ آپ کی فرمائش پر دوبارہ دیں گے۔

تھوڑا انتظار کریں۔

آئندہ تفصیلی نمبر کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

عظیم صدر دین رحمانی صفورہ آباد سے تشریف لائی ہیں۔

ٹائٹل کے بارے میں یہی کہیں گی کہ بس اچھا تھا زیادہ نہیں۔ کوئی دیکھ ہو۔ رخصانہ جی نے بہت اچھی کمائی لکھی۔ مجھے برا ملا آتا ہے روشن راستہ اور کالی چادر اور گرمیوں والی فائزہ کی اچھی کمائی تھی۔ دیوار شب اور ستارہ شام بھی اچھے طریقے سے بڑھ رہی ہیں۔ لمبا کا موسم سب کے لیے ایک نئی لہر اور خوشیوں کی خوشیاں لے کر آئے ورلڈ کپ تو پاکستان ہی جیتے گا (ان شاء اللہ)۔ پلیر شاہین رشید جس دنیا آپ کا انٹرویو کیا تو میں نے دو ٹوک لپڑھتے ہیں شعلہ کی ہر تحریر ہی ویل ڈن ہوتی ہے سلسلوں میں جیسے زیادہ شاعری اچھی لگتی ہے۔

شعلہ کی کتابوں کے اسکینجز اب اچھے نہیں ہوتے۔

ج: پیاری عظیم! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ اسکینجز والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ شائستہ مومن تو بہت محنت سے اسکیجنگ بناتی ہیں۔ چائیں آپ کو کیوں اچھے نہیں لگے۔

شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

کھلی! گو جز انوالہ سے تازہ جسم منحل اپنی ای میل کے ساتھ تشریف لائی ہیں۔

اس ماہ کا ٹائٹل زبردست تھا۔ سب سے پہلے نبیلہ عزیز جی! آپ تو ہم سے مبارک باد وصول کریں۔ کیونکہ مکمل نابل میں ”کردار“ سہرت ہلکے ڈپر ہٹ رہا۔ اس کے علاوہ مریم عزیز نے ”سلطنت دل“ بھی بہت اچھا لکھا۔ افسانوں میں راحت وفا کا ”کالی چادر“ بہت زبردست لگا۔ انہوں نے بہت شائستہ انداز میں ہمارے معاشرے کے ان لوگوں پر تنقید کی ہے۔ جو ہمیشہ دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ اگر وہ دوسروں کے سبائے اپنے گریبان میں جھانک میں تو انہیں شرمندگی نہ اٹھانے۔ مسلسل نابل میں ”ستارہ شام“ اچھا جا رہا ہے۔ ”گولی دیکھ ہو“ کی آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کا اختتام اچھا ہی ہو گا۔ آخر میں میرا پسندیدہ سلسلہ ”تاریخ کے جھوکے“ بیش کی طرح زبردست رہا۔ آئی! کیا میں اپنی لکھی ہوئی غزل یا نظم آپ کو بھیج سکتی ہوں؟ یا آپ صرف نامور شعراء کی کاوش ہی شائع کرتے ہیں اور کیا میں ای میل کر سکتی ہوں یا بہت کرنا ضروری ہے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کا نمبر مانے سے پہلے کیا ہوا لگا ہے؟

ج: پیاری تازہ شعلہ کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمارا نمبر مانے کے لیے گراہی کا نمبر 021 لکھیں۔ عظیم! آپ بذریعہ ڈاک بھیجیں۔ ای میل نہ کریں۔

شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سندھ تحسین عطاریہ نے چونکا عظیم! سے لکھا ہے۔

سودتی پر ماڈل کائنات بہت ہی ناکس لگ رہی تھی پیارے تمہا کی پیاری باتیں بڑھ کر خوف خدایہ اور ایمان باز ہو ا اس کے بعد دیوار شب، رحمانی جی اس کا اب اپنے بھی کر دیں اور پلیر معاذ اور جوا کو ملا دیجئے گا اور سالار کی شادی جیتی سے ہی ہو اور شائستہ بیگم کو پیسے والی ہی رہیں

”یہ تو شاکرہ بیگم کی کالی جتنی جا رہی ہیں۔“ ”ستارہ شام“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ نقیبہ ماما فیضان کی بیوی سن ہی بنے گی۔

سلطنت دل مریم عزیز ویل ڈن مجھے تو ڈوری لگا رہا کہ کہیں ملائیکہ اپنی خدیجی بیٹن سن چڑھ جائے مگر ایڈیٹر بہت اچھا ہوا ”مکرموں والی“ ٹھیک ہی تھا کردار میں داؤ بخش کا کردار واقعی بہت اچھا تھا روشن راستہ عجیب سا لگا بہت اچھا ہوا

تھا۔ افسانوں میں باب آف دی اسٹ کالی چادر تھا۔

ج: پیاری سندھ تحسین! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شائع نہ ہو سکا اور آپ کو اپنی گزشتہ کتب کا نشانہ نہ بنا پڑا۔

ایک بات کہیں اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس نہ کیا کریں ورنہ لوگ زیادہ لائق بنائیں گے اور خود آپ کی اپنی زندگی مشکل ہو جائے گی۔

شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

من اور کرانے ذریعہ اسٹیل خلیں سے لکھا ہے۔

ایک چھوٹے سے شہر سے ہمارا تعلق ہے۔ بطور پرائیویٹ ٹیچر علم کی روشنی چھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پیاری تمہا کی پیاری باتیں ”شاعری جگ بولتی ہے“ میرے ٹیوٹ سلسلے ہیں۔ سسٹے دار نابل میں دیوار شب بہت مزے کا جا رہا ہے۔ عالیہ بخاری برائے مہربانی اب تو جوا اور معاذ کو ملا دیں۔ ”ستارہ شام“ آئندہ مرضی کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کے علاوہ شعلہ کا سرویٹ بیش بہت ہی خوب صورت ہوتا ہے۔

ج: من اور کران اشعلہ کی محفل میں خوش آمدید اور دعا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کریں گی۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے ہر طرے سے ممنون ہیں۔

خوش رہیں اور اسی طرح علم کی روشنی سے اپنے شہر کے بانیوں کو منورہ کرتی رہیں۔

الہا ہود سے امیدوار و راجہ اپنی ای میل میں رقمطراز ہیں۔

بیش کی طرح اس بار بھی شعلہ ایک دن میں ختم کر لیا۔ فائزہ اختر کے ناول ”گرمیل والی“ کے پہلے دو حصے بڑھ کر دل بہت خراب ہو اور آخر کے صفحات بڑھ کر اور دل برا ہوا۔ نبیلہ عزیز کی اکثر کمائیاں ایک جہی ہوتی ہیں اور بہت

اچھی ہوتی ہیں۔ شکریہ نبیلہ جی! مریم عزیز کا ناول ”سلطنت دل“ کا اختتام حسب توقع ہوا۔ ”گولی دیکھ ہو“ میں زندگی کے بہتے دن شریں ہو گئے ہیں اور ایسا ہی ہو چاہیے تھا۔ سندھ عزیز آفریدی کا ناول بھی اچھا تھا۔ افسانوں میں عقیقہ محمد بیگ کا ”طالع“ بہترین تھا۔ حقیقت سے قریب بانی کے تمام ہی سلسلے اچھے تھے۔

ج: امینہ اور راجہ اشعلہ کی برسم میں خوش آمدید اور دعا ہے۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حفصہ ملک نے فیصل آباد سے لکھا ہے۔

دیر تک کچھ نظر نہیں آتا

خواب جب ٹوٹ کر بھڑکے

شعلہ میں اپنا خط دیکھا خواب ہے جو پری طرح ٹوٹا ہے۔ اتنی محبت ”من“ چاہت اور امید سے آپ کو خط لکھا تھا مجھے پکا یقین تھا خط شائع ہو گا تو خوشی خوشی سب کو دکھائیں گے اپنا خط نہ پا کر اس قدر مایوس ہوئی کہ شعلہ رکھ کر بچن میں چلی گئی۔

آپ نے کہا ہے دل والوں کی محفل سے یہاں محبت کا سکھ چٹا ہے (تو کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے شاعر حضرت بھی کیا خوب کہتے ہیں۔

کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہو تا تو اب یہ خواہش بھی انہوں ہی ہے شعلہ میں اپنے دونوں خط دیکھوں۔ اب اجازت چاہوں گی بڑی امید اور اس شعر کے ساتھ۔

بزار دل عیب سہی مجھ میں مگر ایک خون بھی ہے یارو جسے ہم دل سے چاہیں اسے چھوڑا نہیں کرتے

ج: پیاری حفصہ! یقین کریں آپ کو اپنا خط نہ پکارتا کہ

سانچہ ارتحال

ہماری نامور معتقدہ یمن رخ چودھری کے والد چودھری نصیر احمد طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں انتقال فرما گئے۔ (ان اللہ وانا علیہ وانا راجعون) مرحوم بہت نیکو و مہربان مرع انسان تھے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) قارئین سے دعا ہے مغفرت کی درخواست ہے۔

ہوا "اس سے زیادہ ہمیں آپ کا خط پڑھ کر دکھ ہوا ہے۔ ہماری بیماری ہی ہمیں کاٹھن ٹوٹا ہمیں اس کا بے حد انوس سے لیکن آپ کو کیسے یقین دلائیں "آپ کا خط لکھنا اس لیے شائع نہ ہو سکا۔

اس بار آپ نے تبصرہ نہیں کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

بنت عبدالرشید نے فیصل آباد سے لکھا ہے۔

مجھے تقریباً 12 برس ہو گئے ہیں اور میرے افسانے ناول نظمیں غزلیں لکھتے ہوئے۔ وہ چڑچڑاہٹ اشاعت سے یا نہیں یہ بعد کا مرحلہ ہے۔ ہر حال میں اپنے اس اور میرے

پن کے ساتھ سمجھو کر چکی ہوں کہ اچھا اور مکمل لکھنا واقعی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن نگار کی رات ایک مکمل ناول میرے ذہن میں آیا۔ جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ اسی بے قراری میں ساری رات گزار گئی تھیں

کے وقت میں اسی بے قراری سے نجات مانگ رہی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی اور مجھے خواب میں کہا گیا کہ امت

الصور اور جلاویز چوری سے رابطہ کرو۔ آپ میری اس سلسلے میں کیا رو کر سکتی ہیں میں کچھ نہیں جانتی۔ جانتی ہوں

تو بس اتنا میرے اندر لفظوں کا آتش فشاں مل رہا ہے۔

ج: بنت عبدالرشید اور قارئین جو لکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے ان کی صلاحیتوں کو

تھکانے اور سنوارنے میں بہترین کردار ادا کیا ہے۔ اگر آپ کوئی تحریر مکمل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں

بجوا دیں ہم آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں گے۔

سویدہ حشر نے گزشتہ شمارہ نمبر سے یہ ای میل ہمیں بھیجی ہے "لکھتی ہیں۔

ناپسند بے تحاشی تھا۔ ناپسند گمراہ کے صرف لپٹن ہی پسند آئے۔ جدوجہد بہت زیادہ تھی۔ انٹرویوز اور

سب سے پہلے اچھے تھے۔ "ستارہ شام" آف ریاض کا بہت زیادہ جادو ہے۔ اس بار شہید کا ذکر بہت کم تھا۔

اس کے بارے میں زیادہ لکھا کریں۔ فائزہ افتخار کا "کرموں والی" بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ ماں جو ہر حال میں اپنے

بچے کا بھرم رکھتی ہے اور اپنے نام کی ادب بھی۔ ویل ڈن فائزہ کی

ج: امیداً آپ 32735021 ریفون کر کے لکھوں کے بارے میں پتا کر سکتی ہیں لکھوں کی ہم نئی سٹ بھی شائع

کر رہے ہیں۔ سیم آف کا ٹائٹل ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا انشاء اللہ جلد شائع ہوگا۔

سیدہ فائزہ شاکر نے بھولال سے لکھا ہے۔

معلوم سی ملاں جس کی دائیں آنکھ نم تھی بہت اچھا

میرے ہاتھوں "میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں کہ میں نے اسم محمد کو لکھا بہت اور چھاپا بہت

ج: سویدہ حشر اب ہم یہ نعت شعاع میں شائع کر چکے ہیں۔ سلیم کوثر نے لکھی ہے۔ آپ کی فرمائش پر دوبارہ

شائع کر دیں گے۔

فائزہ افتخار کی تحریر کا مقصد ماں کی عظمت نہیں "انسان کی فطرت کا ایک سادہ سادہ کرنا تھا کہ اس کی دین داری اور

انسانی ہمدردی اللہ کی رضا کے لیے نہیں اپنے دنیاوی مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔

آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا "اچھا۔" مصنفین کے آپ کا تبصرہ ان طور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

امیداً خوشبو سے لکھتی ہیں۔

مجھے میری یہ افش سے بھی پہلے کے ڈائجسٹ پڑھنے کا پراشوق ہے جو کہ مجھے پتا ہے پورا نہیں ہو سکا لیکن سلسلے

وار ناول جو کہ کتابی شکل میں آچکے ہیں وہ تو بڑھ سکتی ہوں اور بڑھ بھی رہی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں

کہ کون سے ناول ہیں جو کتابی شکل میں آچکے ہیں۔ پلیز نئی سٹ دیں ناولوں کی تاک میں اپنا شوق پورا کر

سکوں۔

گلی۔ سارے فیملی کی بیماریاں ہیں بے حد اچھی لکھیں خاص طور پر نسل رسول کی نثر ان۔ کاش ہم وہ صحیح سے اپنا سکیں

۔ صرف لغاری کا انٹرویو اچھا لگا۔ اس ماہ "خط آپ کے" بے حد پسند آیا ہر قاری ان کا انداز بڑھ منفردی تھا۔ یہ میرا

فیورٹ حصہ ہے۔ "باتوں سے خوشبو آئے" میں اقوال علی نے سارے رسالے کو "مکمل کر دیا۔" بشری ہاجو نے بھی عمدہ

انتخاب بھیجا۔ آج کے جموں کے سے جھانکنے مناظر بہت ہی خوب صورت لگے۔

افسانوں میں ام ثناء کا افسانہ پڑھتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کی یاد آئی۔ جبکہ علان بھی بہت اچھا لگا۔

فائزہ افتخار بہت ہی کرموں والی ہیں جن کی تحریر پڑھتے ہوئے انسان مسلسل مسکراتی رہتا ہے اس بڑے عورت

کو کرموں والی بننے میں سب سے بڑی رولٹ اس کی اولاد ہی نقلی۔ نیلہ عزیز کا "کردار" اچھا تھا۔ دماغی سا اثر

چھوڑ گئی یہ تحریر۔ بات یہ کہ تمام سلسلے ہی عمدہ ہیں۔ میں نے کئی بار آپ سے فرمائش کی ہے "وائٹنگ عامر لیاقت حسین سے انٹرویو لیں۔

ج: پناہ فائزہ افتخار کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار

کریں دیں گی۔

بیمیراحیات نے ریٹالہ خورو سے لکھا ہے۔

نیلہ عزیز کے مکمل ناول نے تو دل بیت لیا۔ نیلہ عزیز نے ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ دیوار شب

اچھا جا رہا ہے مگر ست روئی کا شکار ہے۔ رخسانہ نگار کی کا ٹائٹل زیادہ بہتر ہے مگر وہ ناول کی یوں اچھا تک شادی؟

کافی تیزی سے کمالی کو سینا ہے انمول نے۔ سلطنت دل کا انتقام بھی زیادہ بہتر تھا۔

فائزہ افتخار کی تو ہمیشہ سے ہی ہماری پسندیدہ رائٹر تھیں۔ "کرموں والی" ایک یادگار تحریر ہے۔ افسانے

سب اچھے تھے مگر ام ثناء کا "چپا کلی" بہت پسند آیا۔ ستارہ شام بہت اچھا جا رہا ہے۔ ناول اور جلال الدین کی ملاقات دلچسپ تھی۔ مستقل سلسلے تو شعاع کی ذہنت ہیں۔ "فرحت اشتیاق" جی کا کلم کیل خاموش ہے۔ ان کی ہی بہت محسوس ہو رہی ہے۔

فرحت اشتیاق۔ ایک کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس کی مصروفیات کی بنا پر لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ انمول نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد آپ کے لیے

ناول لکھیں گی۔ فائزہ افتخار اور نیلہ عزیز تک آپ کی تعریف ان طور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

یا سمین کنول نے پورے سے لکھا ہے۔

افسانوں میں کالی چادر اور مکمل ناول میں کرموں والی زیادہ متاثر کن تحریریں رہیں۔ ٹائٹل پسند آیا۔ باتیں

مشغل سلسلے اور سلسلے دار تحریریں تو ہوتی ہی اچھی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا ہے۔

ج: یا سمین افغانی عرصہ بعد آپ نے لکھا بہت خوشی ہوئی یہ صحیح ہے کہ ہمیں بہت سی قدر عین خط لکھتی ہیں اور وہ

واقعی ہماری قارئین بہت ذہین اور باوقار بھی ہیں لیکن پھر بھی ہمیں آپ کی ہی محسوس ہوئی "آئندہ اتنا طویل وقت نہ

دیتے گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسز سعیدہ ہارون گراچی سے اپنی ای میل کے ساتھ ہماری بزم شریک ہیں۔

فریدی کا شعاع ملا۔ ناپسند و کچھ کر ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔ سب سے پہلے "کالی دیکھ" ہو "کی بات

کرموں کی زندگی وکیل اور سعیدہ تھیں کی اسی چھوٹی سی قسط میں شادی ہو گئی اور زندگی کے ساتھ جو واہوہ کرے۔ وہ

اس سے بھی زیادہ کی منتظر تھی۔ "دیوار شب" کی کمالی بھی ایک جگہ رکھ دی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز عالیہ کی

رفکار پڑھائیں۔ "سلطنت دل" مریم عزیز کی اچھی کوشش تھی۔ لیکن اس میں بھی بہتری کی گنجائش تھی۔

نیلہ عزیز کے "کردار" کو اگر اس شمارے کی جان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اتنا اچھا ناول لکھنے۔ ان کو بہت بہت

مبارک باد۔ "کالی چادر" راحت وفاق کے افسانے کا موضوع اگرچہ نیا نہیں تھا لیکن ہر دور کے لیے سچی آواز ضرور ہے۔ فائزہ افتخار کے ناول "کرموں والی" کی کمالی بھی بہترین تھی۔ فائزہ نے بہت خوب صورتی سے لکھا۔

ج: سعیدہ لیاؤ آوری کا شکریہ۔ توئیو کے ساتھ بتاتے ہوئے اس سے زیادہ کیا رہا ہو سکا تھا۔ ہمارے خیال سے تو اسے زیادہ ہی سزا مل گئی ہے۔ کیونکہ قصور صرف اس کا

ہی نہیں بلکہ اچھی تھا۔ جلد بازی اور بے سوچے سمجھے

فصلے کرنا اس کی عادت تھی۔ پہلے اس نے شادی کا فیصلہ کر کے ماں اور بہن کا دل دکھایا۔ ان کو شرمندہ کیا۔ اور پھر ثانیہ کے لیے فیصلہ کرنے میں بھی ایک دل کی دیر نہ کی۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکر یہ۔ متعلقہ مستفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

آمنہ اور اجالا نے دھڑکی سے شرکت کی ہے۔

آمنہ بارے میں اور ہم پھولوں، خوشبوؤں اور رنگوں کے دوانے لوگ بہت ہی خوش ہیں۔ اس بارے میں بھی اس لیے سوا تھی کہ مریم عزیز کے ناول کا وہ سراحدہ پڑھا تھا۔ ٹائٹل پر یہ ایمان مند ہی ماری ہوئی تھی۔ پیاری سی مکان سجائے بہت اچھی لگی اور پھر خوں ہی فائزہ انھارہی کے نام پر نگاہ دینی تو دل کا رن کا رن ہو گیا۔ ماری پھولوں بس فائزہ جی کے بارے میں ایک بات ہمیشہ کہتی ہے کہ "فائزہ انھارہ نام ہے اعتماد کا" مگر اس بار ہمیں ان کی تحریر افسردہ کر گئی۔

مریم عزیز کا مکمل ناول "سلطنت دل" شائد در رہا۔

ایرا تیر کئی ڈیفنٹ سویر ہیرو ثابت ہوا۔ آزاد فضاؤں کا باسی ہو کر بھی اس کا مشرقی روایات و افتادہ کا ایک پاس رکھنا اچھا لگا۔ نبیلہ عزیز نے کمال کر دیا دوا بخش جیسا کہ ادب خلق کر کے

اس بار سجدہ عزیز جی سب پر سبت لے گئیں ان کی تحریر قادی کو کسی آکٹوپس کی طرح اپنے سحر میں جکڑ گئی ہے۔

ان کا طرز تحریر اور انداز سب سے جداگانہ ہے۔ "محبت روشن راست" کمال کا لکھا حدیثی نے۔

"دیار شب" کی قسط اس بار بہت مختصر سی تھی۔ عالیہ آبی پلیز تھوڑی تیزی مانیں پورا مینہ انتظار کرنے کے بعد بھی چند صفحات ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ پلیز معاذ کو جو اسے ملانے کا اور ہمیں لگتا ہے کہ ختام پوسٹ کمال کا بیٹا ہے اور پلیز سارا اور اپنی کو جد امت جیسے گا۔

عقبہ بیگ نے اس بار بھی اہل جواب لکھا۔

اس قلم نامہ بھی اچھی جگہ پر فیکٹ رہیں ان کا افسانہ اچھا لگا۔ کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پائی۔ امجد اسلام امجد کی نظم بہت پسند آئی۔

راج، آمنہ اور اجالا! قدرت تو ہم پر بہت مہربان ہے۔ مخوفیو رنگ موسم بچوں پھل گئیں ہمارے لوگوں کی زندگیوں میں خزاں کا ہی ڈیرا ہے۔ وہ موسم تو بدلے ہی نہیں پاتا۔ صرف تین دن میں شہر کراچی میں 70 افراد کا خون رزق خاک ہوا۔ اور ہمیں قاتلوں کا کوئی پتا نشان نہیں ہے۔ شاید ایسے ہی قاتلوں کے لیے کہا گیا ہے کہ تم قتل کرو ہو کہ کراہت کرو ہو۔

میمونہ خورشید اور راحت جیوں کی تحریریں آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

ان شاء اللہ! فرحت اشتیاقی، در شمن اور حنیلہ ریاض بھی لکھ رہی ہیں۔ دعا کریں جلد مکمل کر سکیں۔

حوالی لکھا سے شمر گل نے لکھا ہے۔

شعلہ تو واقعی شعلہ ہے ہر لحاظ سے رفیکٹ آبی اگر ہم 15 تاریخ کے بعد خط و غیرہ بھیجیں تو کیا آپ شائع کریں گے۔ آبی ناول کو کافی صفحات پڑھنے کے گاہک تو کیا چھوٹا چھوٹا کر کے لکھتا ہو گا اور قاریوں کے ناول کس طرح سمجھیں۔

ج ج ج شمر گل آپ کو بخش کریں کہ خط ہمیں 17/18 تک موصول ہو جائے۔ اس کے بعد آنے والے خطوط ہم پڑھتے ضرور ہیں لیکن انہیں شامل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ناول کے صفحات زیادہ ہو جائیں تو کوئی حصہ نہیں۔ آپ تمام صفحات کو ایک لفافے میں ڈال کر دوں گے ذیل ایڈریس لکھیں۔

شعلہ 137 روڈ بازار کراچی۔
بذریعہ آر جیٹ میل سوس بھجوا دیں۔

عاشی رضیہ جمیل فیصل آباد سے شرکت کی ہے۔ کلمتی ہیں۔

نبیلہ عزیز کی کہانیاں پڑھتے ہوئے انسان دنیا کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سلطنت دل بھی بہت اچھا تھا۔ اس ناول کو پڑھ کر بھی بہت اچھا لگا۔ رخسانہ انار کا ناول بھی اچھا تھا اور پلیز رخسانہ جی ثانیہ کو یہاں سے جد امت کرنا پلیز۔

اور آبی پلیز ساہو مدھی FM103 کے RJ کا تعارف مکمل شامل کریں پلیز مکمل تعارف فیملی کے ساتھ پلیز۔

راج، پیادی عاشی اشعلہ کی برس میں خوش آمدید۔ خوش ہو جائیں رخسانہ انار نے آپ کی فہمائش پوری کر دی ہے۔ نبیلہ عزیز اور مریم عزیز تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ انھوں نے فہمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

شیوا و قاص کو جرنلہ سے تشریف لائی ہیں۔

اس بارے میں باریج کے شعلہ نے مجھے ایک دفعہ پھر خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔

نبیلہ عزیز کے ناول "نکو دار" نے حیران کر دیا کہ کوئی اداویں کا ناول کیا بھی ہو سکتا ہے۔ سٹے وار طوڑ قیوں ہی اچھے جا رہے ہیں اور کوئی پیپک ہو میں ذیہرا کو اس کے گناہ کی سزا ہی ملتی لیکن پلیز رخسانہ جی ثانیہ کو یہاں سے ضرور ملواؤ۔

راج، پیادی شیدا! آپ نے اپنی مصوفیات میں سے وقت نکال کر خط لکھا بہت شکر یہ متعلقہ مستفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

فوزیہ صادق نے کہو وال سے لکھا ہے۔

شعلہ کا پتہ مکمل اچھا تھا ایک نظر جائزے کے بعد سب سے پہلے "کوئی ایک" ہو "پڑھا" عالیہ بخاری "دیار شب" پلیز اب اس کو جلد مکمل کریں اور پلیز معاذ کو جو اس کے ساتھ کچھ برامت کیجئے گا۔ جو اس نے بہت قریبی دی ہے ان کی محبت کے لیے۔ آمنہ ریاض "ستارہ شام" بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن جنت کے باپ کی اس سے حد سے زیادہ دانستگی اچھی نہیں لگی۔

اس بار تین مکمل ناول دیکھ کر اچھا لگا۔ سب نے اچھا لکھا فائزہ انھارہ نے کراچی "کرموں والی" کو کس بات کی اتنی اچھی نہیں لگی۔

یاتی نائل بھی بہت اچھے تھے خاص طور پر مریم عزیز کا "سلطنت دل" بہت اچھا لگا۔ افسانوں میں "کالی جاود" راحت و قیادی لے گئیں۔ "پچا پکلی" کور "علاج" بھی اچھے تھے۔

سوس "کوئی جیتے گا" مزہ کر بہت مزہ آیا۔ مختلف لوگوں کی رائے سننے کو ملی۔ لیکن اپنے لکھاڑیوں پر اتنی تنقید اچھی نہیں لگی۔
راج، فوزیہ اطول غیر حاضری کے بعد شعلہ کی محفل میں آمد کا شکریہ۔ متعلقہ مستفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

موش آصف اسلام آباد سے تشریف لائی ہیں۔

آٹھ ماہ بعد دوبارہ حاضری دی ہوں۔ وجہ وہ چھوٹے اور شرارتی بچے کب دن چڑھا اور ڈھل بھی گیا پتہ ہی نہیں چتا لیکن دن رات کی اس آنکھ بچوں میں شعلہ اور خواہش سے تعلق قائم رہا۔
اس بار کی زبردست تحریر کرموں والی جی سلطنت دل بھی پسند آئی۔

دیار شب بہت عرصے سے ست روی کا شکار ہے۔ تین یا چار اقساط کے بعد کوئی چھوٹی سی تبدیلی آتی ہے یا کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ستارہ شام اچھی مکمل کر سامنے نہیں آیا۔ چچا کی بہت زبردست افسانہ تھا "فریاد" ایک سال پہلے میں نے شمر جی کا انتخاب بھی کیا لیکن شاید آپ کو پسند نہیں آیا۔

راج، پیادی موش! آپ نے گھر اور بچوں کی مصوفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا بہت شکر یہ۔ متعلقہ مستفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔



مردوق کی شخصیت
ماڈل _____
تعلقات _____
میرنا _____
اورینٹ یکنٹائی کراچی

پسندیدہ ناوی: دوست اور اداہ خواہش! عجیب کے تحت شائع ہونے والے رجوں بزمہ شعلہ اور بہتہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و انشائیہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے ان کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ذریعے سے ڈاؤن لوڈ یا کاپی یا نقل یا سلف یا رشتہ کے کسی طرح کے استعمال سے پہلے جرح سے تحریر کی اجازت نہ ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر افراد کا نقل یا جلدی یا کاپی کرنا ہے۔

کمانیوں میں بہت سے کردار غیر معمولی دلچسپ اور پہلو دار ہوتے ہیں۔ یہ کردار سوج کے کئی دروازے کھاتے ہیں۔ پچھلے قارئین اخبار کاٹال، مکرموں والی، شائع ہوا تھا۔ اس ناول کا مرکزی کردار مکرموں والی، ایسا ہی کردار ہے۔ اس کردار پر بہن آمنہ زہین سے بہت دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ ہم یہ خط شائع کر رہے ہیں۔ ہماری دیگر قارئین بھی کسی کردار پر لکھنا چاہیں تو لکھ سکتی ہیں۔

مجھے ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔ حالانکہ میں اقبال نہیں ہوں!

پچھلے دنوں گینز ورلڈ بک میں پاکستانی ریکارڈ یافتہ نام دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تو مجھے پھر سے اس خیال نے گھیر لیا۔ کہ مجھے ہمارا دیر ہو جاتی ہے! اس میں ایک صاحب تھے جنہوں نے خط لکھ لکھ لکھ کر اپنا نام اس کتاب میں شامل کروا لیا تھا۔ وہ صاحب روزانہ کی غیلا بول پر ایڈیٹر کو خط لکھا کرتے تھے۔ میں نے سوچا۔ اب اگر میں شروع کروں۔ تو مجھے دیر ہو چکی ہے! مجھ سے یہ ریکارڈ نہیں ٹوٹے گا۔ خط لکھنے کا مرض مجھے بھی ہے۔ مگر افسوس! پوسٹ کرنے کا نہیں ہے!

وگرنہ جماعت ششم کو فراموش ہوئے کئی سال گزر گئے (کئی۔ کارہ بڑا دیر ہے) میں تب سے وقت کے وزیر اعلیٰ، وزیر داخلہ، وزیر اطلاعات کو مختلف مسائل پر اپنی رائے سے آگاہ کرنے کی عادت میں مبتلا ہوں۔ آج بھی وزیر کی فوج ظفر مومج سے تو اب شناسائی ممکن نہیں۔ اب صحافیوں سے دل کے پیچھو لے پھوٹتی ہوں۔ جاوید چوہدری، حسن شاد، عباس اطہر، ان سب کو خط لکھ لکھ لکھتی ہوں۔ اور لکھ کر ڈاک کی گھنٹی میں سکون سے رکھ دیتی ہوں۔ نکالے پڑھے اور؟

اس سکون کے پیچھے چھپی سستی کو پاکستانی Being a کے گھاتے میں ڈال دینا آپ کو کیا لگے گا؟ بے عمل، بے اعتمادی، کیا فرق پڑے گا؟ صرف میری بات صرف میری ذات سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ وہ فارمولا ہے جو ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر ابھر کر سامنے آنے کی خواہش سے بھی بے زار کر چلا

ہے! آخری!

اس دفعہ کا شعاع پڑھا۔ حسب معمول رائے محفوظ تو ہو ہی جاتی ہے۔ مگر اس دفعہ اپنا ریکارڈ تو توڑ دینے کا خیال خوش کن تھا۔ کہ کمانی پڑھ کر تبصرہ بھیجے کے خیال کو ایک سال تک اٹکا دیا۔ اور پھر بعد از وقت خیال کر کے۔ کچھ نئے ارادوں کے بیان پابند لیے۔ (میرا حکومت سے کوئی رشتہ وابستہ نہیں۔ ان کا ہمارے ساتھ نہیں۔ تو ہمارا ان کے ساتھ کیوں؟)

جی۔ ریکارڈ قائم کرنا آسان ہے کہ توڑنا؟ جنہوں نے کچھ نہ کرنا ہوا۔ ان کے لیے سب کچھ آسان ہے جی۔ مشکل تو تب پڑتی ہے جب کچھ کرنا پڑے۔

میں نے ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا۔ ایک ہی کمانی پڑھی۔ اتفاق سے رات کے وقت کی مکمل خاموشی اور یکسوئی نے یکجا ہو کر کمانی کے لطف کو دوپلا کر دیا۔

کمانی ختم کرتے ہی میرے ذہن میں تبصرہ کھانا کھٹ چل نکلا۔ جس کو میں اپنی خوشی کی خاطر بھی بھیجنے کی سعی کروں گی۔ اور اس لیے بھی کہ اس کمانی پر مختلف آراء کی صورت میں جو اختلاف سامنے آئے، احتمال ہے اس کی پیش بندی کے طور پر بھی!

وہی آرا۔ جس کے جواب میں آپ کو مختصری وضاحت دینی پڑتی ہے۔ کہ ہمیں "پیاری قیلاں" آپ کو سمجھنے میں مشکل لگا۔ ورنہ بات تو یہ تھی۔ یا یہ کہ ہم اس قدر خیال رکھیں گے۔ یا پھر لکھاری نے وہی لکھا جو وہ لکھنا چاہتا تھا۔ آپ پلیز گھبراہٹ مت! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بات کو اسی طرح

سلیکھادوں گی۔ جس طرح ابھاری ہوں۔ آج کل کے انکوڑی طرح میں کروں گی۔ جو اس ترتیب کو اٹکا کر دیتے ہیں!

میں نے غیر سنجیدگی سے کمانی پڑھنا شروع کی تھی۔ مگر پڑھتے پڑھتے میری سنجیدگی بحال ہو چکی تھی۔ چھوٹی سی کمانی سمجھ کر شروع کی۔ اچھی خاصی نکل آئی۔ اور کمانی تبصرہ طلب بھی! اب آپ تصور میں لی وی والے دھواں دھار بھرے لے آئیں۔ جہاں پانی کے گلاس۔ اور ناز و نال کی ترسیل کے لیے چائے کے کپ بھی دھڑے رہتے ہیں۔ مگر جی ہاں۔ تبصرہ چائے کے کپ کے بغیر ہی مل رہا ہے! لی وی دیکھ کر تو لگتا ہے۔ کہ جو یہ کرتے ہیں۔ اس کے بغیر جینا محال ہے! جی! مگر ایسی بھی کوئی بات نہیں

کمانی کا سفر کمانی کے انجام میں ہے! اور یہی اس کمانی کی خوب صورتی ہے۔ پچھلی پچھلی پچھلیوں سے گزرتی ہوئی۔ کمانی نے ایک دم قاری کی انگلی چھوڑ دی۔ اور قاری کی حیرت کو سوال اور جواب کے لیے آزاد کر دیا!

جو میرا کٹہر نظر ہے۔ میں اس کو بیان کرنا چاہتی ہوں۔ قطع نظر اس کے کہ میرے ذہن میں وہ کتنے بھی موجود ہے۔ جس کو اٹھا کر کچھ لوگ اختلاف بھی ضرور کریں گے! مجھ سے نہیں جی۔ کمانی کار سے سوال یہ اٹھا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کمرموں والی لی لی لی کی دعا کر کے انہی سخت شائع کیوں ہوئی؟ کیا وہ مولیٰ دعا نہیں کرتا تھا؟ یا سودائی کی دعا اثر نہیں رکھتی؟ یا سودائی کو کھانا کھانا۔ بے کار کا کام ثابت ہوا؟ نہیں!

کمانی کا مرکزی کردار کمرموں والی ہے۔ اور اس کا یہ انجام اس کے تکبر کے ہاتھوں ہوا۔ جو اس نے ہمیشہ اپنی ذات سے منسوب کیا۔ خود داری کے پردے میں اپنی انا اور بھرم کی پیدائش کی۔ اور حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے حقیقت کو ٹھکست

دینے کی کوشش کرتی رہی! اس نے ہمدردی سے نظرت کیوں کی؟ اس لیے کہ وہ اس سے اپنی ذات کو کم تر ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ برتر ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اور برتری کیا ہے؟ برتر ہونے کی خواہش ہی تکبر ہے! اور تکبر کا انجام؟ کئی جو کمرموں والی کا ہوا!

انتہا پسندی کا آج کل بڑا چرچا ہے۔ جس کا مئی چاہے۔ اسے دوسرے کے گھے کا ہار بنا کر اس کا جلوس نکال دے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ہر وہ وقت جو توازن نہ رکھ سکے۔ چاہے بدلتا پسند ہو یا قدامت پرست۔ انتہا پسند ہی ہوتا ہے۔ نظریاتی میدان ہوا عملی۔ اعلیٰ طبقات کا طرز زندگی ہو۔ یا درمیانی درجے کا طرز فکر۔ توازن ہر جگہ توازن ہی رکھے گا۔ اور انتہا پسندی ہر جگہ انتہا پسندی!

ناک پر کھنی نہ بیٹھنے دینے والا کمرموں والی کا رویہ میانہ روی کی حدود سے نکل کر انتہا پسندی پر مبنی مٹی تھا۔ ہمدردی خود داری اور برداشت کا بھی ایک مناسب معیار اور پیمانہ ہے۔ اپنی خود داری کو دھم دینا، وقت دوسروں کے لئے لینے وقت۔ انسان اپنے انجام سے بے خبر۔ اور شاید بے پروا بھی ہو جاتا ہے! اسی دفعے کو اگر ہم مشاہدے کا دوسرا لگا کر دیکھنا چاہیں۔ تو شاید زندگی بھر ہم اپنے تئیں اچھا کرتے اور اچھے کا انتظار کرتے رہ جاتے ہیں۔ مگر اچھا ہے کیونکہ وہ چیز جس سے ہم آگاہ ہوتا نہیں چاہتے۔ وہ ہماری اپنی ذات ہوتی ہے۔ اس کو ان پروں کے بغیر دیکھنا۔ جو ہم نے اس پر ڈال رکھے ہوتے ہیں۔ کلنی مشکل کام ہے!

یوں ہی تو ہم لوگ اعتراف کرنے میں صدیاں نہیں لگا دیتے۔ اسی لیے لگاتے ہیں کہ ہم اپنا مسلمان نہیں کرنا چاہتے!

انجام سے کوئی خوش ہوا تھا۔ انجام انجام ہی ہوتا ہے۔ اور ہم رنجیدہ ہوں یا ہمدرد۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ اپنے لیے کوئی نکتہ تلاش کریں۔ جو ہمیں اپنی ذات سے ملا سکے!



گلوکار ہارڈن

”کیسے ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”آپ کا ایک گانا ہے ”وفا تو ہے واہی واہی“ سننا سنا ہے۔“

”جی ہاں کل سیٹ زندگی گزار رہی ہے۔“

”کب سے گانا گارہے ہیں اور آپ کافی عرصہ ملک سے باہر بھی رہے۔ اردو گانے اور بولنے میں مشکل تو ہوتی ہوگی؟“

”میوزک کا مجھے انتہائی بچپن سے ہی شوق تھا اور جب میں تقریباً چودہ پندرہ سال کا ہوا تو گانے کی بورڈ کرنا تھا۔ اور گانا بھی تھا اور ہاں یہ درست ہے کہ میں کافی عرصہ ملک سے باہر رہا اور میں نے امریکہ سے فاس میں بی بی اے کیا ہے۔ جہاں تک اردو بولنے کی بات ہے تو مجھے اردو بولنے میں پہلے تو بہت مشکل ہوتی تھی جب میں اس فیلڈ میں آیا تھا لیکن پھر میں نے باقاعدہ اردو سیکھی۔ اردو نہ آنے کی ایک وجہ یہ تھی تھی کہ میری والدہ کا تعلق انگلینڈ سے ہے تو پھر کھر میں انگریزی ہی بولی جاتی تھی پھر پھر اردو کیسے آتی۔“

”شہر تیلے میں کتنا وقت لگا تھا؟“

”کافی وقت لگا۔ کیونکہ جس زمانے میں ہم آئے

”پہلی مشکل ”کوئی پریشانی؟“

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جب میں سوچ لیتا ہوں کہ یہ کام کرتا ہے تو میں پھر کرتا ہوں۔“

”کہاں کہاں لکھا؟ کیا کیا کرتے تھے ہیں۔ پلیز مختصر بتادیں۔“

”بی بی۔“

”جس وقت ہوا وہاں میں نے عام میگزین نیوز لائن، روزنامہ ایکسپریس، ایکسپریس ٹریبون، انڈیا ٹوڈے، لاس اینجلس ٹائمز، نیوارک ٹائمز کے لیے رپورٹنگ بھی کی اور کالم نگاری کی۔“

”اور کن کن اداروں کے لیے بہت کام کیا؟“

”آج چینل کے لیے۔۔۔ ایگزیکٹو ڈائریکٹر نیوز اینڈ کرٹ انفورمیشن این این میں بطور پروڈیوسر کام کیا۔ اے آر وائی پر بھی کام کیا۔ بی بی سی وی ورلڈ نیوز لانچ کرنے والی ٹیم کا سربراہ رہا اور ڈائریکٹر نیوز اینڈ کرٹ انفورمیشن وی رہا۔ پھر بی بی سی وی کے اور دیگر غیر ملکی چینل کے لیے بھی کام کیا۔“

”اور پھر وہی تو میں دیتے رہے ہیں آپ؟“

”وہی تو میری زندگی ہے۔ اور بے چاروں ان میں قائد اعظم یونیورسٹی، نیشنل ڈیفنس کالج، انفورمیشن سوسائٹیز، ایکسپریس، نیوز وار کالج، فارن سروسز ٹریننگ اکیڈمی وغیرہ وغیرہ۔“

”اور یہ بتائیں اس فیلڈ میں باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ آئے؟“

”نہیں پلاننگ کے ساتھ نہیں آیا۔ قدرت مواقع فراہم کرتی رہی اور میں آگے اور آگے بڑھتا رہا۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے فراہم کیے گئے مواقعوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور بہت محنت کی جس کا صلہ ملا۔“

”اپنی زندگی سے خوش ہیں اور چھٹی کاؤن کیسے گزارتے ہیں؟“

”اللہ تعالیٰ اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں اور چھٹی کاؤن اپنی فیملی کے ساتھ گزارتا ہوں اور کچھ مجھے بتاتا ہے۔“

”سوری سوری۔ بہت شکریہ آپ جابائے۔“

دستک دستک

شاہین رشید



طلعت حسین، اینکو + صحافی + کالم نگار

ٹاک شو کے اینکو خواہ وہ خاتون ہوں یا حضرات اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ سیاست دانوں کو کٹرے میں لا کر ان سے سچا اگلا نا ان ہی کا کام ہے۔ تمام اینکو ز بہت مصروف رہتے ہیں ان سے ٹائم لے کر انکو بول کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مشکل طلعت حسین صاحب سے وقت لینا تھا۔ باقاعدہ انٹرویو کے لیے تو ٹائم نہیں ملا لیکن ہر کل میں ایک دو باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ سو آپ کی نذر ہے۔

”جی طلعت حسین صاحب! کیسے ہیں آپ؟ آج کل آپ کو ڈان نیوز میں دیکھ رہے ہیں؟“

”جی اللہ اللہ ٹھیک ہوں۔ جی۔ اب میں ڈان میں ہوتا ہوں۔“

”غزہ کے مقام پر جب آپ گئے تو جو آپ کے ساتھ وہاں گزری وہ تو آپ بہتر جانتے ہیں۔ لیکن یہاں

بھی لوگ آپ کے لیے سٹ پریشان ہوئے۔“

”جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم یہ جو گزری وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ چاروں طرف گولیاں برس رہی ہیں اور ہم بھی مارگٹ میں ہیں تو لوگ ایک دم پریشان ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ پریشانی کی بات تھی۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں محفوظ رکھا اور ہم صحیح سلامت پاکستان واپس آ گئے۔“

”لوگوں کی محبت کا اندازہ ہوا ہو گا؟“

”بالکل ہوا یہ لوگوں کی محبت اور دھوکوں کا بھی تو نتیجہ ہے کہ آج ہم آپ سب کے درمیان ہیں اور کالم کر رہے ہیں۔“

”موت کے قریب سے دیکھ کر ڈر لگا؟ چاہے وہ غزہ ہو یا پاکستان میں 12 مئی ہو؟“

”نہیں۔ اللہ نے بہت بہادر بنایا ہے اور جو مشن لے کر میں گیا تھا اگر اس میں میری جان بھی چلی جاتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ اپنے ملک کے لیے تو میں کچھ بھی کرنے سے نہیں ڈرتا۔ 12 مئی کو بھی تو جان بھیسلی پر رکھ کر کالم کیا تھا ہم نے۔“

”کہا جاتا ہے کہ آپ حادثاتی طور پر اینکو بنے جبکہ آپ ایک انگریزی اخبار سے منسلک تھے؟“

”ہاں! اس اتفاق یہ ہوا کہ جب ہمارے دوست جو کہ بی بی سی پر پروڈیوسر تھے اور انہیں ایک کرٹ انفورمیشن کا پروگرام کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے مجھے کہا اس وقت میرا ایسا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن میں پروگرام کرنے پر تیار ہو گیا اور کر لیا۔“



”جیسے دونوں سیریز میں کروا ایک جیسے نہیں ہیں کیا؟“
 ”ایک جیسے نہیں تھوڑا بہت فرق تو ہوتا ہی ہے اور جیسی اسٹوری ہوتی ہے ویسے ہی کروا بھی ہوتے ہیں اور پھر والدین کے کروا رنگ بھلا ایسے ہی ہوتے ہیں“

”آپ نے تو جوانی میں بڑھاپے کا دل کیا تھا اس وقت کو یاد کرتے ہیں؟“
 ”کیوں نہیں۔ ہرگز وہاں وقت انسان کو یاد آتا ہے۔ میرا وہ کروا تو اس وقت کے سب ہی لوگوں کو یاد ہے اور اسی کے بعد تو مجھے پرائنڈ آف پرفارمنس ملا تھا۔“
 ”کوئی ایک فصیحیت جو آپ ہمیشہ دوسروں کو کرتے ہیں؟“

”جی کہ جو جگہ ہے اس کے مطابق زندگی گزاریں پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ناگاہی سے دوچار نہیں کرے گا۔ یہ میرا ایمان بھی ہے اور دوسروں کو فصیحیت بھی ہے۔“

”ماشاء اللہ آپ کو کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں؟“
 ”تقریباً 38 سال اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کامیابیاں دی ہیں۔ میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں۔“
 ”زندگی میں کبھی مشکل وقت آیا؟“

”زندگی میں مشکل وقت ہر انسان پر آتا ہے اور مجھ پر بھی آیا اور یہ مشکل وقت ہمیں کچھ سکھانے اور کچھ بنانے آتے ہیں۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس مشکل وقت میں اپنے آپ کو کتنا مضبوط رکھتا ہے۔“
 ”انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟“

”میرا خیال ہے اگر انسان اپنی زندگی میں خوشحال ہے تو پھر اس کے لیے ہر دور شہری دور ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسے ہر دور کو انجوائے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ

لیکن اپنے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے نہیں کرکٹ انٹر لائیو پروگرام میں لائیو پرفارمنس میں ہوں گا تو کیا لوگ ہمیں بخش دیں گے ہرگز نہیں اور لوگ پیسہ خرچ کر کے۔ آتے ہیں صرف ریکارڈنگ سننے کے لیے نہیں۔“

”آج جب لوگوں کو شہرت مل جاتی ہے تو اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟“
 ”آج لوگوں کو بہت سمولتیس بھی ہیں اور بہت سے چیلنجز بھی ہیں کہ جن کی وجہ سے لوگوں کو شہرت حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہمارے دور میں تو بہت مشکلات تھیں۔“

”ملک سے باہر پہچان لیتے ہیں لوگ آپ کو؟“
 ”جی ہاں۔ اللہ کا شکر ہے کہ جہاں جہاں اردو بولنے والے اور میوزک کا شوق رکھنے والے لوگ ہیں وہ ہم کو پہچان لیتے ہیں اور آؤ گراف لیتے ہیں۔ ہمارے گانوں کو ڈھراتے ہیں تو ہمیں بھی اچھا لگتا ہے۔“

”فائنل وقت کیسے گزارتے ہیں؟“
 ”میکس سائز کا شوق ہے خاص طور پر وہ اسٹینڈنگ اسکو اش کھیلتا ہوں اور مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے جب ملک سے باہر جاتا ہوں تو راستے کے لیے اور ملک سے باہر فارغ وقت گزارنے کے لیے کتابیں ساتھ لے جاتا ہوں۔“

فردوس رحیل

”سرا کہے ہیں؟“
 ”اللہ کا شکر ہے۔“
 ”آج کل آپ کا ”کیمسٹری“ اور ”خدا اور محبت“ دیکھ رہے ہیں۔ دونوں ہی بہت اچھے جا رہے ہیں آپ ایک تخت پاپ دکھائے گئے ہیں سہام زندگی کیسے ہیں؟“
 ”تقدیر ابھی اس کا اندازہ تو آپ کو میری فیملی ملنے کے بعد ہی ہوگا۔“

تھے اس زمانے میں صرف ایک ہی جیسٹل تھا یعنی بی بی وی۔ جبکہ آج کل تو چینلوں کی بھرمار ہے اور بے تحاشا میوزک چینلز بھی ہیں تو کوئی ایک گانا بھی گانا ہے تو اسے شہرت مل جاتی ہے۔“
 ”اور شاید لوگ پاپ میوزک سے بھی زیادہ آشنا نہیں تھے؟“

”جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ تازہ حسن اور زوہیب حسن نے پاپ میوزک کا تھوڑا بہت شعور دیا مگر انہیں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تو جی بات ہے کہ ہمیں اپنی جگہ بنانے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنا پہلا گانا ایک غیر ملکی چینل پر دیا تھا؟“
 ”بالکل سچ ہے اور ہمارے گروپ کا پہلا گانا ”میمی وی ایٹا ہے“ چلا تھا اور جب اس چینل پر لوگوں نے دیکھا تو انہیں پسند آیا اور پھر پاکستانی چینل سے بھی یہ گانا آن لائن ہوا۔“

”آپ کے گانوں کی جو ویڈیوز ہوتی ہیں اس میں آپ کا عمل دخل کتنا ہوتا ہے؟“
 ”کوئی عمل دخل نہیں ہوتا میں ساری ذمہ داری ڈائریکٹر پر ڈال دیتا ہوں۔ وہی اپنے آپ پر یا زکے ساتھ کام کرتا ہے۔ بلوڈز کا انتخاب بھی وہی کرتا ہے۔“
 ”معتقول تو آپ اب بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی نمبرون تک کتنے سال رہے؟“

”1993ء میں ہمارا پہلا البم آیا تھا اور چونکہ ہمارا مقابلہ کسی سے بھی نہیں تھا اس لیے 1998ء تک ہمارا گروپ نمبرون رہا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہماری میوزک نے ہمارے گانوں نے ہی لوگوں کو شعور دیا۔“

”عموماً لائیو پرفارمنس پر گلوکار اپنا سنگٹھ کرتے ہیں؟۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیا براہ راست گلے کی صلاحیت نہیں ہوتی؟“
 ”دوسروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

دور جس میں کوئی فکر و فائدہ نہیں ہوتا۔ چاروں طرف سے پیار ہی پیار مل رہا ہوتا ہے تو صرف اور صرف بچپن کا دور ہوتا ہے۔“

”بچپن کی بات کر رہے ہیں تو کوئی خواہش تھی بچپن میں کہ یہ بن جاؤں یا وہ بن جاؤں؟“
 ”نہیں۔ میرا میں خیال کہ میں نے ایسا کچھ سوچا ہو گا۔ بچپن میں تو ہر وہ کام کرنے کا دل چاہتا ہے جو بڑے کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن شکر ہے خداوند کریم کا کہ جونا اس نے دیا۔“

”آپ کی نظر میں زندگی کیا ہے؟“
 ”زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خوب صورت نعمت ہے جس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ زندگی کا ہر روپ خوب صورت ہے۔ میری شوٹ کا گانا ہو رہا ہے۔“

”چلیں جی۔ آپ مصروف ہیں تو پھر بات کریں گے۔“



کچھ یادیں کچھ باتیں

صبرِ خان

شاہین رشید

میرے آبِ و اجداد کا تعلق ”بونیر“ ضلع سے ہے۔ اس لحاظ سے ہم لوگ والد کی طرف سے چھان اور والدہ کی طرف سے اردو لکھنؤ ہیں کیونکہ ان کا تعلق یوپی سے تھا۔ والد بہت کم عمری میں ہی مائیکریٹ کر کے اندر چلے گئے تھے۔ انڈیا کے شہری گڑھ میں ان کا قیام ہوا۔ میرے والد ماشاء اللہ ایک بہت اچھے بزنس میں تھے اور بھارت، کمپنی کے نام سے علی گڑھ میں کارخانہ تھا اور والدہ ماؤس وائف تھیں۔ چونکہ میں کراچی میں بی بی بزمی تو زبان پشتو کے بجائے اردو ہی دینی۔ لیکن میرے بچپن اور پھر پیموں کو سب کو

ابتدائی زندگی :-
میں چھ اتھور کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرا نام مبصر میرے والد صاحب نے رکھا۔ چونکہ یہ نام زیادہ تر لڑکوں کا ہوتا ہے۔ بچپن میں تو مجھے اس نام نے پریشان نہیں کیا لیکن جب میں شو بزم میں آئی تب ذرا پریشانی اٹھائی۔ بڑی کیونکہ ایک تو مبصر پھر اس کے آگے خان تو جب مجھے کوئی بک کرنے کے لیے کہتا تھا تو نیا بندہ یہی جواب دیتا تھا کہ ”بھئی ہمیں خاتون کی ضرورت ہے مرد کی نہیں چنانچہ پھر میں نے ”مبصر خانم“ لکھنا اور لکھنا شروع کر دیا۔



تھا۔ سنا ہے اس کے چچے کوئی کہانی ہے؟
”جی ہاں۔ اس کے چچے کہانی یہ ہے کہ اردو آرٹ کالج میں ایک کنسرٹ کے دوران کسی نے مجھے قاتلانہ حملہ کیا تھا اور میں تین دن بے ہوش رہی۔ اور جب ہوش میں آیا اور اپنے آپ کو زخم سلامت دیکھا تو احساس ہوا کہ زندگی کتنی قیمتی اور قیمتی ہے۔ چنانچہ جب نیا ایم کیا تو اس کا نام ”نئی زندگی“ رکھا۔

”کتنی عمر سے گارے ہیں؟“
”میں جی پانچ سال کی عمر سے گارے ہوں۔ بس وقت نکلتا کرتا تھا خواہ اسکول کا کام کر رہا ہوتا تھا کھیل رہا ہوتا تھا۔ کلاس میں بیٹھ کر بھی نکلتا کرتا تھا اور میری یہ بات میری ایک بھڑکوت بری لگتی تھی۔ وہ اس بات پر اکثر مجھے ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔“
”اور بچے تو ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہوں گے۔“
”ہاں جی دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹا فرحان فیض ڈیرا ٹنک کر رہا ہے اور دو سرے بیٹا شیراز جو جی نے کیا ہے میوزک انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی ہے۔“
”چلیں جی۔ آپ اسی طرح لوگوں کے دلوں پر کرتے ہیں۔“

سلیم جاوید
”کیسے ہیں۔ آج کل بہت اُن ہیں؟“
”میں ٹھیک ہوں اور کیا مطلب ہے اُن سے۔“
”میں تو ہمیشہ اُن ہوں۔“
”جی بالکل۔ میرے خیال میں آپ ہی واحد فنکار ہیں جو پہلے دن کی طرح مقبول ہیں۔“
”بس اللہ کا کرم اور لوگوں کی دعاؤں اور محبت کا اثر ہے۔“
”آپ کے پروفیشن کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں۔ تھوڑی سی گھڑبائیں کرتا چاہوں گی۔“
”جی ضرور۔“
”مثلاً“ آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور آپ کو گلوکار بنانے میں اہم رول کس نے ادا کیا؟“
”ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں اور میں گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ اپنے بھائیوں میں سوئیے مجھ سے بڑی بہن ہے۔ گلوکار بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور یہی شوق مجھے حیدر آباد سے کراچی لے کر آیا اور مجھے گلوکار بنانے میں معین اختر اور شوکت رضوی نے بہت تعاون کیا۔“
”آپ نے اپنی ایک اہم کا نام ”نئی زندگی“ رکھا

دین

اپریل 2011ء کے شمارہ میں ایک نیا نمبر

۶ کون کی سالگرہ کے موقع پر ہم نے دلچسپ سروے کا پتہ

حصہ

۶ "ماں اور گھر" کی اداکارہ "فاطمہ آفندی" سے

شاہین رشید کی ملاقات

۶ اداکار "نذیر" کے پیرائے کے ساتھ

۶ اداکارہ "جگن کاظم" کی فلم کی عمارت میں

۶ "بول کے لب آزاد ہیں تیرے" کی فلم کے لیے

دلچسپ سلسلہ

۶ "محب سے ملنے" کی فلم کی باتیں

۶ "درند" کی فلم کی سلسلہ وار باتیں

۶ "نست کوڑہ گر" کی فلم کی سلسلہ وار باتیں

۶ "عشق آتش" کی فلم کی سلسلہ وار باتیں

۶ "فرحان اظفر" اور "انہلہ کن" کی فلم کی باتیں

۶ "گوشہ عاقبت" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

۶ "سٹیل" کی فلم کی باتیں

میری شادی بھی چودہ چودہ کی عمر میں ہو گئی تھی۔ آپ خود سوچیں کہ میٹرک کے بعد میری شادی ہو گئی تھی۔ میری شادی میری ہی کی پسند سے ہوئی، اپنی کم عمری میں پسند ناپسند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری سسرالی فیملی بہت مختصر تھی میرے شوہر اکھوتے بیٹے تھے ایک ان کی بہن تھی والدین لاہور میں رہتے تھے۔ یہ کراچی میں میری ساس بہن بہت پیار دیتی تھیں میری شادی کے سات ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا شوہر پہلے ہی کراچی میں رہتے تھے تو جو اسٹبل فیملی تو مجھے ہی ملی نہیں۔

میری شادی کو ماشاء اللہ چالیس سال ہو گئے ہیں۔ میرے میاں کا نام بدرالدین خان ہے میرے ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں دو بیٹیاں اور بیٹے کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک بیٹی نکواری ہے میرے بچوں کے نام یہ ہیں۔ بڑی بیٹی صدف خان جو کہ

یوٹیشن ہے چوبیس سال کی ہے پہلے وہ دینی میں تھیں خان شوہر تھے وہ پھر کرام ختم ہوا تو صدف کراچی آگئی۔ ثروت انجناڈرٹ عامر اور بیٹے کا نام روئیل خان ہے ایک بیٹا انتقال کر چکا ہے جب میں ڈرامہ سیریل "انجناڈرٹ" کر رہی تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا اس کی عمر تقریباً "چودہ سال" تھی۔ میرے بیٹے روئیل خان کی بھی شادی ہو چکی ہے میری سوماشاء اللہ بہت اچھی ہے میرے ساتھ میں بھی اس کے ساتھ بہت اچھی ہوں۔ اپنے منہ سے تعریف نہیں کرتی چاہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں عام ساسوں کی طرح ساس نہیں ہوں۔ آپ کو بتاؤں کہ میری

ہو ایم ای بی ایس ڈاکٹر ہے لیکن وہ بالکل ایک گھریلو لڑکی کی طرح میرے ساتھ رہتی ہے۔ گھر میں رہتے ہوئے میری خدمت کرتی ہے۔ گھر کے تمام کام بھی کرتی ہے۔ ہمارا اپنا گارمنٹ کابرنس ہے۔

پرنسپل انجناڈرٹ : بچپن سے ہی میری خواہش تھی کہ میں جیمز میں پڑھائی میں سب سے نمایاں ہوں لوگ مجھے میرے حوالے سے پچھتائیں۔ یہ تو بس ایک دن مجھے میری

ہوتی تھی تب تک تو امی کے ساتھ ہی جایا کرتی تھی کیونکہ ہمیں اجازت نہیں تھی کہ گھر والوں کی اجازت کے بغیر کہیں جائے۔ ہاں شادی کے بعد سیلیول کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ مگر ہماری امی کا ہماری شادی کے بعد بھی ہم پر بہت دُعا رہا۔

تریت کے معاملے میں بہت سخت تھیں اگر آنہ زندہ ہوتیں تو میں بیوی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ تو تصویر کھینچوانے کو بھی معیوب سمجھتی تھیں۔ اور خرچ کا یہ معاملہ تھا کہ جو ضرورتیں ہوتی تھیں وہ ماں باپ پوری کر دیتے تھے اس لیے خود سے خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اسکول کے زمانے میں تھوڑا بہت مل جاتا تھا۔ گھر سے ناشتہ کر کے جاتے تھے اور گھر آکر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے تو پیروں کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ سہ ماہ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میری خالہ کی اولاد نہیں تھی تو میری خالہ نے مجھے گودیا ہوا تھا۔ میری پرورش میری خالہ نے ہی کی انہیں بہت شوق تھا کہ میں پڑھوں اس لیے شادی کے بعد بھی میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ میری خالہ نے مجھے میری ماں سے زیادہ پیار دیا۔

میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ تھیں دو حسیال میں بھی میں پہلی اولاد تھی تو سب نے مجھے بہت لاڈ پیار دیا۔ بہن بھائیوں سے بھی ہمیشہ بہت اچھے تعلقات رہے۔ بچپن میں تھوڑی بہت تو تو میں میں ہو جاتی تھی لیکن بڑے ہونے کے بعد ایسا کچھ نہیں ہوا رشتے اور مضبوط ہو گئے۔

شادی : میری شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی اس کی وہ وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی شادیاں جلدی کر دیتے ہیں پھر میں گھر میں بڑی اور سب کی لاڈلی تھی ہماری امی کو بہت شوق تھا کہ ان کی بیٹی کی شادی جلدی ہو جائے مجھے یاد ہے کہ میرے بھائی کی شادی بھی سترہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور

پشتو آتی تھی۔ والد صاحب کی توساری تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تو سوچے کہ ان کی اردو کتنی اچھی ہوگی۔ جب والد صاحب پاکستان آئے تو یہاں بھی انہوں نے پرنس ہی کیا اور "کچھ طور کیمیکل" کے نام سے کمپنی بنائی جس کے تحت میڈیسن وغیرہ بنتی تھی۔ میری والدہ اور والد اب دونوں حیات نہیں ہیں۔

ہم ماشاء اللہ نو بہن بھائی ہیں ہم چھ بہنیں ہیں اور تین بھائی ہیں میں ہی اس فیلڈ میں ہوں اور کوئی اس فیلڈ میں نہیں آیا۔ بچپن : تعلیم : میری تمام تر تعلیم کراچی میں ہی ہوئی میں نے

گورنمنٹ اسکول قائم کیو سے میٹرک کیا میٹرک کے بعد شادی ہو گئی تو میں نے پرائیویٹ انٹر کیا اور پرائیویٹ ہی لاء کی تعلیم حاصل کی۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا عیش سے ہی بہت شوق رہا۔ مجھے آج بھی موقع ملے تو میں دوبارہ پڑھائی شروع کر دوں اور زمانہ طالب علمی میں میں بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی۔ لاء کرنے کے بعد میں نے چار لایچ سال پریکٹس بھی کی لیکن مجھے اس فیلڈ میں کام کر کے مزہ نہیں آیا اس لیے میں نے چھوڑ دی۔

بچپن میرا بہت اچھا گزرا۔ شرارتی نہیں تھی، آپ کو یہ بھی ہے کہ لڑکیاں اتنی شرارتی کہاں ہوتی ہیں میں تو بچپن سے ہی بہت سنجیدہ اور بہت حساس تھی، سوچتی بہت زیادہ تھی کوئی کھانا ڈال رہی نہیں تھا مجھ میں اور بہت بچپن میں گڑبڑوں سے بھٹی ہوں لیکن جیسے ہی تھوڑی بڑھ چکی ہوئی۔ گڑبڑوں سے بھٹکانا بھی چھوڑ دیا۔ اسکول کے زمانے میں میں بہت اچھی

انتہائیت بھی رہ چکی ہوں اور ہمیشہ فرسٹ آتی تھی اسکول میں جتنے بھی گیمز میں حصہ لیتی تھی ہمیشہ پہلے نمبر پر آتی تھی۔ بچپن میں مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا اور زیادہ تر امی کے ساتھ جایا کرتی تھی کیونکہ تقریر کا بھی ذریعہ ہوتا تھا۔ جب تک شادی نہیں

گیسٹوفل

سیرپ اور ٹیبلیٹس

گیس، سیرپ کی جلن اور
بد ہضمی منٹوں میں جائے



فشی

ہوں مزاج میں خودی لری ہے مجھ سے کسی کی طرف سے
ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مجھ سے کسی کی طرف سے
بات برداشت نہیں ہوتی اور میں ظلم سننے والی عورت
نہیں ہوں۔ بچوں کے ساتھ میرا رویہ دوستانہ ہے ہر
کے ساتھ تو ایسے تعلقات ہیں جیسے وہ میری دوست
اور دامادوں کے ساتھ بھی میرا ایسا ہی دوستانہ رویہ ہے
مروہ مجھ سے ڈرتے بھی بہت ہیں کہ کب ساس لٹی
غصہ آجائے۔

کیا کھو یا کیلایا :-
زندگی میں امار چڑھاؤ تو بہت آئے والدین کے
زمانے میں بھی۔ میری والدہ کا انتقال بہت کم عمری میں
ہو گیا تو گھر کی بڑی ہونے کی وجہ سے مجھے پر ذمہ داریاں
آئیں مہینوں میں نے احسن طریقے سے بچھلایا
میرے سارے بہن بھائی چھوٹے تھے تو ان کی
شادیوں کی ذمہ داری میں نے اٹھائی۔ اپنے والدین
بہت اچھا وقت بھی دیکھا اور ان کا تھوڑا سا ذوال بھی
دیکھا۔ میری اپنی شادی شدہ لائف میں بھی نرم کر
دن آتے رہے سب اچھے برے دنوں کو ساتھ لے کر
چلتے رہے۔ کبھی نہیں باریغ اللہ نے مجھے بہت
پامت بٹایا ہے۔ بہن بھائیوں کی ذمہ داری اٹھانے میں
اس لیے بھی آسانی ہوئی کہ میرے شوہر نے میرے
ساتھ بہت تعاون کیا۔

گھر کی امور :-
جب گھر میں رہتی تھی تو سب کام کرتی تھی۔ کھا
پکاتے میں کالی ماہر بھی اصفانی سحرانی کا بہت خیال رہتا
تھا کیونکہ ہماری امی کو صفائی کا بہت دھیان تھا تو ان ہی
کی عادت ہم میں بھی آگئی۔ سلائی کوڑھائی میں بہت
ماہر تھی اور میں اپنے اللہ کی بہت شکر گزار ہوں کہ اس
نے مجھے بڑی خصوصیات سے نوازا ہے، میری پیشگیوں
میں میری والدی خصوصیات ہیں۔

اللہ اللہ! میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔
میرے رب نے مجھے ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا
ہے۔ لیکن انسان بہت ناشکرا ہے، جتنا بھی نوازا
پھر بھی شکوہ شکایت تو رہتی ہی ہے مگر میں اپنے رب
کی بہت شکر گزار ہوں۔

کالم پاشا صاحب سے ہوئی راکھ کوھر کی باتیں چل
رہی تھیں کہ انہوں نے مجھے اپنے ڈرائے میں کام
کرنے کا پشکس کر دی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے
اواکاری تو نہیں آتی۔ البتہ میں مختلف تقریبات میں
کمپوٹنگ کر چکی ہوں اور خبریں پڑھنے کا مجھے شوق
ہے تو کالم پاشا نے کہا کہ میں آپ سے اواکاری
کروالوں گا آپ بے فکر ہو جائیں۔ چنانچہ ان دنوں وہ
"جانگھوس" بنا رہے تھے، اس میں انہوں نے مجھے
ایک چھوٹا سا کروار دے دیا تو میں اس طرح میں ڈرامہ
کی فیلڈ میں آگئی۔ پھر میں نے نیوز کے لیے ٹویشن
دیا اس میں بھی کامیاب ہوئی تو مجھے کہا گیا کہ آپ کی
جھ مینے کی شریٹنگ ہوگی جس میں آپ کو سب کچھ
سکھایا جائے گا کہ خبریں کس طرح پڑھتی ہیں اور سر
دوڑنے لے کر بیٹھنا ہوگا۔ یہ کالم مجھے مشکل لگا اور میں
نے کہا کہ اتنی مشکلات میں میں نہیں پڑ سکتی۔ میرے
لیے اواکاری بہتر ہے جب اس فیلڈ میں آئی تو میں
نے نہ صرف کمپوٹنگ اور اواکاری کی بلکہ پروڈکشن
اور ڈائریکشن بھی کی اور ٹینگ بھی کی۔

اور جب میں اس فیلڈ میں آئی تو میرے بچے پاشا اللہ
کافی بڑے ہوئے تھے سب سے چھوٹا بچہ آٹھ سال
کا تھا۔ مگر خاندان والوں نے بہت اعتراض کیا۔ میاں
صاحب نے ذرا بے دے الفاظ میں کہا۔ بہن بھائیوں
نے اعتراض کیا، اصل میں ہم پشیمان ہیں تو سب کی
سوچ بھی بچھاؤں والی ہے۔ کبھی عورت کو کام نہیں
کرنا چاہیے اسے گھر میں ہی رہنا چاہیے میرا بڑا بھائی
مجھ سے کافی عرصہ ناراض رہا اور ابھی بھی وہ کچھ زیادہ
خوش نہیں ہے۔

مزاج :-
میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں بہت نرم مزاج رہی۔
مجھ میں غصہ نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں کیونکہ
بحیثیت انسان کے اور بحیثیت ماں کے میں یہ نہیں
کہہ سکتی کہ مجھ میں غصہ نہیں تھا۔ ہر انسان میں غصہ
ہوتا ہے۔ جہاں مجھے غصہ کرنا چاہیے تھا وہاں میں
نے غصہ کیا اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں غصے کی چیز

علاج

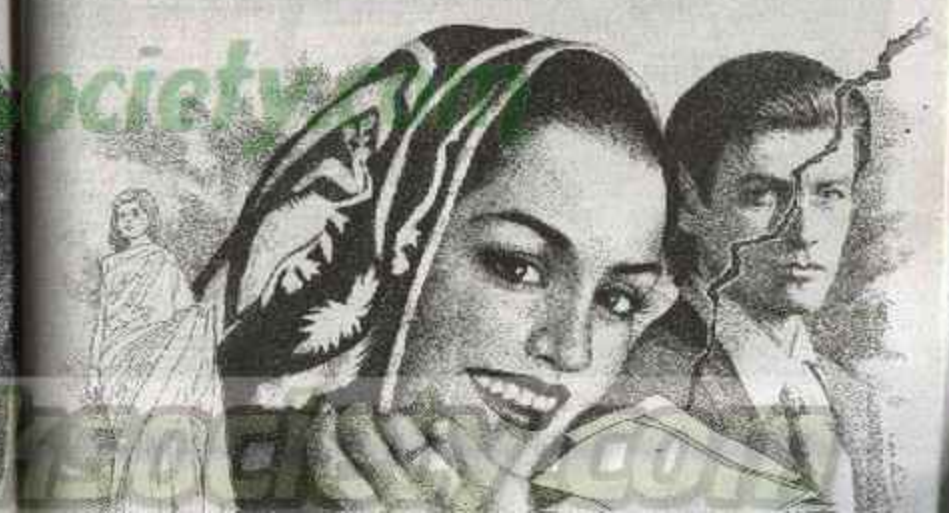
بات سوسائٹی



دین محمد منی سے محبت کرنے والا جن کا شہ مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون بگڑے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چہرہ پر بعد زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا جو مرد گھر اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرا اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرا چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر منکس ہے دین محمد کا دواں دواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے ٹیم ڈعا میں چلا ہے۔ اس کی دعا میں مستجاب ٹھہرتی ہیں اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے دو دو شہب نوکری کی بچی ہیں یہ تیرہ برس ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ بہت مستقبل کا خواب اسے تحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا ملگوا اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا پھرا وہ آرام کرنے لیتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بٹی حراست میں ہے۔ جس کا دوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ راجہ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور شوہر دکھا تا ہے کہ جنت بٹی ٹیڑھ فریسن کی مرہیں سے جس کی شادی ہوئی تھک لہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی ٹھکن کا شکار کرنے لگی ہے جسے اس نے لوگر دل کے سہارے لیتا ہے۔

ٹیم 24 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے جگہ کا ٹکاشے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ ٹیم کے دوست توقیر صاحب کے تو سکا سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ٹیم ملند اور بچی خاتون ہیں۔ دل، ولید اور انبیا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انبیا سے دوستی ہو جاتی ہے۔



شبیب العباس بیعتاً سخت گیر اور غصہ ور قہر جو ان تھے۔ جسے صفت نازک کا غیر ضروری ہنسا بھی ناگوار کرتا ہے۔ وہ تو نوری سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تحدید صفت سے نالاں ہے۔ شبیب، تنوی کو کاج چھوٹنے آتا ہے تو ہیلیا عبیرہ اور غزوہ تنوی کے سر جو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیب، تنوی کا مستبکتر ہے۔ وہ اس کی قسمت بردار شک کرتی ہیں۔ دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شبیب، ثروت و دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑ دیا تھا۔ انہیں کی محرومی نے اسے بد مزاج اور قبیح بنا دیا۔ وہ انبا اور ولید سے بہت ترقی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت ہیں۔ قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبا پر بڑی نظر ڈالنے پر وہ جے دی کے دوست سعدی کو بیٹ ڈالتا ہے۔ صرف بے ذی اس کی کیفیات کہتا ہے۔

ہمارے بڑے پر بڑا دانیال، شبیب کی ابھی طرہ دیکھ کر حال کرتی ہے تو شبیب ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر بغیر نہیں رہتا انہیں بڑا دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا علیہ لگاؤ دیتا ہے ساتھ ہی زبیدہ ہیں اور دین نبی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ وہیں چھ زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو باور دے کر وہ سب گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر وادارنے کے لیے آندا گا۔ ماوی کی کنگراؤ شبیب سے پرتا ہے جس سے ماوی کا پھر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھجھکا ہٹ کر ماوی کو بڑی طرہ سے ڈالتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شبیب سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ (اب آگے پڑھیے)

۱۔ دسویں قسط

شبیب کی حالت پہلے سے بہت برتر تھی، پلاسٹر اتر چکا تھا، لیکن بازو ہلانے جلانے میں ڈاکٹر نے خاصی احتیاط کرنا کی تھی، جس کی وجہ سے انہیں خاصی وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دوسرے کمزوری بھی بہت ہوئی تھی۔ مسلسل ادویات کے استعمال کی وجہ سے طبیعت مکرر رہتی۔

اس روز فجر کی نماز ادا کر کے ماوی زبردستی انہیں قریبی پارک میں لے آئی کہ ”آپ فریض محسوس کریں گی؟“ لیکن دوسرے ہی چکر میں شبیب ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئیں۔

”میں بھی ماوی! میں تو تھک گئی اب اور نہیں چلا جائے گا مجھ سے۔“ قریبی بیچ پر نشست سنبھالتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”آپ بوڑھی ہو گئی ہیں مٹی!“
”بوڑھے ہوں میرے دشمن! وہ تو ایک سمنٹ کی وجہ سے ویک نہیں ہو گئی ہے، ورنہ تم سے پہلے اس پارک کے دس راؤنڈ لگا سکتی ہوں۔“ شبیب نے ناک پر سے بھی اڑاتے ہوئے کہا۔ ماوی نے شرارت سے انہیں دیکھا۔ ”یہ بات تو آپ نے ڈبلن میں بھی کئی بار کہی تھی، لیکن خدا کے بعد میں گواہ ہوں،“ وہ کے بعد تیسرا چکر آپ کبھی مکمل نہیں کیا۔“

”تم جیسی پوستی لڑکی کو کیا پتا، کبھی مار تھک واک کے لیے گھر سے نکلی بھی ہو۔“ انہوں نے فوراً ”حساب لیا۔“

”اچھا آپ یہاں نہیں۔ میں دو راؤنڈ اور لگاؤں گی۔“ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ٹریک کی طرف چلی گئی۔

شبیب آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ کر اور گرد کا جائزہ لینے لگیں۔ پارک میں اتنی صبح بھی تقریباً ہر عمر کے مرد و خواتین حتیٰ کہ بچے بھی دکھائی دے رہے تھے، کچھ لوگ گھاس کے قطعات پر بیٹ بچھائے ہوئے اور مختلف ورزشیں کرنے میں مصروف تھے، ٹریک پر جا ٹنگ کرنے والوں سے زیادہ چل قدمی کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اندھیرا تقریباً ”تقریباً“ چھٹ چکا تھا۔ لیکن سورج آسمان کے کناروں پر کس کس کر رہی ہیں رہا تھا اور صوب کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ آسمان سے زمین تک محسوس کیے کی تازگی اور تخیلی تھی ہوئی تھی۔ گھاس غم غم سی تھی۔ پتوں پر رات کا کراہت تھا، جبکہ درختوں کے پتوں سے رات بھر کی جھنجھکیوں سنائی دیتی تھیں۔ آسمان پر چرخ کے پرنے اڑان بھر رہے تھے اور ان کی دلکش آوازیں سارے میں بھر جاتی تھیں۔

جب سی ثروت اور انبیا آگئیں۔ ثروت تو خیر واک کی عادی تھیں، انبیا یوں ہی آگئی تھی۔

”شبیب! آئی! آپ کی آئی ہیں؟“ انبیا نے پوچھا۔

”نہیں ماوی! بھی آئی ہے۔ میں تھک گئی تو یہاں بیٹھ گئی۔ ماوی! اپنے دو راؤنڈ پورے کر لے، پھر گھر جائیں گے۔“

”ابو بیٹے! میرا بھی موڈ نہیں ہے آج واک کرنے کا، تم چاہو تو ماوی کے ساتھ واک کر لو، میں یہاں شبیب کے پاس بیٹھی ہوں۔“ ثروت نے انبیا سے کہا تھا، وہ سہلا کر ماوی کے پاس چلی گئی۔ ثروت شبیب کے پاس بیٹھ کر حال احوال دریافت کرنے لگیں، لیکن ان کی سٹلاشی نظر س پارک میں حد تک محسوس نہیں۔

”ایسے درخت جو ملی میں بہت تھے۔“ ”معا“ شبیب نے ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جس کے پتے لے اور چبے تھے، ثروت نے چونک کر شبیب کو اور پھر درخت کو دیکھا۔

”سندے کے درخت تو پہچان تھے اس جو ملی کی۔ ویسے حیرانی کی بات ہے اس جو ملی میں چند روز گزارنے کے باوجود آپ کیا دے۔“ ثروت نے جیسے شبیب کی یادداشت سے متاثر ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”چند روز میں پوری ایک زندگی۔“ ”شبیب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی کے بدترین دن اس جو ملی میں گزارے تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا۔ کسی دن میرا دل غی پھٹ جائے گا اور اب بھی حیرانی ہوتی ہے کہ وہاں سے نکلے ہوئے میرا ذہنی توازن کیسے درست رہ گیا۔“ وہ جیسے اسی دور میں پہنچ گئی تھیں جو ان کی زندگی کا بدترین دور تھا۔

”میں تو آپ پر بہت رشک کرتی تھی کہ بڑے مناسب وقت پر آپ کی جان چھوٹ گئی۔“ ثروت نے قدرے تجسس سے کہا تھا۔

”جان تو چھوٹ گئی تھی، مگر وقتی طور پر اللہ نے قسمت میں دوبارہ اسی عقوبت خانے میں جانا لکھا ہوا تھا اور وہ سب باریک بینی کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی کہ میری ساری زندگی ہی وہاں ہو گئی۔ رہائی کی کچھ نہ کچھ قیمت ادا کرنا پڑی ہے، لیکن اتنی بڑی قیمت۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ ثروت نے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔ ”شبیب کے چہرے پر دکھ کا سایہ لہرا رہا تھا۔ دل میں جیسے نسیبی کی آگ لگنے لگی۔

”شبیب۔“ جب وہ برنگ خاموش رہیں اور اپنا غم چھپانے کو لبوں کو دانتوں سے چلاتی رہیں اور ان کی آنکھوں میں نمی کی دھلکی دیکھنے کی تو ثروت کے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ثمنہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے آنسوؤں کو پیچھے چھوڑ دیا۔
 "جوہلی میں ہادی کے بابا کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ میں سہاگن بن کر اس جوہلی میں گئی تھی یہ وہ دن کر نکلی۔ اس
 جوہلی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ انا جو کچھ تھا وہ بھی چھین لیا۔"
 ثروت کے لیے یہ اتنا بڑا شاک تھا کہ وہ بیڑی پر تک پہنچ بول ہی نہیں سکیں۔
 "میرے خدایا! مجھے تو رجب بھائی کے بارے میں بتا ہی نہیں تھا۔ میں تو اب تک۔ میں سمجھی وہ آئرلینڈ
 ہوں گے۔"

ثروت صرف اتنا ہی کہہ سکیں ان کے لیے تو یہ ایسی غیر معمولی اطلاع تھی جس پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
 "میرے کے یہ بدستی شاید نیا ہے۔ یقیناً یہ ثمنہ اپنے مجھے مت دکھ ہوا ہے۔ رجب بھائی سے کو کہہ
 زیادہ ملاقات نہیں ہوئی۔ یقیناً میں جانتی ہوں وہ بہت اچھے انسان تھے۔ مستقیم سے بہت تعریف سنی تھی ان کی۔
 ثروت نے جیسے بجورا "مستقیم" بھی کا نام لیا تھا۔
 "چھال۔ حیرانی ہے۔ اس جوہلی میں کوئی رجب کی تعریف بھی کرتا تھا۔" ثمنہ کے لمبے میں دکھ بھی تھا، حسرت

بھی۔
 "تو کسی اور کا تو بتا نہیں، لیکن مستقیم اکثر ان کی تعریف کرتا تھا۔" ان دونوں کے درمیان چند لمحوں کی خاموشی
 حائل ہوئی پھر ثروت نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔
 "مجھے احساس ہے ثمنہ! یہ ذکر آپ کو مت دکھ پناچار ہوا گا، لیکن مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کیسے ہوا یہ سب۔"

"چھوٹو ثروت! بیڑی کی کہانی ہے یہ پھر جو بات صرف دکھ دے اس کا بار بار ذکر کرنے کا مکہ؟"
 "مگر آپ مجھے رجب بھائی کے انتقال کی خبر سنائیں تو مجھے اتنی حیرانی نہ ہوئی، لیکن کل۔۔۔ وہ بھی جوہلی کے
 ناقابل یقین۔"

"تو قابل یقین؟" ثمنہ نے کرب سے دوہرایا۔ "اس جوہلی نے کس کو خوشیاں دی تھیں ثروت! اگر غم کی
 ناقابل یقین تھی۔ اپنی طرف سے کھو میری زندگی دیکھو وہ جوہلی دھول کا بدنخ بھی اور کچھ نہیں۔"
 "اکھواڑی تو ضرور ہوئی ہوگی۔ آپ کو کسی پر شک تھا؟"

"جب جوہلی سے نکلی تو وہی حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی پر شک کر سکتی۔"
 "ماوی جاتی ہے؟"
 "کیا؟"

"یہ یقین۔ کہ اس کے والد کا قتل ہوا تھا۔"
 ثمنہ نے آہستگی سے نفی میں سر ہلادیا۔
 "ماوی اس وقت بہت چھوٹی تھی وہ یہ ہی سمجھتی ہے اس کے بابا کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا تھا۔"
 "جلال!" وہ سامنے سے جا آگ کر کے ہوئے گزرا تھا، ثروت بے ساختہ پکار بیٹھیں۔ جلال نے گردن
 انہیں دیکھا، پھر اگلے قدموں ان کے قریب آیا۔

"السلام علیکم۔"
 "وعلیکم السلام، کیسے ہو جلال؟" ثروت نے پوچھا۔
 "میں ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟" وہ سدا کا بابا اب تھا۔
 "جلال! شبیہ آج جا آگ کر کے نہیں آیا؟" اس کے سوال کا جواب سر ہلا کر دیتے ہوئے ثروت نے

وہ چھٹی بھرنے لہجے میں پوچھا۔
 "وہ تو مجھ سے بھی پہلے ہی یارک آیا تھا۔" جلال نے لاوہر اور شیبہ کو تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھیں،
 اس طرف انکسرا کر رہا ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ثروت کی آنکھوں میں نور سا اتر آیا تھا۔ شیبہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر نظر تلے ہی اس نے ناگواری سے
 چہرہ موڑ دیا۔ ثروت کے دل کو دکھ کا سا لگنا لگتا۔
 ثمنہ جلال سے کہہ رہی تھیں۔

"تھرے تو بھی میں سخت فضا ہوں" چھی مدوی "شکریہ کاموقع بھی نہیں دیا۔"
 "اچی! آپ لوگ اتنا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں پہلے آپ کے بھائی نے شکریہ کہا پھر آپ
 کی بیٹی نے بھی یہی کہا اب آپ بھی شکریہ کہہ رہی ہیں۔ بیوی، کوئی اتنا بڑا کام نہیں کیا میں نے کہ آپ لوگ
 شکریہ ہی کہتے رہیں۔" جلال نے بے چارگی سے کہا ثمنہ ہنس دیں۔

"چھال! بارہ کوئی شکریہ نہیں کہے گا لیکن ذرا یہ پلاسٹرا تر جائے پھر میں تمہیں کھانے پر انوائٹ کروں گی دو کھو
 انکار مت کرنا۔" یعنی مجھے بھی تو لگنا چاہیے کہ میں نے اپنے محسن کا شکریہ اچھے طریقے سے ادا کیا ہے۔ ثمنہ نے
 بے حد اہمیت سے کہا تھا۔ جلال انکار نہیں کر سکا۔ اثبات میں سر ہلایا اور خواتین کو خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔
 ثروت خاموش بیٹھی اس طرف دیکھ رہی تھیں جہاں ہری ہاتھ کے پیچھے شیبہ کی جھلک دکھائی دے رہی
 تھی۔

"آپ جلال کو کیسے جانتی ہیں؟"
 "جلال ہی مجھے اسپتال لے گیا تھا بڑی مدد کی اس نے میری۔"
 "ویسے بڑا اچھا لڑکا ہے دل کا تو بہت ہی اچھا ہے۔" ثروت نے کہا۔ "ورنہ مجھ سے کیا رشتہ ہے کہ اتنی تیز
 ترنہ سے ملے شفاء اللہ بہت نیک ہے، ماں باپ خوش قسمت ہیں جلال کے۔"

"اور تمہارا بیٹا؟" ثمنہ نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے تمہارے بیٹے کے ماں باپ خوش قسمت نہیں ہیں؟"
 "باپ خوش قسمت ہے اور ماں۔ جس کی شکل اس کا بیٹا دیکھنا ہی نہ چاہے وہ ماں ملتی خوش قسمت ہو سکتی
 ہے؟" ثروت کے لیوں پر غم جو سی مسکراہٹ تھی۔ ثمنہ نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نسلی امیرو انداز میں
 چھیٹایا۔

"تھیں نے کماناں ثروت! وہ جوہلی دیکھوں کا بدنخ تھی جس سے کسی کو کوئی سکھ نہیں مل سکا۔"
 "ایٹ گارے کی جوہلیاں کسی کو دکھ نہیں دیتیں ثمنہ! جوہلیوں میں بسنے والے پھر انسان دکھ دیتے ہیں۔"
 ثروت کے لہجے سے آہٹ آئی تھی۔
 پھر وہ دونوں خاموش ہو گئیں حتیٰ کہ سونج کی کرشمیں درختوں سے اتر کر سب گھاس پر پھیل گئیں۔

☆ ☆ ☆
 "میں کل سے یہاں نہیں آؤں گا شہر میں اور بہت سے پارک ہیں جہاں جا آگ کے لیے جایا جاسکتا ہے۔"
 شیبہ نے جلال کے ساتھ ٹریک پر دوڑتے ہوئے تلخی بھری سنجیدگی سے کہا تھا۔
 "اگر پارک میں کیا برائی نظر آئی؟" جلال نے لحظہ بھر کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 "کس قدر بھیڑ مری ہے یہاں۔ پارک کم چڑھا گھر زیادہ لگتا ہے۔ ہر ایریا غیر امنہ اٹھا کر آنے لگا ہے۔" کو کہ یہ

برادری اجتماعہ اعتراض تھا لیکن جلال نے قہر سے پروا نہ کی۔

”یہ بیکس پارک ہے محترم! آپ کا پرائیویٹ پارک نہیں کہ جو بھی آئے آپ کی اجازت لے کر آئے۔“

شبیہ نے اس بات پر کڑی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”اسی لیے کہ رہا ہوں کل سے کسی اور پارک میں جاؤں گا۔“ اس نے سگ کر کہا۔ ”تم اطمینان سے رہیں اور آتی جاتی“ انہوں کو سلام کرتے رہتا۔ اس نے جسے دانتوں کے بیچ جلال کو پکڑ ڈالا۔

”چھا۔ اب سمجھا۔ غصہ کس بات کا ہے“ شبیہ کی ناراضی کے ڈر کے باوجود وہ اپنی بے ساختہ ہنسی روک نہیں سکا۔

”تم بھی سلام کر لیتے“ اس نے مشورہ دیا۔

”کس خوشی میں؟“ وہ آؤ کھا کیا۔

”نیکیاں ملتی ہیں۔“ جلال نے معلومات میں اضافہ کیا۔

”جس مہارگ ہوں یہ نیکیاں اور بہت سے طریقے ہیں نیکیاں جمع کرنے کے“ اس نے جل کر کہا۔

”یار شبیہ! کیا ہو جاتا اگر تم سلام کر لیتے جھوٹا سلام کرنے میں کتنا ناگم لگتا ہے وہ بے چاری اتنے ہی خوش ہو جاتی۔“

”جے ڈی! امیر دماغ پہلے ہی گرم ہو چکا ہے۔ بے تکی فصاحت کا الٹا اثر ہوا تو منہ گچ کے ذمہ دار تم خود ہو گے رشتہ دار یاں بھانے کا شوق ہے بھلاؤ مجھے ان لوگوں کی ضرورت نہیں۔“

”وہ میری نہیں تمہاری رشتہ دار ہیں۔ رشتہ بھی ایسا جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ میری رشتہ داری تو اسی دن ہو گئی تھی جس روز تمہارا جان نے انہیں طلاق دی تھی۔ میں ان سے ملتا ہوں یا ان کی ریسپیکٹ کرتا ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ شبیہ نے گردن موڑ کر ایک کڑی چٹختی ہوئی نگاہ جلال پر ڈالی اور وہ برحالتا آگے نکل گیا۔ جلال نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

”یہ نہیں سدھر سکتا“ اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سوچا تھا۔



”میں تو بھی ایسی ہی ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں کان کو سامنے سے پکڑا جائے یا سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر پکڑا تو

حال کان ہی جائے گا اسی طرح مجھے ہندو دھرم کہہ لو۔ وحیث کہہ لو یا مستقل مزاج۔ بات تو ایک ہی ہے۔“

ماویٰ نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ پارک سے واپس جاتے ہوئے وہ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑی دل چسپی سے روشنی ڈال رہی تھی۔ یہ بھی اچھا تھا کہ شہینہ شروت کے ساتھ نئی قدم آگے چل گئیں۔ ورنہ ایک دلچسپ بحث تو ضرور ہی چھڑ جاتی۔

”مجھے اپنی نیکی سے بہت محبت ہے بڑے ماموں، ممانی جان، فیضان ماما، شہروز، شہزاد سب سے بہت محبت۔ لیکن سب سے زیادہ محبت مئی سے ہے۔ مئی وہ دنیا کی واحد شخصیت ہیں جن کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

اپنی زندگی کا ہر فیصلہ بدل سکتی ہوں۔“

”بچپن میں مجھے اسکول تنگ کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ شہروز مجھ سے بڑا تھا شہزاد اچھوٹی۔ میں دونوں کو درگاہا کھوٹے پھرنے لگ جاتی تھی اور پھر مئی سے بڑے غضب کی ڈانٹ کھاتی تھی مگر آفرین سے میری ڈھٹائی

چال ہے جو کبھی اس ڈانٹ کا اثر لیا ہو یا تو قہر پر شرمندہ ضرور ہوتی تھی اور پھر فیصلہ کرتی تھی اب کوئی ایسا کام نہیں کروں گی کہ مئی کو ڈانٹنا یا خراب کرنے کا موقع ملے۔ لیکن یہ ایک اور فیصلہ تھا جو ہر بار بدل جاتا۔“

اس کے مقلدے کے کا اثر ہوتا تھا جیسے خود ہی اپنی شرارتیں یاد کر کے منظور ہو رہی ہو۔

”ایک مرتبہ ڈھلن کے سائیڈ ایریا میں سرکس لگی۔ میں حسب معمول اسکول تک کر کے دیکھنے پہنچ گئی۔ وہاں ایک کرب تھا کہ بازیکر گھر سے کنویں میں موٹر بائیک اور کار چلاتے تھے۔ میں اتنی متاثر ہوئی کہ خود بھی یہ کرب کرنے کے لیے چل اٹھی۔ اگلے ہی دن سے بائیک چلاتا سیکھے لگی اور ٹھیک تیسرے روز کنویں میں بائیک چلانے پہنچ گئی۔“

”پھر۔“ ماما نے خاموشی کا ایک ڈرامائی سا وقفہ لیا تھا انیس۔ جس سے پھر تک اٹھی۔

”پھر اس نے بے چینی سے پوچھا مائی گہری سانس بھر کر بولی۔

”پھر کیا۔۔۔ تین دن کی پریکٹس کے بعد بائیک تو مہارت سے نہیں چلائی جاسکتی تھی صرف فہم بھوری کروایا جاسکتا تھا سو میں نے ماما میں ٹانگ تروائی مئی خوب روئیں۔ اور پورے آٹھ دن مجھ سے بول چال بند رہی۔ نوے روز میں نے غصے میں آکر تیس سال بیٹ سے بڑوسیوں کے لڑکے کا سر بھاڑ دیا اس کی مئی آئیں ہم سے خوب جھگڑا کیا۔ وہ لوگ ہالینڈ سے آئے تھے۔ ”بوج“ کہتے تھے میں اس سے بالکل ناامید تھی۔ بعد میں فیضان ماما نے بتایا وہ

گالیاں دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے ”ٹھنڈا“ کر کے بھیجا ہے۔ گالیوں والی بات سن کر مجھے اور غصہ آیا۔

میں نے دوبارہ بیٹ اٹھایا تو مئی نے کہا اب گھر سے باہر نکلیں تو دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گی۔ میں نے کہا ابھی صرف وائیں طرف والے بڑوسی کا سر توڑا ہے۔ آپ دسویں دن بول چال بند رہیں گی تو بائیں طرف والے بڑوسی کا سر بھاڑ دوں گی۔ گیارہویں دن بھی بات نہیں کریں گی تو سامنے والوں کے لڑکے کا سر بھی میرے ہاتھوں سے

نہیں بچے گا۔ ابھی بات سامنے والوں تک ہی پہنچی تھی کہ مئی نے سفید جینز لہرا کر سیز فائر کر دیا اور یوں ہماری سڑک بھری۔“

”مخوڑا“ نہیں جھپٹتا مہنس ہنس کر انیس کے بیٹ میں مل پڑ چکے تھے۔

”میرے اللہ! تم کس قدر لڑا کا ہوتی تھیں مائی!“

”اس میں لڑا کا والی کیا بات ہے اور تم پلیر ہو نہ ہو میں اس صلح کا بڑا بھاری جرم نہ بھرتا پڑا تھا مجھے۔“ اس نے دیکھی لہجہ میں کہا۔

”اچھا وہ کیا؟“

”مئی سے وعدہ کرنا پڑا کہ میں دوبارہ کبھی کنویں میں بائیک چلانے کی بات نہیں کروں گی نہ ہی کبھی اس بارے میں سوچوں گی۔ بات کرنا میں نے چھوڑ دیا لیکن سوچ پر پابندی نہیں لگا سکتی تھی۔ رچو میگزین کی کسی قلم میں

ڈاٹریک سنا تھا کہ بھڑو خواہشات پوری نہ ہوں وہ زندگی کا سوراخ بن جاتی ہیں۔“ مجھے لگتا ہے میری یہ خواہش بھی تاسو بن چکی ہے تم یقین کرو انیس! مجھے خواب میں اکثر نظر آتا ہے کہ میں کنویں میں بائیک چلا رہی ہوں۔“

اس کے بات کرنے کا انداز بے حد دلچسپ تھا۔ چوبے حد شہیدہ آنکھیں بے پناہ شرارت سے جگر جگر کرتی ہوئی انیس کی ہنسی نہ رکتی تھی۔

”اے۔۔۔ تم دوستی جاری ہو جیسے میں لطفی سناری ہوں۔ لا حول ولا۔ میری اتنی بڑی خواہش۔۔۔ اس نے دہائی دی پھر خود بھی مسکرانے لگی پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔

”اچھا سنو۔ میری مئی کو مت بتانا کہ میں خواب میں بائیک چلاتی ہوں۔ انہیں گھبراہٹ ہو نا شروع ہو جائے گی

پھر میرے خواب کھتے پر بھی پابندی لگا دیں گی۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" انبیہ نے کہا۔ "تم نے آئی کا غصہ پڑوسیوں کے لڑکے پر کیوں نکالا تھا؟"

اس سوال پر ماویٰ نے پہلے قہقہہ لگایا پھر بولی۔

"مئی کا تو ایک چھوٹی بھانہ تھا۔ دراصل اس نے چار روز پہلے شہر سے جھگڑا کیا تھا اور اس کے چہرے پر پناہ مار رہے تھے میں نے اسی بات کا بدلہ لیا تھا۔" وہ مزے سے آنکھیں میٹکا کر بولی تھی۔

"تاخن مارنے کی اتنی بڑی سزا؟" انبیہ کو تعجب ہوا۔

"کوئی بڑی سزا نہیں تھی۔ میرا بس چہلاؤ اس گدھے کی بوئیاں کر کے اسی کے ہاتھوں کو کھلا دیتی۔ یا رانیہ تمہیں شاید عجیب لگے لیکن میں خود سے وابستہ لوگوں کے لیے بڑی پوزیشن ہوں۔ کوئی انہیں تکلیف پہنچانے مجھے سے برداشت نہیں ہوتا، خون کھولنے لگتا ہے میرا جب تک بدلہ نہ لے لوں سکون ہی نہیں آتا۔"

"اور یہ شہر کا صاحب کون ہیں؟"

"یہ لوہ اتنے دن سے مجھے جانتی ہو۔ تمہیں ابھی تک یہی نہیں پتا کہ شہر کون ہے؟" ماویٰ نے یوں کہا جیسے بڑے افسوس کی بات ہو۔

"کیا بہت ہی تاریخ ساز شخصیت ہیں۔" انبیہ نے اس کے انداز سے قیاس لگایا۔

"یہی سمجھ لو۔" منگنی کی تاریخ تو اسی نے طے کی تھی۔

"مطلب؟" وہ خاک نہ بھیجی۔

"یار! شہر کا فیاض ماموں کا بیٹا ہے یعنی میرا سابقہ کزن اور حالیہ منگیتر۔" ماویٰ کے لیے یہ اطلاق عام سی انبیہ کے لیے نہیں۔

"تم انکی بھلہ ہو۔ تم نے بتایا ہی نہیں؟"

"اچھا۔ نہیں بتایا؟ حیرانی ہے میں تو سب کو بتا دیتی ہوں۔"

"تو اراٹھ؟" انبیہ نے نوچ پی سے پوچھا۔

"دونوں۔" ماویٰ نے کندھے اچکا دیے۔

"خود کی منگنی ہو چکی ہے اور ماموں جو عمر میں تم سے بڑے ہیں۔ وہ یونہی گھوم رہے ہیں۔" انبیہ نے فطرتاً فیضان کی جانب موڑنا چاہا تھا۔

"فیضان ماما شادی کے لیے ہائی تو بھر میں ان کی منگنی شادی سب ایک ہی دن میں کروادیں گی۔" ماویٰ نے بولی۔

دونوں کچھ دیر خاموشی رہیں انبیہ اگلے سوال کے لیے پر توجہ رہی تھی۔

"ماویٰ!"

"ہوں۔" وہ گردن گھما گھما کر عادتاً ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

"فیضان ماما عمر میں تم سے کتنے بڑے ہوں گے۔" اس نے خود کو لاپرواہا کر کرتے ہوئے پوچھا لیکن دل و جان سے جواب کی منتظر تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ فیضان ماما میرے ماموں ہیں۔ برائے مہربانی انہیں میرا ہی ماموں رہنے دو، زبردستی ان کی بننے کی کوشش نہ کرو۔ دوسری بات یہ کہ مجھے تمہاری ساری چالاکیاں خوب اچھی طرح سے سمجھ آ رہی ہیں۔"

چالاک ہو تو میں بھی کچھ کم نہیں ہوں الحمد للہ۔ یہ جو تم گھما پھرا کر میری عمر معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوئیں تو اس سے باز آ جاؤ۔ دنیا دوسری اوجھ ہو جائے میں تمہیں اپنی اصل عمر کا پتا چلنے نہیں دوں گی اور تیسری اور آخری بات یہ کہ معصوم سی شکل بنا کر تم میرے ماما کے بارے میں کرید کرید کے سوال کیوں پوچھتی رہتی ہو؟ آخر چکر کیا ہے؟"

وہ ایک دم گھوم کر اس کے سامنے آئی اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ انبیہ کے ہاتھوں کے توتے سب اڑ گئے۔ وہ اتنی بری طرح سٹپٹائی کہ زندگی میں کبھی نہ سٹپٹائی ہوگی۔

"کیا۔ کیا کہہ رہی ہو ماویٰ؟"

"ذہنی۔ جو تم سمجھ رہی ہو اور چاہتی ہو کہ میں نہ سمجھوں۔" ماویٰ نے ترنت کہا۔

"تج نہیں کیا کہہ رہی ہو؟ عجیب ہو تم ماویٰ! اس نے پچھا پچھڑانا چاہا لیکن وہ ماویٰ ہی کیا جو اتنے آرام سے جان بخش دے۔"

"عجب نہیں ہوں بے حد ذہین ہوں اور اتنی خوبصورت کہ دس ٹیوب لائٹس لے کر بھی ڈھونڈ لی تو مجھ سے حسین لڑکی نہیں ملے گی۔" ماویٰ نے اتر کر کہا انبیہ کو ہنسی آئی۔

"تمہارے حسن کامیں نے اچھا نہیں ڈالنا خوبصورت لڑکی!"

"اب آگے سے ہو مجھے اندر جانا ہے۔ بت بھوک لگی ہے ناشتہ۔"

"نہیں ہوں گی پہلے مجھے اصل بات بتاؤ۔" ماویٰ نے اوڑھ بٹن سے کہا۔

"ارے کوئی بات ہے ہی نہیں۔ میں نے تو یونہی ایک بات پوچھ لی تھی۔ تم نے پر کا کو اہنا دیا۔"

"تو یہ کوئی معمولی کام ہے؟ صرف لٹلٹل لوگ ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ ورنہ میں تمہیں درجن بھر "پر" لادوں گی۔ بنا کر کھانا کولہ۔" اس نے اطمینان سے بے برکی ہانکی۔

"ماویٰ! انبیہ کو تاؤ ہی آ گیا۔" تم انتہائی کمزوری فسادان اور۔ اور۔۔۔"

"ذہین۔ عقل مند۔" ماویٰ نے جھٹ سے لقمہ دیا۔

"جی نہیں۔" منگنی فسادان اور مکار ہو۔ بات کا بھٹکرنا دیا۔ ہو مجھے تم سے بات ہی نہیں کرنی۔" وہ غصہ کر کے جیسے رستہ تروا کر کھائی۔

"بات بے شک نہ کرو لیکن مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔" جو مجھ سے بات نہ کرنے میں ان کی بھی مدد کر دیتی ہوں۔"

ماویٰ نے کھٹکے ہوئے لہجے میں آواز لگائی تھی۔ انبیہ نے مرکز بھی نہیں دیکھا۔ مبادا وہ اس کے چہرے سے ہی اس "راڈ" کا سراغ پالے جس کا اظہار وہ خواہ اپنے آپ سے بھی کرتے رہتی تھی۔



"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

ٹھیک دو روز بعد تنوٰی نے کینٹین میں بیٹھ کر عجب سے کہا تھا اس کے لہجے سے نا بھر کا تاسف اور بے یقینی چھلکتی تھی۔

یہ ایک ابر آلود دن تھا کچھ دیر پہلے موسلا دھار بارش برس کر دھیمی ہوئی تھی اور اب کن من بوندوں کی صورت زمین کی گودیراب کر رہی تھی۔ اب ایسے غصہ موسم میں کلاس روم میں کون نکلتا۔ نیچے زے اسٹاف روم کی راہ

توی خوف زدہ ہو گئی کیونکہ عبید کی پیش گوئیاں عموماً درست ثابت ہوتی تھیں۔
 ”ہمیں اس کے گھر والوں کو انفارم کرنا چاہیے۔“ توی نے خیال ظاہر کیا۔
 ”ہمارے پاس ثبوت نہیں ہے توی!“ عبید نے رمان سے کہا۔
 ”اور ثبوت کے بغیر وہ لوگ ہماری بات کیوں سنیں گے۔ خواہ مخواہ ہماری بے عرقی ہو جائے گی۔“
 ”مجھے حیرانی ہے اگر یہ ساری باتیں تمہارے انکل کو معلوم ہیں تو وہ عروش کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتے؟“

”اس نے انکل سے پوچھا تھا تو وہ کہنے لگے ہم بھی کسی محسوس ثبوت کی تلاش میں ہیں کیونکہ جو لوگ غلط کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنی آسمانی سے قابو نہیں آتے۔ عروش پر شک سب سے پہلے پھر زرتاشیہ کو ہوا تھا جو ہاشل میں رہتی ہیں۔ عروش کا ہاشل میں مدت آنا جانا تھا تب سے پھر زرتاشیہ اور کچھ اور نیچر زاس کی نگرانی کر رہی ہیں مگر جمال ہے جو عروش اسے پیچھے کوئی ثبوت چھوڑے۔“
 ”مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے اگر وہ بھی عروش سے ڈر کر لینے لگی تو... توی بے حیائی میں زور سے بولی تھی لیکن جملہ پورا ہونے سے پہلے عبید نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”خدا دار! اپنا والیوم ہلکا رکھو۔ سارے زمانے کو بتاؤ گی کیا۔“ اس نے جھنجھلاہٹے ہوئے کہا تھا۔ توی شرمساری ہو کر خاموشی ہو رہی۔

”انکل نے کہا تھا کسی اور کو ان باتوں کی بحث بھی نہ پڑے لیکن میں نے جذباتیت میں تمہیں اور نمو کو بتا دیا۔ متعذر صرف یہی تھا کہ وہ خوف زدہ ہو جائے اور عروش سے دور رہے۔ لیکن اب مجھے لگ رہا ہے مجھ سے تھوڑی سی غلطی ہوئی۔ اتنی جلدی نمو کو ڈر کر والی بات نہیں بتانا چاہیے تھی۔ وہ جا کر عروش کو ضرورتاً سنے گی اور عروش محتاط ہو کر اپنی سرگرمیاں محدود کر دے گی۔ اس طرح تو اس کے خلاف ثبوت ملے گا وہ کالج سے نکالی جائے گی۔ پچھلے چار سال سے مستقل کالج میں رہی ہوئی ہے یقیناً اس کی بیک پر کوئی اسٹوڈنٹ پارٹی ہے۔ عروش کے خلاف ثبوت جمع کرنے کے لیے کوئی اور پتہ چلانا پڑے گا۔“

عبید خود کلائی کے انداز میں بول رہی تھی اور توی ہونفوں کی طرح اسے بولتا سن رہی تھی۔ جب عبید خاموش ہوئی تو اس نے رشک آمیز انداز میں کہا۔

”ماشاء اللہ عبید! تمہارا دل تو کسی جاسوسی فلم کے ڈسٹکٹو (جاسوس) سے بھی زیادہ تیز چلتا ہے۔“
 ”بس جی! اللہ کا کریم ہو ورنہ ہندی کسی قابل کہاں۔“
 عبید نے عاجزی سے کہا اور ایک اور سمو سے کچھ مڑکا لئے لگی۔

الغیر ہڈی دیر سے کتابوں سے سرکھپا رہی تھی مگر جمال ہے جو ایک لفظ بھی سمجھ آ رہا ہو۔
 ”عجب بیزاری سی بیزاری تھی۔“

تھک بار کر اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بیڈ پر بٹنی اور وہیں کتابوں پر سر رکھ کر آدھی ترچھی ہو کر لیٹ گئی اور اسی بات پر غور کرنے لگی جس پر دل و دماغ کی مکمل آمادگی ظاہر ہو رہی تھی۔
 لیکن ہوتا تو اس کے بعد بعض اوقات دل و دماغ کی آمادگی بھی کسی نتیجے پر پہنچنے میں معاون ثابت نہیں ہوتی۔ شاید اسی لیے وہ محکمش کا شکار بھی بلکہ محکمش بھی کیا بھی سوچ کا ایک نقطہ ہی تھا جو اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔

لی۔ اسٹوڈنٹس برآمدوں میں بکھر کر موسم کا لطف لئے گئیں جنہیں وہاں جگہ نہ ملی انہوں نے کینٹین پر قبضہ کر لیا۔ وہ دونوں حسب معمول کوٹے کی میز پر اور کھڑکی کے پہلو میں بیٹھی تھیں جب توی نے کھڑکی سے باہر لڑائیوں کی صورت میں برسی بوندوں کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔
 ”ظاہر ہے میری بات پر تمہیں یقین آئے گا بھی کیسے؟“ عبید نے تندی سے پلیٹ میں رکھے سمو سے کچھ مڑکا لئے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”خود سمو کھا کر دیکھو پھر میری بات پر یقین آئے گا کہ آج سموں میں آلو تو ڈالے ہی نہیں ہیں غصہ کرنے نے اس کینٹین کا معیار دن بدن گرنا چاہا ہے۔“ عبید نے ناک چڑھا کر کہا تھا توی کی بے یقینی ”ناست“ منجھو پر چھوٹے ٹھنڈا پانی اگر اس نے محسوس کر عبید کو لکھا۔
 ”میں عروش کی بات کر رہی تھی۔“

”اچھا۔“ اس نے قدرے عجیب کے ساتھ کنا پھر لکھا سا قہقہہ لگایا۔
 ”میں سمجھی سمو سے کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ پھر پلیٹ پر جھکی۔
 ”عبید کی پٹی! اس قدر پیٹو ہو تم۔“ توی نے پلیٹ اٹھا کر اس کی پیٹھ سے دھڑکی۔
 ”میری پلیٹ واپس کرو توی!“ عبید نے رو ہانسی ہو کر کہا۔
 ”خود تو تم پڑیا جتنا کھاتی ہو اور چاہتی ہو کوئی دوسرا بھی نہ کھائے۔“

”لیکن میں بتا دوں تم سے دوستی اپنی جگہ اور سمو سے میرا عشق اپنی جگہ۔ کوئی میرے اور سمو سے درمیان آئے میں قطعاً برداشت نہیں کروں گی۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہو گا کہ میری سمو سے والی پلیٹ مجھے واپس کرو ڈور نہ ابھی اس کینٹین میں لاشیں بچھ جائیں گی۔“ اچانک اس نے دھمکاتے ہوئے کہا۔
 توی نے اس کی غیر سنجیدگی پر محسوس کر دیکھا پھر پلیٹ اس کے سامنے بچھ دی۔
 ”ایک دن کھا لکھا کر پھٹ جاؤ گی عبید!“

”تمہارے منہ میں خاک۔“ عبید نے خوش دلی سے کہا ”پلیٹ سامنے کی اور مزے سے کھانے لگی۔“
 ”ایک سمو کھا کر کچھ حواس ٹھکانے آئے ہیں۔ ہاں اب بولو۔ کس بات پر یقین نہیں آ رہا۔“ اس نے فخریہ کلائی کرتے ہوئے پوچھا۔

”عروش والی بات پر۔“ یہی کہ وہ نشہ آور چیزیں فروخت کرتی ہے یا ر! اس سے خریدنا کون ہو گا؟“ توی۔ معصومیت سے پوچھا۔ ظاہر ہے اس بار غصہ کرنے کی باری عبید کی تھی۔
 ”توی! اس قدر عقل مندانہ سوال تمہارے ذہن میں آتے کہاں سے ہیں؟ ظاہر ہے کالج کی لڑکیاں خریدنا ہوں گی۔“ اس نے آواز دیا کر کہا۔
 ”سب؟“ ایک اور سوال آیا۔

”سب کیوں خریدیں گی! صرف وہ خریدتی ہیں جو عقل سے پیداں ناعاقبت اندیش نانا بچار نانا لائق لڑکیاں ہوں ہیں۔ وہی ایسی چیزیں لیتی ہیں۔ اور ہاں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ پیسہ ہوتا ہے وہ بھی خریدتی ہیں۔“
 ”عبید! توی نے نظر سے کہا۔ تمہارے خیال میں نمو بھی یہ سب لیتی ہو گی؟“

عبید نمو کے نام پر سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے چند لمبے سوچا۔ ”ابھی تک تو نہیں۔ میرا خیال ہے وہ کبھی نہیں فیصد پر یقین نہیں ہوں۔ لیکن جس رفتار سے وہ عروش کے قریب ہو رہی ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب وہ ڈر استعمال کرنے لگے گی۔“ اس نے پیش گوئی کی۔

دراصل ہر نظر کا ایک ظلم ہوتا ہے۔
اور ہر ظلم ایک نئی دنیا کی دریافت کی کنجی۔
کنجی دل کی بھی ہوتی ہے۔

لیکن دل کا دل نہیں ہوتا جو بیٹہ کر سو دنیا کا فیصلہ کرے۔ دل غم ہوتا تو دل ہوتا سوچے سمجھے اس دوا کی پر کار
میں قدم نہ ہونے کی صداقت نہ کرنا جس کی دینے تو جی کی ننگریوں سے مل کر مٹی ہے۔
"توجہ؟" وہ کھٹکی پھر سر ہاتھ ماری اٹھ بیٹھی۔

"انہوں نے مجھ پر کب تو جی دھو میں اتنا کچھ سوچ رہی ہوں۔"
یا اللہ وہ جھنجھلا کر بیٹھ سے اترتی اور سر سے ہر سوچ بھٹکتی دھپندہ کندھوں پر ڈال کر کمرے سے باہر آگئی۔
(وہ نہیں جانتی تھی توجہ کی حیثیت مضبوط سہی لیکن محبت ہمیشہ بے خبری میں نقب لگاتی ہے انجانے میں دوا
کرتی ہے۔ محبت محبت سہی کمرے کی محبت)

اس کا رخ دلی اور دیر کے کمرے کی طرف تھا۔ اسی لمحہ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جو اس کے ذہن سے پہلے
گم کی طرح چھپے ان عجیب و غریب خیالات کو نکال دے۔

لیکری سے گزرتے ہوئے اس نے سرسری سی نگاہ نیچے لاؤنج میں دلی ڈانیاں حسن کے ساتھ فیضان ممدی
لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ سینٹیل ٹیبل پر فائزر رکھی ہوئی تھیں ان کے گفتگو کی آواز دلی کی
جین جھانٹ کی صورت میں اس کی سماعت سے نکل رہی تھی اور لگتا تھا بڑی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ وہ ایک فاصلے
اٹھاتے ایک رکھتے گویا بری طرح غرق تھے۔

انیس بے ارادہ ہی گریں پر گدیاں اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔
"آخر ایسا کیا ہے ان میں کہ جس مسئلے انہی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ نہ صرف سوچ رہی ہوں بلکہ
ہی دل میں کہیں اس خدشے کا شکار بھی ہو گئی ہوں کہ جو میں محسوس کر رہی ہوں وہ محبت تو نہیں۔" پھر اس نے سر
جھٹکا۔

"محبت ایسے ہوتی ہے۔ کسی کے لیے پسندیدگی کے جذبات ہونے کا مطلب ہے ہرگز نہیں ہو گا کہ ان فیضان کو
محبت کا نام دے دیا جائے۔" بالآخر وہ نتیجہ پر پہنچی تھی اسی وقت فیضان نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا انیس
بے حیا بی میں جانے کب سے انہیں دیکھ رہی تھی بیٹھا گروہاں سے ہٹ گئی۔

فیضان نے لاشعوری طور پر سر اٹھایا تھا لیکن اسے دیکھ کر مسکرانے کے لیے پر تو دل ہی رہے تھے کہ وہ ہر
گئی۔ فیضان متعجب ہوئے اور وہ خفیف سے ہو کر فائزر پر جھک گئے۔

انیس بڑھکھلا ہٹ میں دھاڑے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
"دلی کیا کر رہے ہو؟" دلی اپنی جھونک میں تھا بری طرح ڈر گیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے انو؟"
"مجھے؟ کچھ نہیں۔"

"پھر اس طرح کمرے میں کیوں آئی ہو؟" وہ جھنجھلایا۔
"اے۔" انیس نے بل بھر کو سوچا بھر دانت نکال کر بولی۔

"میں تمہیں سر پر اترنا چاہ رہی تھی۔"
"وہ۔" اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔

"کیا اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔"

"مگر اتر؟" دلی اور جھنجھلایا۔

"میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔" انیس نے جلدی سے کہا پھر پوچھنے لگی۔ "کیا کر رہے ہو دلی؟ چلو لان میں چل کر
بیٹہ مشن چلیے ہیں۔"

"پھر کبھی سہی۔ ابھی میں بڑی ہوں۔" دلی نے سر پھیرتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا کر رہے ہو؟" وہ اندر آگئی دلی نے اسٹیشن سیٹ کے بیٹھا تھا۔

"تیم کھیل رہا ہوں۔" پتا ہے انو میں نے Highest سکور بنایا ہے اس نے بہت خوش ہو کر اطلاع دی۔

"میں کبھی کھیلوں گی۔" وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئی اور دو سر ایسٹ کیٹ بیل سیٹ کرنے لگی۔

"کیا کر رہی ہو۔ میری گیم رنچ میں غریب کر اؤ گی۔" دلی نے غصے سے کہا۔ "بعد میں کھیل لینا ابھی مجھے کھیلنے
دے۔"

"میں بہت بورت محسوس کر رہی ہوں دلی ایلر کھیلنے دو ناں۔"

ناچار دلی کو اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ کچھ دیر انیس کو گیم کے رولر سمجھا تا رہا پھر جب تیم شروع ہوا تو دلی نے گروہ
موڈ کر انیس کو دیکھا پھر جھنجھکتے ہوئے کہنے لگا۔

"انو ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں۔" وہ بری طرح گیم میں غرق تھی۔

"تمہیں نہیں لگتا ڈیڈی بدل گئے ہیں؟" اس نے رُسوچ انداز میں کہا تھا۔ "وہ پہلے ایسے غصہ نہیں کرتے تھے
بجواب کرتے ہیں ہر وقت غصے میں رہنے لگے ہیں مجھے کتنی مرتبہ ڈانٹا بھی ہے۔ آئی فوننگ ان کا می سے بھی
جھڑا ہوا ہے۔"

"اے۔" انیس بری طرح چونکی اس کے ہاتھ ریموٹ کنٹرول پر دست پڑ گئے۔
"میں ایسا کیوں لگ رہا ہوں؟"

"بنا تو رہا ہوں انہوں نے مجھے پورے پانچ بار مت غصے سے ڈانٹا ہے پھر می اور ڈیڈی ایک دوسرے سے بات
بھی نہیں کرتے۔ تم نے لوٹ نہیں کیا؟"

وہ الجھا الجھا سا بول رہا تھا۔ انیس کو یوں عجیب سا احساس دامن گیر ہوا محسوس تو وہ بھی کر رہی تھی کہ می ڈیڈی
ایک دوسرے سے پھر سے کھینچنے کھینچنے رہے لگے ہیں لیکن وہ تو اکثر ہی ان کے رویوں کی کھنڈھٹ محسوس کرتی
رہتی تھی۔ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ البتہ دلی کا اس سنجیدگی سے محسوس کر لینا ضروری بات تھی۔
"کیوں تو کوئی بات نہیں ہے دلی تمہیں پوچھنی محسوس ہوا ہو گا۔"

"میں نے دلی کا ذہن بدلنے کی غرض سے لا پرواہی سے کہا تھا۔"

"تمہیں کیسے پتا؟ تم نے می ڈیڈی سے پوچھا ہے۔"

"انیس اس سوال پر بل بھر کے لیے گڑبڑا گئی۔

"میں۔" پوچھا تو نہیں ہے۔" پھر فوراً بولی۔

"دلی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ڈیڈی ضرور اپنے آپس کے کسی کام میں الجھے ہوں گے جیسی تمہیں ڈانٹ دیا۔
ویسے بھی وہ آج کل اپنے بزنس کے سلسلے میں اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ کھانے پینے کا بھی انہیں ہوش نہیں ہے۔"

بطور خاص غصہ کرنے کی فرصت کہاں سے نکال سکتے ہیں۔ پھر مئی اور ڈیڑی کا جھگڑا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لوگ ہیں جنہیں اتنے بھی نہیں بھگڑا کرتے ہوئے دکھائے۔
 "جھگڑا کرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن۔ کبھی پیار سے بات کرتے بھی نہیں دیکھا۔" وہ الجھا الجھا سا بول رہا تھا جیسے خود بھی سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس کے ذہن میں ملتی ہوئی ۴ جھگڑا کیا ہے۔
 "لو جھاتی تو مئی ڈیڑی پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ مئی ڈیڑی دیکھتا بھی کم کروے۔" ہا۔۔۔
 اچانک ولید نے واٹس روم سے نکلے ہوئے کہا تھا وہ نما کے نکلا تھا اور ٹائل سے اپنا سر گرگڑتے ہوئے دلی پر فہر رہا تھا۔
 "پیارے بات کرتے نہیں دیکھا۔ یہ اتنی مزاحیہ بات ہے کہ مجھے لگ رہا ہے۔ فہر فہر کر میرا پیٹ جھٹ جائے گا۔ موت آوے تمہارا کیا خیال ہے ہمارے مئی ڈیڑی کو کبھی فلمی مئی ڈیڑی کی طرح روماس جھاڑتے نظر آتا چاہیے؟" ہا۔۔۔

"نہیں یہ نہیں کہا۔" ولی نے جھجھکی سے کہا۔
 "پھر کیا فرما رہے ہیں آپ محترم کو صاحب پلیرز نیٹ ات آگین۔ ویسے دیکھ لو الو میں اس کو موٹی عقل کہہ ہوں تو غلط نہیں کہتا۔ شوق ملاحظہ فرماؤ جناب کے۔"
 ولید بلی پو پور سیلٹ۔ "انہی نے جھنجھاکر کہا تھا۔ ولی نے ریویوٹ کنٹریول کارپٹ پر بیچہ کا اور صوفے کے پاس جا کر لیٹ کر بیٹھنے لگا۔
 "تم لوگ مجھے بچہ سمجھتے ہو مگر میں نہ تو بچہ ہوں نہ ہی بیوقوف کہ تم لوگ مجھے ایسی باتوں سے ٹرخاؤ۔ میں تو لوگوں سے دیوار بات ہی نہیں کر رہا ہوں۔ کسی شخص مند کو دھوڑوں گاہات کرنے کے لیے۔" وہ فہر سے باہر نکل گیا۔ ولید اور انہی کے آواز سے دیکھ رہے تھے لیکن ولی نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔
 "بیٹا۔۔۔ اب اس کو کوئی ہم عقل مند آدمی ہی نہیں لیتے۔ امیرنگ۔"
 "تمہیں کیا ضرورت تھی ولی سے ایسی باتیں کرنے کی؟" انہی نے جھنجھاکتے ہوئے کہا۔
 "میں تو صرف اسے بھلائی کی کوشش کر رہا تھا۔" اس نے وارڈروب سے ایک شرٹ نکالتے ہوئے کہا۔
 "اس طرح...؟"
 "پھر کس طرح؟" ولید نے انہی سے پوچھا۔ انہی نے سر جھٹکا اور مگر اسٹافس بھرتے ہوئے اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن حقیقتاً "اس کا دل۔ تم سے بری طرح اچاٹ ہو چکا تھا۔"



ماوی انہی ہی دھن میں گمن چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ ولی غلیل سے چھوٹے پھری طرح باہر نکلا۔ ماوی نے بے ساختہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر حقیقتاً "اس کے بریکس لگوائے تھے۔ ورنہ زبردست مگر ہوتا تھی۔"
 "مانی گاؤ۔ اس رفتار سے تو یوں اسٹاپ ٹرین بھی نہیں چلتی ہوگی جس رفتار سے تم چل رہے ہو؟ دھیان سے دلی! بدھیانی میں نہیں کوئٹہ نہ پہنچ جانا۔"
 اس کے ہلکے پھلکے مذاق پر بھی ولی کے تاثرات نہ بدلے۔
 "سامنے سے ہو تو میں جا رہا ہوں۔" اس نے ناراضی سے کہا تھا۔
 "جا کہاں رہے ہو؟" اس نے تن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

خود بخشی کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے جھنجھاکر کہا تھا۔
 "اچھا۔ اچھا۔ میں کبھی گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" ماوی نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا جیسے گھر چھوڑنا خود بخشی سے بڑی بات ہو۔
 ولی کا غصہ اور بھی بڑھ گیا وہ ایک طرف سے ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ ماوی پھر جلدی سے سامنے آئی۔
 "خود بخشی کرنے کی ایسی بھی کیا جلدی؟ پھر کبھی کر لیتا؟" اس نے بھی میرے ساتھ چل کر گرم کھیلو۔
 "میرا موڈ نہیں ہے۔" وہ بے اعتنائی سے بولا۔
 "اچھا سا ٹیکنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے ایک اور حربہ آزمایا۔
 "ہو ہو۔" ولی نے لڑکیوں کے ساتھ نہیں کھیلنا۔ ولی نے آٹا کر کہا تھا۔ ماوی کو بڑے زور کی ہنسی آئی جسے اس نے مشکل روکا۔
 "کیوں؟"

"کیونکہ لڑکیاں بڑی ہوتی ہیں۔" ولی نے گردن اٹھا کر کہا تھا۔ "ہار کر روئے لگتی ہیں۔"
 "میں نہیں روؤں گی۔" ماوی نے جلدی سے کہا۔ "بلکہ شرط لگاتے ہیں اگر میں ہار گئی تو تمہیں ایک آنس کریم کھلاؤں گی اور جیت ہی تو دو کھلاؤں گی۔"
 ولی سوچ میں پڑ گیا پھر اسی طرح پوچھنے لگا۔
 "تمہارے پاس سا نیگل ہے؟"
 "یہ سا نیگل پڑی تو ہیں۔" اس نے ڈرائیوے کے ایک سائیڈ پر کھڑی اسپورٹس سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 "ان میں سے ایک میری ہے لیکن وہ سری ولید کی ہے۔ وہ اپنی سائیکل لینے پر بعد میں بھگڑا کرے گا۔" ولی نے اسے خبردار کرنا چاہا۔
 "ارے ولید کی ایسی کی تھی۔ اسے میں دیکھ چکی ہوں گی تم بس پوزیشن سنبھالو۔" ماوی نے لاہر والی سے کہا لیکن اس نے کل کے سا نیگل کی طرف جاتی ٹھہرنے کی آواز سنائی دینے لگی وہ انیسویں کبا ہر کھڑی اسے پکار رہی تھیں۔
 "ماوی ولی سے انتظار کرنے کا کہہ کر ان کی طرف آئی۔
 "شہوز کا فون ہے۔" وہ کارڈ لیس پکڑے کھڑی تھیں۔ ماوی نے فون جلدی سے کان سے لگا لیا۔
 "ہیلو شہوز؟"
 "شکر ہے تمہاری آواز ابھی سننے کو ملی۔" شہوز نے چھوٹے ہی کسی قدر ناراضی سے کہا تھا۔
 "تمہیں میری آواز سننے کا اتنا شوق ہے تو میں ہر روز تمہیں کال کر سکتی ہوں۔" ماوی نے حسب جاوت، فہر کر کہا تھا۔

"بیٹا تم ہر بار کبھی ہو مگر مجال ہے جو کبھی خود کال کی ہو میری کال ہی انیڈ کر لو تو بڑی بات ہوتی ہے۔"
 "اب اس بار بھی۔" شہوز نے کچھ زیادہ ہی خفا لگ رہا تھا۔
 "تمہیں ذرا بھی احساس ہے کل سارا دن میں تمہارے لیے کتنا فکر مند رہا ہوں۔ سیل فون پر کال کرو تو تم انیڈ کرنے کی زحمت نہیں کرتیں لیڈ لائن پر کرنے کا فائدہ ہی نہیں ہوگا۔ سارا دن تو تم کھر سے باہر رہتی ہو۔"
 "ارے میں بیٹا ہی بھول گئی میرا سیل فون کل لا میری می میں رہ گیا تھا۔ اگر تم کسی کے سیل پر کال کرتے تو مجھ سے بات ہو سکتی تھی۔"
 "تم سے سیل سنبھال نہیں جاتا تو لیتی ہی کیوں ہو؟" شہوز نے گہری سانس بھر کر اسے لٹا دیا۔ "اب یہاں مت

خریدنا، جد ہوتی ہے لاری والی اور غیر ذمہ داری کی۔“
 ”تم فکر مت کرو شہوڑا شادی کے بعد میں سیل فون پر تمہارا خرچہ نہیں کروایا کروں گی۔“ ماوی نے جلدی سے کہا تھا۔
 ”جائے دو مجھے اچھے خواب نہ دکھاؤ“ اچھی طرح اندازہ ہے شادی کے بعد تم میری جیب کتنی ہلکی رکھنے والی ہو۔“
 ”موسوٹ آف یو شہوڑا تم مجھے کتنی اچھی طرح سمجھتے ہو۔“ وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی تھی۔
 ”کاش میں بھی تمہارے ہارے میں مل سکتا۔“
 ”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میرا رتھ ڈے چھ روز پہلے گزر چکا اور اس سال بھی تم کو مجھے خوش کرنا یاد نہیں رہا۔“
 ماوی نے بے ساختہ ہاتھوں سے زبان دیا تے ہوئے سر پر ہاتھ مارا تھا۔ تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں اس کی یادداشت بے حد کمزور تھی۔ وہ جتنا ایسے معاملات میں لاپرواہی شہوڑا اتنا ہی ان باتوں کو اہم سمجھتا تھا۔ وہ ہر سال عید کرتی کہ شہوڑا کو سب سے پہلے خوش کرے گی اور ہر سال شہوڑا کو ہی اسے یاد کروانا پڑتا۔
 ”اب خاموش رہ کر کوئی اچھا سا ماٹا ڈھونڈ رہی ہو؟“
 ”بالکل نہیں۔“ ماوی نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔ ”میں تو سوچ رہی تھی چھ دن اتنے زیادہ تو نہیں ہیں کہ میں اس وقت تک سرسوں؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ شہوڑا نے تضحیک سے کہہ دیا تھا۔
 ”جائے دو شہوڑا اب بڑھے ہو جاؤ۔“
 اس نے جیسی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایسی بڑی بات نہیں ہے کہ تم بچوں کی طرح خفا ہو۔“
 ”تم لوگوں کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ لوگ کسی بات پر خفا ہوتے ہیں تو وہ بچوں جیسی بات ہوتی ہے؟ مجھے ایک بات بتاؤ میں تو آج تک تم سے متعلق کوئی بات نہیں بھولا تم میرا رتھ ڈے یاد نہیں رکھ سکتیں؟ اگر کبھی میں بھول جاؤں تو؟“
 ”بھول کر بھی ایسی غلطی مت کرنا میں تمہارا سر بھاڑ دوں گی۔“ اس نے غرے سے کہا تھا۔
 ”دیکھا۔ میں نے تو تمہارا سر نہیں چھاڑا۔ یہاں تک کوئی لڑکا کسی لڑکی کا سر نہیں چھاڑتا، لیکن اگر یہی غلطی لڑکے سے ہو تو لڑکی اسے کبھی نہیں بخشتی۔“
 ”اے تو ٹھیک ہے تاہم لڑکیوں کا حق تو ہے کہ تم لڑکے ان کے ناز اٹھاؤ۔“
 ”تم لڑکیاں کمال ہوتی ہو۔“ اس نے سلگ کر کہا تھا۔ ”حق و فراغ انش بھی خود ہی ملے کر لیتی ہو۔ کسی دوسرے کے مشورے کے بغیر۔“
 ”لگتا ہے لڑکیوں پر آج کل بڑی ریسرچ ہو رہی ہے۔“ اس نے مزے سے چڑایا۔
 ”اے ہی تو میں ایک مصیبت کو سمجھ نہیں پایا۔ بہت ساری لڑکیوں پر ریسرچ کرنے کی کوشش میں پاگل ہوا۔“

”جنت کی عمر اس وقت ساڑھے نو برس تھی اور دین محمد نے اسے تقریباً پچھلی کا چھالہ بنا رکھا تھا۔ دین محمد کی آنکھوں پر اس کی محبت نے گویا نی پانچھ رکھی تھی اور عقل پر دھول جھونک دی تھی اور یہ صورت حال اس عورت کے لیے بڑی تشویش ناک تھی جو دین محمد کی ماں تھی اور جس کی زندگی ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہو رہی تھی۔“
 ”جب بھی دین محمد کو سبے جا طرف داری کرتے دیکھتی اسے بے ساختہ زہر واد آجاتی اور اس کی آنکھیں بیگ جاتیں۔“
 ”اگرچہ دین محمد کے خوف سے وہ اپنی پریشانیوں کا ذکر کسی سے نہیں کرتی تھی، لیکن دین محمد کی جنت کے معاملے اختیار کی ہوئی غلط روش برادری میں کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ شاید اسی لیے دین محمد کی خالہ نے اسے مشورہ دیا تھا۔“
 ”دین محمد کو ٹھیک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اس کی شادی کر دے۔“ اس کی بہن نے کہا تھا۔
 ”وہاں تک نہیں۔“ دین محمد کی ماں نے پریشانی سے کہا تھا۔
 ”کھانا ہے جنت پہ سوئی ماں نہیں لاؤں گا۔“

”وہ شہوڑا کو چڑا چکا رہی تھی، لیکن اس بات پر خودی چڑ گئی۔“
 ”مجھے مصیبت کہہ رہے ہو؟“

"جنت کی محبت نے دین محمد کو بالکل ہی باؤلا کر دیا ہے، میری ماں کیا! جنت کو بڑے پیار سے دیکھ رہی ہے کہ وہاں پر کون سا جگہ ہے۔ وہاں جا کر ساری خوشیوں میں حصہ ہو جاتی ہیں۔ مزار پر جنت کی چادر چھوٹا جنت کے ہاتھوں اور دروازے سے اٹھا کر تیرک جنت کو کھانا اور دین محمد کو بھی کھانا۔ پیر جی کا ہاتھ جس کے سر پر چاہے ان کے سامنے میں جو بندہ آجائے پھر مجال نہیں کہ عقل کے دروازے نہ کھلیں۔" "میں نے دین محمد کی ماں کو ایک نئی راہ دکھائی۔ دروازوں اور مزاروں پر چلنے کی وہ خود بھی شوقین تھی۔ بڑے پیار سے تو اسے بے حد عقیدت تھی، کیونکہ ان کا چھوٹا سب حضرت عبدالقادر جیلانی سے ملتا تھا۔ چنانچہ اس بات میں کتنی صداقت تھی، دین محمد کی ماں نے بھی اس پر غور نہیں کیا تھا، کیونکہ اس کی عمر کے افراد کا ماننا تھا ایسی باتوں پر غور کرنا سوال اٹھانا گناہ کے زمرے میں آتا ہے اس لیے ان کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ لیکن دین محمد کو مزاروں پر جانا پسند نہیں تھا، اسی لیے وہ اس سے اجازت لیے بغیر جنت کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ لیکن اب گھر کی طرف جاتے ہوئے ایک دم دین محمد کی کھلی کا خیال ستانے لگا تھا۔

"میں جنت! جنت چلتے چلتے گردن موڑ کر سواہیہ نظروں سے داوی کو دیکھنے لگی۔
"دین محمد سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہم مزار پر گئے تھے اور نہ ہی یہ بتانا کہ میں نے تجھے انٹر لے کر کھانا تھا۔" اس کی مائید پر جنت نے سعادت مندی سے سر ہلادیا۔ گھر اب کچھ ہی دور رہا تھا اور پھاٹن کی ہوا گاؤں کی گلیوں میں آواز دے گھوم رہی تھی۔ وہ دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو آگن میں لگے درخت کے تے ہوئے وہاں وہاں اڑ رہے تھے۔ دین محمد کی ماں نے ملازمہ کو بری طرح جھڑکا، پھر پانی پلانے کے بعد آگن صاف کرنے کا کام دے کر اپنے کمرے میں آئی۔ بڑے پیار سے کادریاں ساتھ والے گاؤں کے آخر میں تھا اور ساتھ والے گاؤں تین کو دور تھا۔ دین محمد کی ماں نے مزار تک جانے کے لیے کبھی کوئی سواری استعمال نہیں کی تھی۔ ہمیشہ پیدل آتی تھی۔ لیکن اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی پیدل آنے جانے کی مشقت نے اس کے بوڑھے بدن کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ وہ دو تین بیویوں والے پنک پر چڑھ کر اپنے پیروں سے سلائے لگی، سارا جسم بری طرح تھک چکا تھا وہ ذرا سستائے کی غرض سے لیٹ گئی۔ یہاں تک کہ اس کا بوڑھا وجود چند من میں ڈوب گیا۔ سانس میں پھر وہ کتنی دیر سو رہی، لیکن جب دیکھا کہ اس کی آنکھ کھلی تو آگن سے شام کے رنگ کسی نے چراگروہاں سیاسی کی دوات الٹ دی تھی۔

"اٹھ اٹھ! معا" اس نے دین محمد کی آواز سنی۔ وہ پنک کے دائیں جانب بامنتی کی طرف کھڑا کہہ رہا تھا۔ دین محمد کی ماں کو ایک دم احساس ہوا کہ اس کی آنکھ میں دین محمد کی آواز سے ہی کھلی تھی۔
"کیا بات ہے دین محمد!"
"اماں! تو اٹھ کر اپنا سامان باندھ لے، میں تجھے باجی زیدہ کے گھر چھوڑتا ہوں۔"
"کیا کہہ رہا ہے دین محمد!" اس کی ماں نے نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔ دین محمد بے حد سنجیدہ کھائی رہے تھا۔
"تو اپنا سامان سمیٹ لے اماں! اب سے تجھے باجی زیدہ کے گھر ہی رہنا پڑے گا۔"
"کیا بول رہا ہے دین محمد! تو ہوش میں تو ہے؟ میں بیٹی کے گھر جا کر رہتی کیا اچھی لگوں گی۔" اسے دین محمد بات سن کر رعب ہوا تھا۔ "اچھی لگے کہ بری لگے، لیکن اب تو میرے گھر میں نہیں رہ سکتی میری جنت کے دیکھے ہیں کیسے زخمی ہو گئے ہیں۔ تجھے کیا ضرورت تھی اسے مزار پر لے جانے کی۔" دین محمد نے تقریباً غور سے ہونے لگا تھا۔ اس کی ماں کا بکا رہا مگر بے ساختہ اس نے جنت کی طرف دیکھا جو دروازے کے قریب کھڑی سارا کارروائی دیکھ رہی تھی۔

"وہیں میں تو..."
"میں نے اسے نظر کھایا، کیا میری بیٹی فقیر کی اولاد ہے جو لوگوں کا پانا ہوا انگر کھائے میں اپنی بیٹی کو سونے کا نوالہ کھانا ہوں اور تو... آج یہ کیا ہے میری بیٹی کے ساتھ نکل کچھ اور کرے گی۔ بس اماں بے دست ہوا کہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی باجی زیدہ کے گھر میں رہے گی تو شاید بیٹھا دوڑتی کی قدر آجائے، اس نے سفاکی سے کہا تھا۔
"میں دین محمد! اچھے گھر سے نہ نکال۔ اس عمر میں بیٹی کے گھر جا کر رہوں۔ میرا پرہیز خوار ہو جائے گا۔" دین محمد کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔ دین محمد اس کے رونے اور منت پر یک دم خاموش ہو گیا تھا، لیکن اس کے چہرے سے غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔
"ابو میری شہزادیوں جی بیٹی کو تکلیف پہنچائے میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا اماں! اتنے لیے آخری موقع ہے اگلی بار تو نے جنت کو تکلیف پہنچائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا یا رو کھانا۔" اس نے اگلی اٹھا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا جنت نے داوی کو سر جھکائے دیکھا، پھر خود بھی باپ کے پیچھے لگی۔ دین محمد کی ماں کی ہنسنی ہوئی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور چہرے کی خبریوں میں پھیل رہے تھے۔ اس کا بیٹا پہلے بھی اسے بات لیتا تھا، اکثر اسے کھری کھری سناتا رہتا تھا، لیکن آج تو اس نے سارا لحاظ ختم کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا اپنی بیٹی کی خاطر اپنی ماں کو گھر سے نکلنے کی دھمکی دے گیا تھا۔ ماں کا چھٹکا ہوا سر اور بھی جھٹک گیا تھا، لیکن جنت کا سر ہلند ہو گیا تھا، شاید نہیں جنت کا صرف سر ہی بند نہیں ہوا تھا وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ بند ہو گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے نشن پر نہیں رہنے دیا تھا، اپنے ہاتھ سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا تھا۔ آسمان جو اتنا بلند ہے کہ وہاں سے دنیا کی ہر مخلوق بچوں دیکھائی دینے لگتی ہے۔

ولید شام ڈھلے والی آواز اس کا موزوں خوش گوار ہو رہا تھا، وہ کسی اچھے سے مکان کی دھن سناتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن بیوی ملاؤں میں انبیہ کو دیکھتے ہی اسے وہ جھٹکوا د آئی جو ان تینوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ولید نے چند لمحے سوچا پھر اس طرف آگیا جہاں وہ موجود تھی۔ اس نے دونوں پر صوفے پر رکھے ہوئے تھے اور سرگرمی کے سمارے کھڑے ہاتھ میں گرا رکھا تھا۔ اس کی نظریں بیوی اسکرین پر تھیں، لیکن دھیان کہیں اور تھا۔
ولید خاموشی سے جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور بیوی دیکھنے لگا۔ انبیہ اس کے آنے پر چونکی، اس نے گردن موڑ کر ولید کو دیکھا، پھر نظریں بیوی پر جمادیں۔
ولید کچھ دیر بالکل خاموشی سے بیوی دیکھا رہا، پھر اسے خلیاں ہونے لگیں، بیوی پر افریقہ کے جنگلات میں بیانی جیسے وال ایک باب چھپکے کے بارے میں ڈاکٹر بنی دکھائی جا رہی تھی اور ولید کو چھپکوں سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ جب بھی اسے انبیہ کو تنگ کرنا ہوتا تھا وہ کہیں سے ایک مری ہوئی چھپک لے آتا تھا اس کے بعد انبیہ اس کے آگے اور ولید پیچھے پیچھے ہوتا تھا۔
اس نے کن آنکھوں سے انبیہ کو دیکھا، وہ بے وقوفی کی حد تک سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ ولید نے صوفے پر ان دونوں کے درمیان رکھا، مٹ اٹھا کر جمیل بدل دیا۔
"کیا ہے ولید! میں دیکھ رہی ہوں۔"
"تو کونسا دھنگ کی چیز دیکھ رہی ہو۔" اس نے اسپورٹس جمیل میٹ کرتے ہوئے کہا۔
"میں خود دیکھ رہی ہوں وہ بیوی دھنگ کی چیز ہے۔" انبیہ نے اوٹیل پن سے کہا۔ حالانکہ جانتی تھی ولید کے

سانے اس کی ایک نہیں چلی۔ پھر بھی۔۔۔

”چچیکلیوں کی ڈاکو نڈی دیکھ کر کیا کوئی؟“ اچھا تم نے کبھی چچیکلیوں کی برائی کھائی ہے؟ ”یک دم اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا تو انہیں اسے بری طرح گھورا۔
 ”اس طرح گھورنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ نہیں کھائی؟ اچھا کا کدوچ کا ڈیزرٹ تو ضرور کھایا ہوگا۔ اور آلو کے پائے کا ساں چکھا ہے؟“

انہیں کادل بری طرح ستلا گیا اس نے ناک چڑھا کر کشن اسے کھینچ مارا۔
 ”ایسی گندی چیزیں تم کھاؤ۔ آرخ۔ گندے۔“ ولید ہنسنے لگا۔
 ”ہیام سن کر اتنا برا لگ رہا ہے، کبھی کھانوی ڈالیا ہوگا؟“
 ”تم کھاؤ اپنی من پسند چیزیں۔“ اس نے جمل کر کہا۔
 ”مٹی معصوم شکل والی چچیکلیوں کو دیکھ تو مت پیار سے دیکھ رہی تھی، کھانے کی بات پر کیا ہوا؟“ ولید نے مزہ سے کہا۔

”ولی سے ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے غضب ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
 ”میں نے تو اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی، چچیکلی برائی اور کا کدوچ ڈیزرٹ کامینٹو“ تو پہلی بار تمہیں سن رہا ہے۔“ اس نے بن کر کہا۔
 انہیں غصے سے اٹھ کر جانے لگی تو اس نے فوراً ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھالیا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔
 ”ولی بے کہاں؟“
 ”بے گھر ہے میں۔ موڈ آف کر کے بیٹھا ہے۔ تمہیں اس سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ وہ پھر بولے۔
 ”یار ایش اس کا دھیان دینا رہا تھا۔“ ولید نے معافی پیش کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
 ”اس طرح دھیان دینا جاتا ہے؟“ وہ بھی بھٹائی۔
 ”تو مجھے کیا پتا تھا وہ ہرٹ ہو جائے گا۔“ ولید نے لاچارگی اور کسی قدر ناراضی سے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے رُسوچ انداز میں کہا۔

”اس طرح تو مت مسئلہ ہوگا ولید! ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔“ ولی بہت چھوٹا ہے مٹی اور ڈنڈی کے درمیان کو لڈو اور والی چویشن ہے اس کا بہت برا اثر ہو سکتا ہے ولی کے ذہن پر اس کے لمبے سے ریٹانی جھٹک رہی تھی۔
 ”تم فکر نہ کرو میں اسے اپنے طریقے سے سمجھاؤں گا۔“ ولید نے کہا۔ یہ بھی ایک دلچسپ پہلو تھا کہ جتنی دونوں میں لڑائی ہوتی تھی تبیں بھی جتنی ہی اتنی ہی تھی۔
 ”لیکن مٹی۔ ڈنڈی؟“
 ”ان دونوں کو بس تم رہنے دو۔“ ولید نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔ ”میرا نہیں خیال کہ ہماری مزہ کو شش سے ان کے ریمیشن شب میں بہتری آسکتی ہے۔ وہ دونوں ہمیشہ سے ایسے ہی تھے اور عیش ایسے ہی رہے گے۔ مجھے نہیں پتا دونوں میں سے غلطی کس کی ہے یا دونوں میں سے کون زیادہ کمبو وائزنگ ہے کہ ان کا کدوچ اب تک بچ رہا ہے مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں ہیں۔ جب لوگ آپس میں خوش نہیں ہوتے تو ایک دوسرے کو چھوڑ دیوں نہیں دیتے؟ شادی کے اٹھارہ سالوں نے ہمارے پیر خوش نگہیہ بنادیا ہے انوا تم میں یا ولی اس گلشیہ کو کھلا نہیں سکتے ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم ان کی فکر چھوڑ دیں؟ جب وہ ہماری خاطر خوش نہیں رہ سکتے یا خوش رہنے کی کوشش نہیں کر سکتے تو ہم ان کی فکر میں کیوں بھٹکان ہوں؟ ولید نے سختی سے کہا اور پیرھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

انہیں اس کے خیالات سن کر بکا بکا رہ گئی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ولید اس قدر قلع خیالات کا مالک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ پہلے پہل اسی نے انہیں کو مٹی ڈنڈی کی طرف متوجہ کیا تھا اور اب وہی کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تب ہی اس نے سانے دیکھا اور جیسے دنگ رہ گئی ثروت اپنے بیڈ روم کے دروازے میں کھڑی تھیں اور جیسی نظروں سے وہ پیرھیوں کی جانب دیکھ رہی تھیں ان سے لگتا تھا وہ ولید کی ساری باتیں سن چکی ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کتنی ثروت نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ انہیں ایک گہری سانس بھری اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔



رات گئے ماوی اور فیضان میٹنگ روم میں موجود تھے۔ ماوی صوفے پر نیموار ڈالی ہوئی پر کوئی ناک شوہر کھتے میں مصروف تھی۔ فیضان نے لیپ ٹاپ آن کیا تھا اور تین چار فائلز قریب بڑی تھیں۔ سارے گھر میں مٹی کی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ پھر پروگرام میں وقفہ کی آواز سنسنٹ ہوئی اور کمر شلڈر کھائے جانے لگے تو اس نے الیوم کم کر دیا اور کچے سے گردن موڑ کر ایک نظر فیضان کو دیکھا گویا ان کامیوڈ جاننے کی کوشش کی۔ لیکن ایک نظر میں کیا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ محض ناک پر رکھا چشمہ اور جڑے پر پھیلی سنجیدگی ہی دکھائی دی۔
 ”فیضی! ما! ماوی نے آگے سے کہا گویا بات کے اتنا زور لگے لیے پر تو لے۔“
 ”ہول۔“ انہوں نے سنجیدگی بھرے ”ہوں“ پر اکتفا کیا۔
 ”میں کچھ سوچ رہی ہوں۔“

”خدا کی قدرت ہے اب آپ بھی سوچا کریں گی۔“ سنجیدگی میں شرارت کا تائب خاصا کم محسوس ہوا تھا۔ ماوی نے شکر کھان نظروں سے انہیں دیکھا مگر متوجہ ہی کہاں تھے جو اس کے انداز دیکھتا ہے۔
 ”میں سوچ رہی تھی اب آپ کی شادی ہو جانا چاہیے۔“
 ”اب۔ کیا سوچا ہے۔“

”آپ میری بات دھیان سے نہیں سن رہے نا! پلیز فیضی! ما میری طرف دیکھ کر نہیں۔“ اس نے اصرار کیا۔
 ”اونڈی خدا! میں کاؤں سے سنتا ہوں آنکھوں سے نہیں۔“ فیضان نے دھجے سے مسکرا کر جواب دیا۔
 ”اچھا تو بتائیے میں نے کیا کہا؟“ وہ اٹھ کر بیٹھے ہوئے پوری طرح فیضان کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”تم نے کہا۔ فیضی! ما! میری طرف دیکھ کر نہیں۔“
 ”خدا! مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا آپ میری بات دھیان سے نہیں سن رہے۔“ ورنہ آپ کو پتا ہو گا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کچھ کہا تھا۔“ اسے سخت صدمہ پہنچا۔
 ”فیضان مسکرائے اور مجھے کے اوپر سے جھٹکا۔“
 ”تم نے کہا تھا کہ تم سوچ رہی ہو میری شادی ہو جانا چاہیے۔“ انہوں نے رسائییت سے کہا تھا۔ ماوی خوش ہو گئی۔

”پھر آپ نے کیا سوچا؟“ وہ پرجوش ہوئی۔ ”میرا مطلب ہے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“
 ”میرا مجھے میں نہیں آتا اب آج جب لوگ میری شادی کے بارے میں ہی کیوں سوچ رہے ہیں؟“
 ”ہمیں۔ اور کس نے سوچ لیا؟“
 ”تو میری بھالی بھی یہی ہے کہ رہے تھے۔“
 ”دست کہہ رہے تھے۔ اب آپ کی شادی ہو جانا چاہیے۔ اتنے بڑے ہو گئے ہیں اب بھی نہیں کریں

www.kissociety.com

”تھک چکی ہو سوچ مئی!“
 ”ایک اور بات بھی ہے ماوی! شینہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”تمہیں بتا ہے آئرلینڈ میں ایجوکیشن کس قدر مضبوط ہے۔ فیاض بھائی اور فیضان نے پہلے ہی ہمارے لیے
 کچھ کیا ہے۔ میں تمہیں چاہتی ان پر اور جو دالا جائے اسی لیے بہتر ہے تم اپنی باقی تعلیم یہاں پاکستان سے کر
 کرو۔ یہاں جو اخراجات ہوں گے وہ آئرلینڈ کے مقابلے میں تقریباً ”آٹھ گونے“ ہوں گے۔ تمہارے پیارے باپا کے انتقال
 بعد جب میں واپس آئی تو میرے پاس بھٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ میں تمہارے لیے پس انداز کر لی ہر طرح کی
 میرے بھائیوں نے کی ہو کہ تمہاری پر بھائی کے لیے اب بھی وہی فائنانشلی سپورٹ کریں گے۔ لیکن کچھ تو
 کم رہے گا۔ سوا ماوی! تم سمجھ رہی ہوں نا؟ شہروز فیضان کسی سے بھی اس بات کا ذکر مت کرتا! ایسا نہ ہوا نہیں
 سنا۔“

”جی! اہی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو
 بے حد یاد کر رہی ہیں ہو سکے تو آپ حبیب بھائی کے
 ساتھ چکر لگا لیجئے گا۔“ ایمان کے لہجے میں واضح پریشانی
 تھی۔

نیر فہم خان

لاکھتی گہری کا



”فکر مند نہ ہوں مئی! میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“ ماوی نے کہا تھا۔

”فیضان! ماوی پاکستان میں ہی ایڈمیشن لینے کی ضد کر رہی ہے۔“ اگلی صبح شینہ نے سہولت سے گیند ماوی کے
 کورٹ میں ڈال دی تھی۔
 ”اچھی بات ہے، لینے دیں، میں نے تو پہلے بھی یہی کہا تھا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔“ فیضان نے کچھ
 جھنجھٹتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا دل نہیں مان رہا۔“ شینہ نے سیدھی سے کہا تھا۔

”اس میں دل کے نہ ماننے کی کیا بات ہے بابا! فیضان کا لہجہ سرسری تھا۔ ”ماوی اپنی تو نہیں ہے کہ اپنا خیال
 رکھ سکے، پھر اب تو میرا بھی پاکستان آنا جانا رہے گا۔ ماوی کی خیر گیری ہوتی رہے گی، آپ کا کیا ارادہ ہے؟“
 مطلب ہے ماوی ایڈمیشن لیتی ہے تو آپ ریس کی کیا واپس چلی جائیں گی؟“
 کچھ خیال آنے پر انہوں نے پوچھا۔

”فی الحال تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انہوں نے سادہ انداز میں کہا۔

”میں تو بالکل نہیں چاہتی کہ ماوی یہاں رہ کر پڑھے، لیکن اس کی ضد، جس میں یہاں سے کتنی ضدی ہے، فیاض
 تو شادی کے لیے بھی راضی نہیں ہو رہی، کل رات بسی چوڑی ڈسکشن ہوئی اس سے، لیکن اس کی وہی رٹ ہے کہ
 اسٹڈیز کمپلیٹ کرے نہ دیں، اب بتاؤ میں کیا کروں؟“ انہوں نے اپنی طرف سے گرہ لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے نا، آپ اسے ایڈمیشن لینے دیں۔ اب تو شہروز بھی جا چکا ہے، اس کی اسپیشلائزیشن تک
 شادی کے لیے رکنا پڑے گا، تب تک ماوی بھی اپنی مرضی کرے، آپ کا دل چاہے تو واپس چلی جائیے گا،
 بائبل میں بھی وہ کہتی ہے یا میرا ارادہ تھا کچھ عرصہ تک اپنا کوئی چھوٹا موٹا کارپسٹ ویکھ لوں گا۔ اب ذرا جلد
 لے لوں گا، ورنہ وائیل صاحب کی انگلیسی تو ہم نے ریٹ پر لے لی رکھی ہے سواوی جہاں مناسب سمجھے گی وہ
 گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“ فیضان نے کہا۔

”اور اچھا ہی ہے، ماوی مصروف رہے گی تو اس کے دل میں احتمالہ خیال بھی نہیں آئیں گے۔“ نہیں ماوی
 کل والا آئیڈیا یاد آیا تو کسی قدر جھنجھٹا کر سوچا تھا۔

شینہ مارجرین لگا سلاکس کھاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

”نہیں“ موسیٰ بخار ہے، مگر آپ تو جانتی ہیں وہ بیماری میں کتنی چڑچڑی ہو جاتی ہیں اور کیا بات کو نہ ہن ر سوار کر لیں تو آپ لاکھ ان کے دل سے نکالنا چاہو، مگر نہیں نکال سکتے، آپ ان کے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ آپ پریشان ہیں اور آپ سے ملنا ضروری ہے۔ بس اسی لیے آپ کو فون کر لیا۔“

”ہاں میں بالکل سے دل کو روک رہی ہوں، فوراً چلا چل گیا۔ میں واقعی ان دنوں بہت پریشان ہوں اور کافی دنوں سے گھر آتا چلا رہی ہوں، مگر ہماری ساس صاحبہ کی اجازت درجوش ہے۔ میں اپنی مرضی سے اپنی ماں سے بھی نہیں مل سکتی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”اپنی برائے ماں تو ایک بات کہوں؟“ وہ کچھ جھجک کر بولی۔

”ہاں کو؟“

”آپ اسی سے ملیں تو پھر کوئی ایسی بات مت کیجئے گا جن سے ان کے دل پر اثر ہو، وہ آپ کے جانے کے بعد کئی دن غمگین رہتی ہیں۔“

”کیا کہوں ایمان اپنے دل کی بات اپنی ماں سے بھی نہ کہوں تو کس سے کہوں ان سے بات کر کے دل کا بوجھ ہٹا دیا جائے۔“

”اور ان کے دل پر بوجھ چڑھ جاتا ہے۔“ ایمان نے کہنا چاہا۔ مگر کہہ نہ سکی۔

”خیر تم بھی ٹھیک کہتی ہو، میں خیال رکھوں گی اسی کی طبیعت کا اور ہاں ابھی تم ان سے نہ جانتا کہ میں آرہی ہوں، خواہ مخواہ انتظار کریں گی، میں خود موقع دیکھ کر وقت نکال کر حبیب کے ساتھ آ جاؤں گی۔“

”اوکے۔ آپ کو جیسا مناسب لگے، مگر جلدی آنے کی کوشش کیجئے گا۔“

”ہاں ہاں، تم فکر مت کرو، بس اسی کا خیال اچھی طرح رکھنا، میں جلد پیکر لگاؤں گی۔ اوکے۔“

”اللہ حافظ! باتیں جب آپ آئیں گی تو کریں گے۔“

”اے شاہ اللہ!“ اس نے کہتے ہوئے فون رکھ دیا۔

”ہی۔“

”ستامیری بیٹی!“ اسی اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

ان کے کھلے انداز میں سنا۔

”کیسی ہے تو؟ ٹھیک تو ہے نا؟“ اسی اس کا منہ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہوں اسی! مجھے کیا ہوتا ہے، بلکہ دیکھیں تو اور معلوم ہوگی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”نیک سے تمہاری یاد آرہی تھی۔ ایمان سے کہ فون کرو، تاکہ تمہیں دیکھ سکوں، آپ تو منتظر جاتے ہیں تمہاری شکل دیکھنے ہوئے لیا فائدہ ہوگا، ایک شرمش بنی کے یہاں کے بچوں میں دھنک سے کر سکو نہ مل سکوں۔“ وہ افسردہ ہو گئیں۔

”کیا کہوں اسی! میرا بس چلے تو روز چکر لگا دوں اب کلفٹن سے ناظم آباد آنا چاہتا آسان بھی تو نہیں اور فون پر بات کر کے مجھے لا سکوں نہیں ملتا۔“

”پچھو پچھو کا مزارج۔“

”کیا ہوا؟“ منیر وہاں بھی ٹھیک کرتی ہے؟“ اسی چہرے پر پریشانی دور تھی۔

”نہیں! ٹھیک تو خیر نہیں کرتیں مگر حبیب کا تو کوہتا ہے، ان کا بس چلے تو اس کے پلو سے ہی چپکے بیٹھے رہیں۔ ان کی ذرا سی طبیعت لوہر لوہر ہوتی۔ بس میری ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔“

”کیوں! اور بھی تو ہوئیں ہیں بڑی بی بی کی کیا تم ہی ٹھیک لے رکھا ہے۔“ ان کے لیے جس میں ناگواری کر گئی۔

”ہوئیں ہی ہیں نا! ابھی ہونے کا تمہدہ تو صرف یہ ہی ملا ہوا ہے، کوئی بھی بات ہو وہ دونوں ہم زبان کہہ دیتی ہیں۔“

”بھئی، بھئی، کوئی فکر نہیں تو ہر وقت میں اس لیے مجھے ہی پسنا رہتا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”کیوں! بھئی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ

”اے آپ کو بالکل ہی مٹا ڈالے۔ تم کون سی فارم ہو؟“

”تمہارے دوہنے ہیں، ان کے سیکڑوں کام ہوتے ہیں، اور یہ۔“ اسٹیو بوجھ۔ تین سو سو کو چاہیے کہ مل کر برابر سے کام کریں، میں نہیں پروا نہ کرتی تھی تفریب تو نہیں دیں، اپنی پروا کتنی بھی تو ضروری ہے، ہاں کو دیکھو، تین سو دوہے ہو رہے ہیں، چہرے پر محک کے آثار ہیں اور آنکھوں کے تلے صاف جلتے ہیں کہ تفریب بھی پوری نہیں لے رہی ہو۔ ایک تھرا کی زبرد دار تو نہیں ہو ساس کی تھارواری کی۔“ اسی کے لیے میں پیش بھی جو کسی بھی مل کے لیے میں اپنی اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر درد آتی ہے۔

”اسی! حبیب بھی تو ہیں نا، جھانپوں سے تو میں سحر کر لوں مگر حبیب۔“ اگر کوئی جھوٹ بھی کے تو وہ سچا سمجھ لیں۔ اس کے حقیق تو ان سے کوئی بات کہنا ہی افضل ہے۔ اگر کبھی کہہ دو تو منہ پھلا لیتے ہیں یا بات نہیں کرتے یا پھر لبا لبا پھر جس کالب لبا یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ بھاڑ میں جا میں۔ مجھے پچھو پچھو کا طرح سے خیال رکھنا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ ایمان کی بات جھول پھول کر حسب معمول اپنے دھڑلے روئے بیٹھ گئی تھی۔

”تمہارا نصیب بھی بالکل میرے جیسا ہے، تمہارے ابو بھی، بن کے دوانے تھے ہر وقت ان کے بازو غم کے اٹھانے میں لگے رہتے تھے، مجھے کہیں کوئی اعتراض کی اجازت نہ تھی۔ اسی لیے تمہارا رشتہ بھی انہوں نے بن کے گھر طے کیا اور اب یہ سب جھینس بھگتا رہا ہے، اور اس کا کوئی علاج بھی تو نہیں ہے۔“ ان کے چہرے پر۔ اواسی تھی۔

”کیا کریں اسی! نصیب ہی ایسا ہے۔“ دونوں پر رہائی بھی تو ہیں، مگر ان کے دل میں اتنے طوفان نہیں اٹھتے جتنے ہمارے میاں ہر وقت جو رہنا ہے رہتے ہیں، اسی لیے تو میں آپ سے ملنے نہ آ سکی۔ پچھو پچھو کو بھی بخار تھا، ان کو وہ دینا، پر میری کھانا پانا

تھارواری سب کچھ میرے ذمے تھا، جبکہ دونوں بڑی ان دنوں دونوں میں بیمار کیے ہوئی ہیں۔“ آج بھی بڑی مشکل سے بلکہ یوں سمجھیں حبیب سے لڑ کر کتنی ہوں کہ میں ہر صورت اپنی اسی سے ملنے جاؤں گی۔“

”چھو، کیا آگئی۔“ میرا دل خوش ہو گیا۔ میں تو ترے لگی ہوں مجھے کہنے کو، آئے حبیب تو ہوں گی۔“

”نہیں اسی! ان سے کچھ مت کہئے گا۔ یہاں تو نیک شریف بن کر سب سن لیں گے، پھر گھر جا کر بھڑاس نکالیں گے۔ میں خود موقع دیکھ کر سناؤں گی ہوں۔“

آپ فکرنہ کریں۔“ وہ ساری باتیں ماں سے کہہ کر بلی چھلکی سی ہو گئی۔

”پچھو جیسے تمہاری مرضی۔“ اسی نے ہار مان لی۔

”اور سناؤ سعیدہ کیسی ہے؟“ باتوں کا رخ کہیں اور مڑ گیا تھا۔

”خیر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟“ جب ایک بار سمجھا دیا ہے تو کچھ میں کیوں نہیں آتا۔“ حبیب کو قصہ اٹھا۔

”ساری باتیں میری سمجھنے کے لیے ہی ہیں۔ تم کو احساس ہے کہ میرے نہ جانے سے سب لوگوں کو کتنا برا لگے گا۔“ وہ روٹا سی ہو گئی۔

”اسی کی طبیعت بھی تو دیکھو، کتنی چڑچڑی ہو رہی ہیں، ایسے میں ان کو کتنا شامت بلوانے کے مترادف ہو گا۔“ حبیب اس کا رویہ سنا چودہ کچھ کر پکھو نرم رہا۔

”ختم اور دی ایٹ کر رہے ہو حبیب! کیا میرے گھر میں رکنے سے پچھو پچھو کا چڑچڑاؤ ختم ہو جائے گا یا طبیعت میں آرام آجائے گا؟“ وہ دوا لھا کر سو رہی ہیں۔

”میں خود دوا دے کر آتی ہوں۔ ان کو تھانے کی ضرورت نہیں ہے، انہیں پتا ہے آج عید کی برتھ ڈے ہے، میرے بھائی کی اولاد کی پہلی خوشی اور میں صرف اس لیے نہ چلوں کہ پچھو پچھو کا مزارج برہم ہے۔ اب کیا میں ضروری تقریبات بھی منڈ نہیں کر سکتی۔ ایک اکلوتی

پھوپھو ہوں بھائی نے کتنے اصرار سے کہا تھا میں ضرور آؤں۔ اور تم ہو کہ عین وقت پر روڑے انکار رہے ہو۔ وہ بولے کئی

حبیب چپ سا ہو گیا وہ خود سمجھتا تھا مگر اپنی امی کی طبیعت کی وجہ سے مجبور تھا۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں بہت حساس تھا۔ اسی وجہ سے حنا کے ساتھ کبھی کبھی زیادتی کر جاتا۔

”ٹھیک ہے یار، لیکن امی کا مسئلہ ہے“ اس کا کیا کریں۔“ وہ نیم رضامندی سے بولا۔

”بھائی اور چھوٹی بھائی ہیں تاگر میں“ اور پھر ہم کوشش کر کے جلدی آجائیں گے، پلیز حبیب! میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر کئی انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے، مگر یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی امی کچھ کہیں تو مجھے نہ کہنا۔“

”بالکل نہیں کہوں گی۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

”بحث پٹ تیار کی کرو! اب یہاں ہی آٹھ مت بچاؤ، جلدی جاؤں گے تو جلدی آتا اچھا لگے گا، ورنہ شکل دکھانے والی بات ہوگی۔“ اس نے آخر میں تنبیہ کی۔

”آپ فکری نہ کریں، مہدولت آپ کو شکایت کا موقع نہ دیں گے۔“ اس کے وجود میں جتنی سی دودھنی وہ پھری کی طرح کمرے میں گھوم رہی تھی۔ حبیب مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا۔



گھر میں پہل چلی تھی۔ بڑے سے ہاں میں غبارے، چھوٹی اشیاء سے نہایت خوب صورت منظر تخلیق کیا گیا تھا۔ رنگین تھپتھپے الگ ہمار دکھا رہے تھے۔ خاندان کے لقریا سب ہی لوگ جمع تھے وہ پیسے ہی پیسے سب موجود لوگوں نے اس کا ریتاک استقبال کیا۔ ”لو اٹھو تو پھوپھو اب آئی ہیں۔“ خالہ نے فطریہ کیا۔

”ہاں اور کیا، دو قدم پر گھر ہونے کے باوجود اتنی دیر

کروی۔ ایک اور خاتون نے جملہ جوڑے۔“ اوکات قریب رہنے والے کو وہ قدم کا فاصلہ طے کر میں بھی تھنوں لگ جاتے ہیں۔“ اس نے جتنی کر سکا نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا وہ نظریں چڑا کر گیا۔

”اے اب آئی ہیں آپ! اب سے انتظار کریں ہوں، کتنے SMS کیے، فون بھی کیا مگر کوئی جواب نہیں، خیر چھوڑیں اندر آئیں۔“ ایمان تیز تیز اسے سمیٹ کر لے گئی۔ تیاریاں تقریباً مکمل تھیں۔ اس کے آنے کے تھوڑی دیر بعد کلک کر گیا۔ مبارک سلامت کے شور میں تحائف کا لگ لگ گیا، بچہ پارٹی مختلف گیم میں مصروف ہو گئی اور بزرگوں نے الگ محفل جلائی۔ کھانے سے قاصر ہوتے ہی اس نے جانے کا ارادہ کیا تو امی نے گھر پر لیا۔

”کیا مطلب؟ ابھی مہمان موجود ہیں اور تم روانگی پکڑلو۔ یوں غیر وکیل کی طرح آنے سے بہتر تھا آئیں۔“ وہ سخت خفا ہو گئیں۔

”امی! میرا خود پل نہیں چاہ رہا کہ میں جانوں مگر کیا کروں حبیب کو اپنی منت ساجت کے بعد آنے کے لیے تیار کیا ہے، پھوپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”تو کیا تم واکٹر ہو یا پھر نرس کہ ایک بیمار کی تیمارداری صرف تمہارا ہی فرض ہے۔“ باقی وہ ہوسیں کیا گھریں سجاوٹ کے لیے لالی گئی ہیں یا اپنی پرچہری زیادہ کر رہی ہے اتنی کو شدید غصہ آیا۔

”کیا کروں امی! میرے میاں بھی تو سب سے نرالے ہیں۔ خدانہ کرے، پھوپھو کی ایسی حالت ہے کہ ہم ادھر ہوں تو لینے کے دینے پر جا سیں، حبیب کو ہر وقت ماں کی فکر لگی رہتی ہے، چاہے اس کے پیچھے میں کسی اور کے ارمانوں کا خون ہو جائے، مگر جا کر بھی میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گی۔“

”کے سر ہانے تمہو ڈائی جیٹھی رہوں گی مگر کون کا اہمیت رہے گا کہ میں گھر میں ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نے بیٹی کو بیلا نہیں دیا۔“ حنا نے پیار سے کہا۔ اسے معلوم تھا اگر اس

خوش قسمت کر دیا ہے، اور اٹھو کوئی حق ہی نہیں رہا۔ کسی خوشی میں بھی شریک ہونے کے لیے سوچنا پڑتا ہے کہ جائیں یا نہ جائیں، بلکہ حبیب کو اس بات گرتی ہوں اس سے، یہ بھی بھلا کوئی بات ہے، ماں کے بلو سے پاندہ رکھا ہے میری بیٹی کو۔“ وہ دگر فنی سے بولیں۔

”اور کیا آئی! ابھی تو ٹھیک طرح سے فابریج بھی نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی تو گفٹس کھولنے باقی ہیں، رک جائیں نا، منو آئے گا۔“ ایمان بھی تو اس کی یہاں بھی، مگر کزن بھی تھی، سو وہ اسی اپناہیت کے ساتھ ملتی کبھی منہ بھانج کا رشتہ نہ رکھا، ہمیشہ بڑی بہن ہی سمجھا تھا۔ حنا بھی اس سے چھوٹی بہنوں کا سا سلوک کرتی تھی۔

”نہیں ایمان! بعد میں دیکھ لوں گی“ ابھی تو جلدی ہے اور امی پلیز آپ حبیب سے کوئی بات نہ کیجئے گا۔ ابھی کو پڑی ہے، آپ کو تو کچھ نہیں کہیں گے، مگر مجھ سے حنا بھالیں گے۔“

”تو بیلا! آخر تمہاری بھی کوئی زندگی ہے ملنا ملنا ہے۔ یہ کیا ہر وقت ہوا کے کھوڑے پر سوار ہو۔“ امی نے اس کے پیچھے میں پیچھی ہے، کسی محسوس کر لی۔

”حنا! کہل ہو؟“ حبیب اسے ڈھونڈتا ہوا آیا، چٹنا نہیں ہے بارہ بجے والے ہیں۔

”مئی ہاں حبیب بھائی! مگر آدھے گھنٹے بعد، ابھی ساڑھے گیارہ بجے ہیں، آپ نے کون سے ملک سے گھڑی ملائی ہوئی ہے۔“ ایمان کے لہجے میں طنز اور آہ۔

حبیب نے چونک کر دیکھا، سب کے چہروں کے ذائیسے بگڑے بگڑے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا بات ہو رہی ہوگی۔

”جلدی کرو حنا! بچے فیر سے بے حال ہو رہے ہیں۔“ صبح اسکول جاتا ہے۔ اس کا لہجہ بھی ہلکا سا درشت ہو گیا۔

”ہاں ہاں! میں پل رہی ہوں۔ اچھا ایمان! پھر توں کی امی! آپ اپنا خیال رکھئے گا اور پریشان مت ہوئے گا، میں آپ کی طبیعت کی خرابی کی خبر نہیں سنتا چاہتی۔“ حنا نے پیار سے کہا۔ اسے معلوم تھا اگر اس

نے جلدی نہ کی تو حبیب کا رویہ مزید خراب ہو سکتا ہے۔

”تم بھی اپنا خیال رکھا کرو۔ خود کو نہیں سنبھالو تو کون سنبھالے گا؟ کھو تو کتنی کمزور ہو گئی ہو۔“

”میری فکر نہ کریں امی! بچوں کی وجہ سے کچھ تھک جاتی ہوں، کچھ عرصے کی بات ہے، یہ بڑے ہو کر اسکول جانے لگیں گے تو آرام مل جائے گا۔“ اس نے تسلی دی۔

”مل گیا آرام! اس کے جھنجٹ سے جان چھوٹے تب نا۔“ انہوں نے بلی آواز میں کہا۔ حنا نے سٹپنا کر حبیب کو دیکھا کہ کہیں سن نہ لیا ہو، مگر وہ بچوں کی طرف متوجہ تھا۔ وہاں کو پیار کر کے باہر نکل آئی۔

امی اور ایمان اسے تسف سے دیکھتی رہ گئیں۔

”حنا! ہمارے بڑوں میں جو گھر خالی تھا وہاں کچھ لوگ آگئے ہیں۔ بڑی بھابی نے اطلال دی۔“

”اچھا کون لوگ ہیں۔“ اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

”یہ تو معلوم نہیں، مگر کل صبح سلمان کے ٹوک آئے تھے، ابھی تو سینگ کر رہے ہوں گے۔ آصف نے آفس جاتے ہوئے دیکھا تھا، اچھے لوگ تھے، خواہ مخواہ سے ابھی تک لے نہیں، تم تو کل ساگرہ میں گئی ہوئی تھیں۔“

”چلو جو بھی آئیں اچھے لوگ آئیں، آج کل تو حالات اتنے خراب ہیں کہ ہر ایک سے ڈر لگتا ہے، بٹ صاحب تو خاصے عرصے سے وہ رہے تھے، اب مکان چھوڑا ہے۔“

”ٹھیک کہتی ہو، اگر اچھے لوگ ہوں گے تو میل ملاقات رکھیں گے، ورنہ وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔“ بڑی بھابی نے بے نیازانہ انداز میں کہا۔

”بھابی! اچھال میں نے دم پر رکھ دیے ہیں۔ آپ روٹی پٹائیں تو دس منٹ بعد دیکھئے گا، میں شافل کو دیکھ لگاؤں ورنہ وہ روٹنا شروع کر دے گا۔“

”ہاں ہاں جلا میں دیکھ لوں گی۔“ انہوں نے تسلی دی تو وہ پیالہ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

”افواہ اس وقت کون گیا۔“ تیل کی آواز پر اس نے کوفت سے سوچا چٹائی منسل پر کمرہ ہونے کی وجہ سے گیٹ کھولنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی کیونکہ وہ نفلوں، ہوسوں کے کمرے اور تھے سو وہ گیٹ کھولنے کے فرض سے بری الذمہ تھیں۔ سالے کا چولہا ہلکا کر کے گیٹ کی طرف بڑھی۔

”کون؟“ اس نے آواز دی۔
”اسلام علیکم۔ میں ماہین آپ کے پڑوس سے آئی ہوں۔“ نرم سی سائست آواز سن کر اس نے گیٹ کھول دیا سائست کھڑی خانوں کے لیوں پر رطلوں شکر اہٹ تھیں صاف ستھرا نقیس سالباں ہلکا میک اپ جو اس کی دلکشی کو اجاگر رہا تھا۔

”آئیے تشریف لائیے۔“ حنا کو اپنا علیہ عجیب سا لگے وہ بچن سے کام کرتی تھی ”عکبا لباس“ ٹھکن آواز دینے وہ خود ہی سرخندہ ہوتی۔
”آپ شاید کام میں مصروف تھیں میں نے آپ کو مٹرب تو نہیں کیا؟“
”نہیں! آپ آئیے پلیز۔“ کام تو سارا دن ہوتے رہتے ہیں۔“ وہ اسے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

”اصل میں کافی دنوں سے آنا چاہ رہی تھی مگر میری ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی گھر شفٹ کیا ہے تا تو کچھ عجیب سافٹل کر رہی تھیں۔“ کئی ڈیڑھ گھنٹہ ہو گئی تھیں۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ بہتر ہے تو ہم نے سوچا کہ چھوٹے بیٹے کی آئین کی تقریب رکھ لیں اس سلسلے میں آپ کو دعوت دینے آئی تھی۔“ ماہین نے تفصیلاً بتایا۔

”جی ضرور کب ہے تقریب۔“
”کل شام بعد نماز عصر ہے۔ آپ ضرور آئیے گا۔“

”یا کھل! ہم لوگ ضرور آئیں گے۔“ اس پر جوش انداز میں کہنے لگا۔
”شکریہ آپ میں چلتی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے ”ارے کھل! آپ بیٹھیں نا“ میں چائے ہوں۔“ حنا نے اصرار کیا۔
”پھر کبھی سہی“ ابھی اور جگہ بھی دعوت دینے میں جلدی جلدی تنہا چاہ رہی ہوں ساس کہہ رہی ہیں نا وہ کھیرا جاتی ہیں کبھی فرصت دی تو پھر کبھی اب اجازت دیجئے۔“ اس نے نرم انداز میں کہا۔
”اوہ اچھا! حنا کو اس سے بہتر دینی ہی ہوگی۔“ یہ بھی میری طرح ساس گنہگار تھیں۔

نے دل میں سوچا۔ گیٹ بند کر کے وہ کچن میں آئی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تقریب میں نہ جائے گی۔

بٹ صاحب کا گھر پہلے ہی خلا خوب صورت ماہین نے تھوڑا بہت اور تعمیراتی کام کرایا تو گھر کی شکل آئی۔ وہ تعریف کیے بغیر نہ وہ کسی ٹھیکر کی ہوش نفاست اور خوب صورتی جھلک رہی تھی۔ تقریب انتظام بھی احسن طریقے سے کیا گیا تھا۔ حنا کو وہ ذہنی آسویگی نصیب ہوئی تھی۔ ماہین نے یہ نقشہ ناشے کا انتظام کیا تھا سب کچھ نہایت بہترین تھا۔ ماہین کی ساس بھی محفل میں شریک تھیں مگر اس سے نفوش یا رعب چھو! ابھی انداز حنا کو ان سے کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔ جبکہ ماہین بے حد متکبر تھیں جسٹ پیٹ کام نہ تھا وہ بھڑکی کی طرح کھوم رہی تھی اختتام پر اس نے گرم جوش سے دوبارہ آلے کی دھڑکی دی جو اس نے خوشی قبول کر لی۔

پہلی میں دیکتا کو تلمہ رکھ کر اس نے تیل پکایا تھی کی پانڈی میں رکھ کر دھکن بند کر دیا تاکہ کوئلے خوشبو میھے میں رچ بس جائے۔ پھر راتوں پانڈی کو دل کر ہر ادھیا چھڑکا۔ دھکی میں بٹھا ہوا زیرہ اور تھیں

کر جھٹ لیا۔ خوبصورت سی کنوری میں رائیو نکال کر قہر کی پلٹ کے ساتھ رکھ کر دبا ہر نکلے گی۔
”کھل جاری ہو!“ پیچھو کی آواز نے قدم روک لیے۔
”باری کیو قہر بنایا تھا ماہین کے گھر جا رہی ہوں۔“ اسے کوفت تو ہوئی مگر نرمی سے جواب دیا۔
”میرے لیے کچھ بنایا ہے یا نہیں مجھ سے تمہارا رکھا سو کھا قہر نہیں کھایا جا با بولی شورو بے والا ساسن بنایا ہے؟“
”جی پیچھو! آؤ گوشت ہے! آپ کو کھانا دوں؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں رہنے دو ابھی بھوک نہیں ہے۔ جب لگے گی تو لے لیں گی۔ تم ہو آؤ۔“ کھن کا موڈ اچھا تھا یا حنا کی قسمت کے خود سے اجازت دے دی۔ ورنہ حنا کو اپنا جانا کھانا میں بڑا نظر آ رہا تھا وہ شکر منائی گیٹ کر اس کر رہی تھی وہ مکان چھوڑ کر رہی ماہین کا گھر تھا۔ وہ جیسے ہی داخل ہوئی ماہین کی ساس کے گرتے پرستے کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم روک گئے۔

”تم جیسی چھوڑ لو رہ سلیقہ عورت میرے بچے کے نصیب میں لکھی تھی۔ یہ تو ہمارا ظرف ہے۔“ انہیں بدداشت کر رہے ہیں۔ کوئی اور ہو تا تو کب کا فاسخ کر چکا ہوتا۔ جہاں اتنا منگا ڈنریٹ یوں بچوں کے حوالے کر دیا۔ جیسٹ میں لائی ہو۔ میرے بچے کی مکملی کو یوں بے دردی سے لٹاتے ہوئے تمہیں ذرا سا بھی احساس نہیں ہو تاکہ یہ حرام کامل نہیں ہے۔ محنت کا پھل ہے۔“

”جی ایس فون سننے لگی تھی کہ ڈنریٹ اندر چلا گیا۔“
”نکسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسٹاپل پر چڑھ کر اس نے پیشہ توڑی۔“ وہ اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔

”ہاں تمہاری اماں کا فون ہو گا اپنے دکھڑے دوست وقت تمہیں پتہ کب چلتا ہے کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔“ کھن کا لہجہ بے حد خراب تھا اور انداز دل کو چوٹ پہنچانے والا۔

”جی کافون نہیں تھا۔ حیدر کافون تھا لیکن کھارے میں پوچھ رہے تھے۔ کچھ دوستوں نے آنا تھا تو وہ کھانے کے کھارے میں معلوم کر رہے تھے کہ کچھ لور لانا ہے یا نہیں۔“ ماہین نہایت صبر کے ساتھ ان کے لہجے کی کٹی کو اپنے لہجے کی نرمی سے کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وصیان رکھا کر بولی لی! اگر باپ کے گھر کچھ نصیب نہیں ہوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شوہر کے گھر نصیب ہونے والی اشیاء کو برہادر کر کے رکھ دو! وصیان رکھا کر رہے۔ اب اگر کوئی نقصان ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“ وہ اپنی بیٹھم بڑی چلی گئیں۔ ماہین نے لمبی سانس بھری۔ حنا نے قدم بڑھا دیے۔

”ارے حنا! کیسی ہو تم! وہ اپنی روایتی گرم جوشی سے لمبی لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ابھی چند لمحوں پہلے ساس کے ہاتھوں اتنی عزت افزائی ہوئی ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں تم سناؤ!“ وہ جتنی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر جا کر کوئی جہاں نرم سی مسکراہٹ چھیلی ہوئی تھی۔

”میں یار ابھی ابھی ساسو ماں سے جھاڑ کھا کر بیٹھی ہوں۔ کارنامہ ہمارے صاحب زادے کا تھا ممکنات ہمیں بھر پور آخر ہم ایک شرارتی بچے کی والدہ ماجدہ بنو ہیں۔“

حنا نے حیرت سے اس کے حوصلے کو دیکھا۔ اگر ایسی سخت باتیں اس کو سنائی جاتیں تو اس کا مؤثری طرح آف ہو جا گیا۔ کچھ نہیں تویرنوں کوٹ کر اور بچوں پر چلا کر غصہ ضرور نکالتی مگر مایا تو ایسا کوئی معاملہ ہی نہ تھا۔

”میں یہ باری کیو قہر لائی تھی۔ مجھے تو بہت پسند ہے۔ سوچا تمہارے لیے بھی لے آؤں۔ مگر تمہارے ہاں تو شاید دعوت ہے۔“

”ہاں ہے تو تمہارے کیا فرق پڑتا ہے۔ روز اپنے ہاتھ کا پکا کھاتے ہیں آج تو ذائقہ تبدیل ہو گا۔ میری ابھی سی دوست اپنے پر خلوص جذبات کے ساتھ میرے لیے ڈش لائی ہے تو میرے لیے سب سے اہم

ہے۔ میں تو یہی لکھاؤں گی۔" اس نے دُش باہتہ سے لیتے ہوئے لکھاؤں کے ہٹارے خوشبو محو کی۔

"واؤ! بڑی زبردست خوشبو ہے۔ ذائقہ بھی بہت اچھا ہو گا۔ تم اندر آؤ میں باہری سانس مجھے سناں باتیں سنائی ہیں اب تم سے یہاں کھڑے کھڑے باتیں کر رہی ہوں۔ اور اندر آئے کو بھی نہیں کہہ۔"

"نہیں" تم بھی مصروف ہو اور مجھے بھی پھپھو کو کھانا دینا ہے۔ نہ جانے کب اچانک بھوک مل جائے میں پھر آؤں گی۔"

"ہاں یہ تو ہے بچہ اور یو ڈھا برابر ہی ہوتا ہے۔" یو ڈھوں کا خیال بھی بچوں کی طرح رکھتا رہتا ہے۔ اس نے سر ہلایا۔

"لو کے میں چلتی ہوں۔" حنا پلٹ آئی مگر سارے وقت اس کے دھیان میں مایہن کا چہرہ رہا جو اتنا سخت ست سننے کے باوجود نارمل تھا اور یہی بات اسے حیران کر رہی تھی۔

"مایہن! بڑا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" اس کے لیوں پر دل میں چمکتا سوال آئی گیا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے۔" وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔

"تمہاری سانس کا رویہ تمہارے ساتھ اتنا خراب کیوں ہوتا ہے؟" لمحہ بھر کے لیے مایہن کا چہرہ تاریک ہوا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"ان کی عادت ہے۔ مزاج جذباتی ہے۔"

تمہاری سانس اچھی ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر اس سے تمہیں کیا لگتا ہے۔ حنا نے سوال کیا۔

"میری دوست رہا راست پر آئی۔ اب میں نہیں جھجھکتا۔ جب کبھی اسے اپنی سانس کی بری لگیں گی تو وہ میری سانس کے بارے میں خود کو تسلی دے لے گی۔ یہ کوئی کم بات ہے۔ ہنس۔

"کمال ہو یا تم بھی ٹیبل کے درخت میں گلاب کا پھول ڈھونڈ لیتی ہو۔ حنا نے ردِ عمل اعتراف کیا۔

"اب اسی خوشی میں ایک کپ گرما گرم پلاؤ۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"اچھی لگتی ہوں۔" حنا فوراً اٹھ گئی۔

"پلٹ میں بھی کچن میں ہی چلتی ہوں یہاں بیٹھ کر دیکھوں گی۔" مایہن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"آؤ کچھ پلاتے ہیں۔ بچے بھی آئے والے گے۔ وہ بھی کھائیں گے۔" دونوں مسکراتے ہوئے کچن میں داخل ہو گئیں۔

"عجیب ہے مایہن بھی۔" وہ حبیب سے کہہ رہی تھی۔

"کیوں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق۔ حبیب نے فحش کر پوچھا۔

"خلواتوں کے حسب ہے تو وہ واقعی کسی دوسرے سیارے ہی کی مخلوق ہے۔ اتنی بڑی خلواتوں کی ہیں اس کی سانس اور خیال ہے اس پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اتنا اتنا برا بھلا کہہ دیتی ہیں اور وہ فحش تر کلماتی رہتی ہیں تو اس کی برداشت پر حیران ہوتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"حقیقت یہی ہے حبیب! جاپانی کسی مٹی کی بنی ہے کہ اس پر اثر نہیں ہوتا۔ میں اس کی جگہ ہوتی تو شاید سائل کی جگہ دونوں میں ہی چل چل کر مری جاتی۔ ان کی زبان سے یا زہر سے مجھے تیروں کا ترش۔ ایسے ایسے کھانے کر دیتے والے لفظ استعمال کرتی ہیں کہ اگلے کو کہیں جائے پناہ نہ ملے یقین کریں کہ ان سے اپنے کے بعد میرے دل نے شکرانے کا کلمہ بڑھا کہ اپنی خطرناک خاتون میری سانس نہیں ہیں۔ پھپھو تو ایسی نہیں ہیں۔ پھر بھی میں کتنی بار جھجھکتا چلتا ہوں۔ پیریزے بن کا مظاہرہ کرتی رہی ہوں۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنا اور بڑی ایٹم کرتی تھی۔ حنا نے اعتراف کیا۔

"حبیب نے حیرت سے دیکھا۔" کمال ہے یعنی کہ فنی بیویں تو واقعی کمال کی خاتون ہیں کہ ان کی صحبت میں آپ کو عقل آتی ہے۔

"وہ مسکرا کر رہ گئی۔

"حنا! مجھے ہی کو فون کرنا ہے اور میرے فون کے ساتھ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کالم نہیں کر رہا۔"

"کوئی بات نہیں" تو میرے سیل فون سے آرام سے بات کرو۔" وہ اسے بیڈروم میں لے آئی۔

"قرشایہ الماری سیٹ کر رہی تھیں۔" مایہن نے کپڑے پھیلے دیکھ کر انڈازہ لگا یا۔

"ہاں یار سارے کپڑے الٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔ صبح بھی حبیب کی ملٹی نہیں ملی تو بہت غصہ ہو رہے تھے۔ یہ کو فون اور آرام سے بات کرو۔ میں آتی ہوں۔"

"اے بیٹو! تالیاں یا راتم سے کیا رو۔ تم اپنا کالم کرو میں اٹھ کر کرتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے حنا کا ہاتھ تھام لیا تو وہ پکڑے سمجھنے لگی۔

"اسلام علیکم ای! ایسی ہیں آپ؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حنا نے ہی آپ کیوں فکر کرتی ہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اسے نہیں مانتا کہ رویہ بہت اچھا ہے۔

"اسلام علیکم ای! ایسی ہیں آپ؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حنا نے ہی آپ کیوں فکر کرتی ہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اسے نہیں مانتا کہ رویہ بہت اچھا ہے۔

"اسلام علیکم ای! ایسی ہیں آپ؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" حنا نے ہی آپ کیوں فکر کرتی ہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اسے نہیں مانتا کہ رویہ بہت اچھا ہے۔

ابھی میرا فون کالم نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے زیرِ سنی پڑوس میں بھیجا کہ جاؤ اپنی ماں کو فون کر لو وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"ارے نہیں! اب عمر کے ساتھ آپ کا دل بھی دھوکہ دینے لگا ہے۔ میرے گھر میں راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔"

"نہیں! ایسی بات نہیں، کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے بیمار جو رہتی ہیں تو میں برداشت کرتی ہوں۔ آپ بھی تو غصہ کرتی ہیں ناں۔ تو کیا آپ سے بھی جھگڑا کر لیں۔"

"میری پیاری امی! چند دنوں بعد بچوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ انشاء اللہ پھر لگاؤں گی تو آپ خود کچھ لے کر آئیں۔ میں کتنی خوش ہوں۔ اوکے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اور وہاں میں وقت پر کھائیے گا۔ ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ۔"

اس نے بات کر کے فون حنا کی طرف بڑھایا۔ حنا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی مایہن نظر سے چرائی۔ حنا سامنے آگئی۔

"پلیز مجھے یہ تو تم نے امی سے جھوٹ کیوں بولا؟ کیا ہماری دوستی اس قابل نہیں کہ تم دل کی بات مجھے سے شیر کر سکو۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری سانس تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں اور تم ان کے قصیدے پڑھ رہی ہو۔ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیا کہ وہ بہت تنگ کرتی ہیں اس پر وہ پوشی کی عادت ہے ان کو سرجر جاتا ہے کہ وہ ہر وقت تمہارے لئے تیار رہتی ہیں اور تم چپ چاپ یہ برداشت کرتی رہتی ہوں۔ حنا کو بے حد غصہ آ رہا تھا۔

"تو اور کیا کر لیں۔" مایہن نے اس کے لیے میں چھٹی صدیوں کی محنت حنا کو محسوس ہوئی۔

"میرے بس میں سوائے برداشت کرنے کے کچھ نہیں ہے۔ عادل نے مجھ سے پسند کی شادی کی۔ ان کی امی کا ارادہ اپنی بھانجی کو ہونے کا تھا۔ میں نے ان کے دل میں گڑ پڑائی۔ اور وہ میرے گھر آنے سے قبل ہی میرے خلاف محاذ کھول کر بیٹھ گئیں۔ عادل کو مجھ سے امید تھی کہ اپنی نرم طبیعت کے باعث میں ان کا دل میں

جگہ بتاؤں گی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میرے والدین کی معاشی حیثیت عادل سے کم ہے۔ یہ میرا دو سرا بڑا عیب ہے۔ میرے بھائی معمولی ملازمت کرتے ہیں اس منگانی کے دور میں چار بچوں کے ساتھ گزارا کرنا بہت مشکل امر ہے۔ اہی میری دل کی مرضی ہیں میری کوئی بہن نہیں ہے اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے ان کا سارا دھیان میری طرف لگا رہتا ہے وہ میرے معاملے میں بہت حساس ہیں۔ اگر میں ذرا سا کہہ دوں کہ میرے سر میں درد ہے تو وہ پوری رات جاگتی رہتی ہیں۔ میرے لیے ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ اب ایسے میں ان کو یہ بتاؤں کہ میری سانس مجھے معمولی باتوں پر ڈانٹ دیتی ہیں۔ میرے علم میں نقص نکالتی ہیں مجھے میری کم حیثیتی اور کم چیز لانے کا طعنہ دیتی ہیں تو بتاؤ کیا میں صحیح کروں گی۔ ان کو دکھی کر کے ان کو پریشان کر کے بولو؟

”مگر میں سے بات کر کے تو دل کا بوجھ ہٹا ہو جاتا ہے۔“ اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔
”ہاں سے بات کر کے اس سے سانس کی پرائیاں کر کے ہمارے دل کا بوجھ تو ہٹا ہو جاتا ہے مگر بھی یہ سوچا ہے کہ وہ سارا بوجھ کہاں جاتا ہے؟ وہ بوجھ مائیں اپنے دل پر لے لیتی ہیں۔ کچھ مائیں بیٹیوں کو حکمرانی کے کینہ پرور طریقے سکھاتی ہیں کچھ شوہر کو قابو کرنے کے کینہ سکھاتی ہیں اور جو مائیں یہ سب نہیں کر سکتیں وہ دل ہی دل میں چلتی گڑھتی رہتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود کچھ کر نہیں سکتیں اور بیٹیوں کے دکھ محسوس کر کے خود کو دکھی کرتی رہتی ہیں۔ اب کیا یہ بہتر نہیں کہ اپنی ماں کی فطرت کے مطابق انہیں سب اچھا ہے کی رپورٹ دوں۔ میں چشم تصور میں دیکھ سکتی ہوں کہ اہی کو چاہے میری ساری باتوں پر یقین نہ آیا ہو مگر میرا مطمئن اور پرسکون انداز ان کو کدھی نہیں کرے گا۔ وہ بے فکری سے آرام سے سوئیں گی اس سلی کے ساتھ کہ ان کی بیٹی آرام سے ہے۔ اور اگر اہی میں ذرا سا بھی اپنے دکھنے رونے پریشانی سے ساری رات جاگتیں اور دوسرے تیسرے دن ہی ان کی طبیعت کی

خرابی کی خبر آجائی تو میری دوست ایسا محسوس مان تو خوش کر دے میری نظر میں ایسے ہی ہے جو میری ماں کو دکھی کرے۔ اگر تم بھی اپنی اپنی باتوں سے جاگرتی ہو تو ایسا کرنا بڑا دردناک اور اچھا ہونے کی رپورٹ دو۔ خود کو مطمئن ظاہر کرو وہ بے حد خوش اور تندرست رہیں گی۔ بات دل کے بوجھ کی تو اللہ تعالیٰ سے امتیاز دے گا۔ دعا مانگو ہمارے قلب کو سکون کی دولت دے گا۔ آنا نکلی شرط ہے میں چلتی ہوں ہو گئی ہے کچھ بھی آئے والے ہوں گے۔ وہ حنا کو سوجھ کے گرداب میں دھکیل کر مٹی۔ حنا خاموشی سے اسے جا ملا بھیجتی رہی۔

”میلو ای! ایسی ہیں آپ؟“
”میں تو ٹھیک ہوں۔“ یہ بتاؤ کہ تم کمال فون کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے تمہارا ان کی خفا خفا آواز سنائی دی۔
”جی ای! جیسا“ میرے پاس سر پہلے فرصت نہیں۔ سعد کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ سر کھٹا ہے۔ اور پیر دانت نکال رہا ہے۔ چڑچڑاہوا ہے کہ ڈھنگ سے پانی کا گلاس بھی نہیں دے رہا۔
”جی بتاؤ کہیں تمہاری سانس نے تو منع نہیں فون کرنے سے؟“ انہوں نے کھوچتے ہوئے میں کہا۔
”ارے نہیں ای! میرے پاس میرا سلی فون جس کابل حبیب بھرتے ہیں۔ لینڈ لائن سے تو نہ کرتی نہیں۔ ابھی بھی اپنے کمرے میں آرام پر بیٹھی آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ سعد نے ہے اور میرا دل ان کی سوراہا ہے تو موقعہ نصیب فوراً“ آپ کو فون کر رہی ہوں تاکہ آپ کو فکر نہ اس نے نصیلا بتایا۔
”اچھا ٹھیک ہے ورنہ جس مزاج کی تمہاری

ہے اس سے کچھ عید نہیں ہے۔“ انہوں نے گلستے ہوئے کہا۔
”میں کون سی پروا کرتی ہوں ان کے مزاج کی۔ اپنا بوجھ خراب کرتی ہیں تو کرتی رہیں۔ میں نے حبیب کو ہی کہہ دیا ہے کہ کچھ بھی میرے بھی بچے ہیں ان کی ضروریات ہیں ہزاروں کام ہوتے ہیں اب ہر توازیہ میں دوڑ بھاگ نہیں کر سکتی۔ سب لوگ مل کر کام کریں۔ بات میں رہتی ہوں۔ دیکھ کر بڑی بھابھی کرتی ہیں اور شام کی چائے اور کھانا چھٹی بھابھی کرتی ہیں۔ سب سبی ماں گئے۔ انہوں نے خود کھانا کہ ان کی کھانے کو سنبھالنے کے چکر میں میرے اپنے بچے خوار رہے تھے سو ان کو حقل آئی۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔
”شکر ہے خدا کا کہ تمہارے میاں کو حقل تو آئی۔“ اس نے بیوی کو ویوورٹ کنٹینر مشین سمجھاتا تو دیکھا۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔
”تو کیا اب آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔ میں نے کچھ لیا ہے کہ کس طرح اس گھر میں رہنا ہے۔ سب سب سنبھال لیں گی۔ اور حبیب کو بھی اب قابو میں رکھیں گے۔ بہت سہل لیا۔ اب میں اپنے بچوں کی تعلیم کی صورت پر ڈانٹ نہیں کروں گی۔“ اس نے ہان پڑتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک! ابھی طرح رہنا۔ اپنے آپ کو نہ اتنا کڑوا تاکہ سب تھوکر دیں اور نہ اتنا شگ کہ سب بڑبڑا کر سنیں کہ کسی کے ساتھ نا انصافی کرو اور نہ اپنے ساتھ سے۔“ اس نے اپنی حالت دیکھ کر بہت دل جلتا رہتا تھا۔ اب میں سکون سے رہوں گی کم از کم میرے ساتھ ہے بوجھ تو نہ ہو گا کہ میری بیٹی اپنا دل مار کر رہی ہے۔ انڈیا کے بہم پر جبراً وقت گزار رہی ہے۔ شکر ہے کہ اس نے میری سن لیا۔“ اہی کے لبوں پر سکون کی مسکراہٹ تھی۔ وہ بھائی محسوس کر سکتی تھی۔
”اب آپ کی دعاؤں کا کافی نتیجہ ہے کہ سب کچھ

آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ میں بچوں کی وجہ سے مصروف ہوں جیسے ہی فراغت ہوئی آپ سے ملنے آؤں گی۔“
”ہاں ہاں بیٹا! جب فرصت ہو آجانا۔ ورنہ ضروری نہیں غصہ پر بات ہو جاتی ہے تل۔ اب حبیب تمہاری قدر کرنے لگا ہے تو اس کے ضبط کو زیادہ مت آڑنا۔ اپنے گھر خوش رہو۔ ہم اسی میں خوش ہیں۔ اچھا اب میں فون رکھتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔“ ان کا لہجہ پرسکون تھا۔
”بالکل اپنا خیال رکھوں گی۔ آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔ مجھے آپ کی بیماری کی اطلاع بالکل نہیں ملنی چاہیے۔“ اس کے لہجے میں ماں بھری دھمکی تھی۔
”اب بالکل نہیں ملے گی۔ پہلے تو تمہاری طرف سے فکر لگی رہتی تھی۔ تو پھر پھر پھر جاتا تھا۔ اب تم ٹھیک ہو تو میں بھی ٹھیک ہوں۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔“ اس نے سلی فون کو نظربھر کر رکھا۔
ایسا کوئی انقلاب اس کے گھر میں نہیں آیا تھا۔ جھانپاں اور بی برقعان رہتی تھیں اور حبیب بھی ماں کے لیے ویسے ہی حساس تھے۔ مگر یہ تو دو یمنین بن گئی تھیں۔ اب لازمی تو نہیں تھا کہ گھر کی ہر بات ماں کے گوش گزار کی جائے۔ سائین کی صحبت نے انہیں اتنا سکھا ہی دیا تھا۔ آگے کی راہ یقیناً ”سہل“ تھی۔



ورڈلے دیگے جی

اپنی؟

ان کے متوجہ کرنے پر میں نے دیکھا۔ ٹیکس بال بس یوں ہی ہاتھوں سے سنوارنا گول لینے بے رنگ بے خواب آنکھوں کے گرد چلتے۔
”بچے فارغ ہو جائیں نا تو پھر ایک چکر پارا بس۔“ میں نے ہنسی بھائی۔

”حاجت مشاغلہ نیست روئے دلی آرام۔“ میں نے جیسے چڑانے کی کوشش کی تھی، مگر میں نے کارروائی نہیں کی کہ اتنا وقت بھی کہاں تھا پاس۔

اسے دھن کر میں یوں ہی سمیٹا کھانا بھی کھانے کے حساب سے کھانا۔ کپڑوں کا ڈھیر چھانڈ کے ہاتھ دھلتا تھا۔ کنج 19 دن میں ہر صورت میرے سامنے تھا۔ خیر کن میں ہر جگہ فارغ تھی۔

”بل۔“ میں نے سکون سے سانس لی۔
”مہرا! ہم آگئے۔“ وہ ایک زبان چلائے۔
”نظر آ رہا ہے مجھے۔“ میں نے چھوٹے کوگ اٹھایا۔ اس کے گل چوے اور اس کی انگلیاں سے دھاتے ہوئے اندر بیٹھ گئی۔
”اقتضام میں لگا کھٹ کھٹ کر آ رہا تھا۔“

”اب تم کوگ دو منٹ میں نما کر کپڑے۔“ میں نے کپڑے۔ اور آج در سے کی چٹھی ہوئی۔ مزے کے کھانے کھائیں گے، کوگ پیتیں گے، خوب سوئیں گے اور رات کو پیلا کے ساتھ ہانڈ گے اور عیش کریں گے۔“

میں نے بچوں کو ایک آپ کرنے کو تیز تیز کھلے ساتھ ساتھ میں ان کے کمرے کھول دی تھی۔
”مہرا! آج بھی پہلے کپڑے۔“ اقتضام بھرا۔
”میں پانچ منٹ، آج ہم اتنا ریلیکس کریں گے کہ سب لوگوں نے سوچا ہی نہیں ہوگا۔“ میں نے انہیں غسل خانے میں داخل دیا۔ دونوں ہاتھ پیر مار رہے تھے مگر میں نے چلنے نہ دی۔

”میں نے اپنے سارے وعدے پورے کیے ہیں۔“ میں نے لوگوں کے آنے سے پہلے میں نے Pogo اور Cartoon Network اور Baby تمام چینل بھی شون کر دیے ہیں۔“

”مہرا! آج اب مزہ آئے گا۔“ وہ ایک دوسرے پر باہمی اچھا لے لگے۔ ”جتنی جلدی کپڑے بدل کر ہار تو گئے۔ اتنی جلدی سر پر انڈز کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“ میں نے بچن سے ہانک لگائی اور بچے بھی اتنے ایکسٹریز تھے کہ جب میں بھری ہوئی ٹرے لیے کمرے میں آئی تو وہ بڑے تیز دار سے ٹی وی کے بالکل پاس

مرے کارٹون پر لگا ہوا اور گوسے جیسے بے گندہ تھے میں نے چھانے تو لیے سے ان کے بال خشک کیے اور گردن کھرا کر انکی سے کھانے کی جانب اشارہ کیا۔ ایک بار پھر ہالہ۔ ہوو شروع ہو گئی۔ میں مسکراتی اور کسٹنر پر ڈھیر ہو گئی کہ اتنے دن بعد آرام۔ مکمل آرام کے پہلے کسے تھے۔

اللہ نے ہمیں بہت مدت منتوں مرادوں کے بعد یہ دو بچے دیے تھے۔ دس سال کا اقتضام اور چھ سال کا ایشام۔ ہم دونوں میں اور اقتضام سیلف میڈ قسم کے متوسط طبقے کے لوگ تھے اور ہماری ساری توجہ امیدوں کا مرکز زندگی کا مقصد صرف اور صرف ان دونوں کی کامیابیاں اور خوشیاں تھیں۔ کچھ بچے ذہین اور پڑھنے کے شوقین تھے کچھ ہماری بے انداز توجہ وہ میرے کی طرح ترشے ہوئے تھے اور بچ بچاؤں، اقتضام نے جب بولی بار فرسٹی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی اور بالکل اچانک اس کا نام پکارا گیا تو وہ فنکشن کے طویل

ہوئے باٹھ لوگ وہاں تھا۔ نام کی بار بار پکار اور پھر بچے کے اشارے پر مجھے اسے زبردستی چنگلے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے چڑھتا گیا۔
”اللہ خدا! کیا کچھ تھا سوچا ہوا مندی آنکھوں سے اول ہوں کر! اقتضام میرے اپنے پیر لڑ رہے تھے میں نے ٹرائی تھامی لوگوں کی قاتل رشک لگا ہیں۔“ بے ساختہ غور کر آئے ولی جی عورتوں کی پیار بھری چیخ

”جی۔“
زندگی میں بہت سی کامیابیاں ملی تھیں مگر اس بل کا نشہ جیسے سرور ہوا ہو گیا، خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہم نے زندگی کی بہت ساری تقریحات اور ترجیحات پس پشت ڈال دیں۔ پہلے اقتضام تھا پھر ایشام، ایلہ وہ پڑھائی میں اقتضام سے ذرا سا کم تھا مگر اس کی خوب صورت آواز، ہمارے پورے خاندان میں سب ہاتھ دم کرنے لائق بھی نہیں تھے اور اقتضام کے لیے ”یہ تو رونا بھی سڑوں میں ہے۔“ انہیں بھی اس کے رونے کی آواز بھی بے سہی نہ لگی۔

اسے دو سال پہلے اسکول میں داخل کر دیا گیا اور تب سے اب تک وہ فصلی سے زیادہ غیر فصلی سرگرمیوں میں فعال رہا۔ اقتضام تقاریر وغیرہ جتنے جتنے لیتا، آواز اس کی بھی اچھی تھی مگر ایشام جیسی نہیں، اقتضام فطرتی پڑھتا اور لی لکھتا اور ایشام بھی۔ دونوں کے یکساں شوق تھے یہ کم از کم ہمارے لیے سکون کا باعث تھا۔



میں نے گہری کی سمت نگاہ کی تو بس اب صرف دس منٹ باقی تھے میں سرعت سے غسل خانے میں گھس گئی اور پانی چھ منٹ بعد باہر آئی۔ صبح ساڑھے سات بجے کی لگائی واشنگ مشین اب دھو کر صاف کی تھی۔ رسیاں یہاں سے وہاں تک بھر گئی تھیں۔ تینوں کچے بھی صاف کیے تھے اور ساتھ ساتھ سارے کمرے کو رز بھی بدل ڈالے، بلکہ دھو بھی ڈالے۔ نماز میں خود کو اس قدر دھکا دھکا محسوس کر رہی تھی کہ کیا کہنے۔ میں نے اقتضام اور ایشام کے لیے بے گھر کر کے شلوار نکالے۔ خود بھی لان کا ٹیلا سوٹ زیب تن کیا۔

بچوں کے لیے خوب بھاری بھر کم ہر گز بنائے ساتھ پتیچی اور ڈھیل چپس اور کچھ اپنے لیے ہرے مسالے کی گرانڈ تیز سرچوں کی چٹنی تیار۔ واہ۔ میں ننگے پیر مرکزی دروازے تک آئی اور سر کو دوپٹے سے دھانپنے لگی کے اس کوٹے کو دیکھنے لگی، جہاں سے میرے بچوں کی اسکول بون بس آئے کو بھی اور لیں وہ آئی۔ کارنر والے چٹنی صاحب کے بچے اترے اور اب میرے بچے ہاتھوں میں استخوانی گتے لیے اچھلتے کودتے نمودار ہوئے ان کا یہ بے فکر انداز مجھے اندر تک طمانیت سے بھر گیا۔

وہ آج آخری پیپر دے کر رہے تھے اور چ کھوں ان کے کیا میرے استخوان جیسے ختم ہوئے تھے سوچتی ہوں، بلکہ میں نے اقتضام سے کہا بھی کہ اگر اتنی محنت اپنے لیے کرتی اور آج کہاں سے کہاں ہوتی اور وہ نہ بولے تھے ”کتنی تو ٹھیک ہو، مشکل دیکھی ہے تم نے

برگرا اور دوسری اشیاء سے لطف اندوز ہو کے وہ نیم دراز ہو گئے اور میرے خیال میں اب یل بھر میں آنکھیں بند ہونے کو تھیں کہ زبردستی کھول لی دی یہ نگاہیں ہمائے ہوئے تھے۔

بچے اپنی سلا سے زیادہ مشقت جھیل چکے تھے۔ میرے پاس ان کی تفریح کے لیے بہت سے پروگرام تھے۔ سب سے پہلے تو نیند پھر ان کی خود آک جو بہت کم رہ گئی تھی، آگے مجھے اسی کے گھر رہنے جانا تھا۔ ایک فوٹلی کا افسوس، چھوٹی بہن کی سسرال بٹے جانا تھا ان کے کپڑے خرید کر ان کی سلائی کٹی تھی۔ فقط ان دس دنوں میں اور سو تفریح بھی کہ بعد میں نیا سال نئی کتابیں سکس نکاس اور نوکاس نئی ذمہ داریاں۔

”آف، مملا جی! ابتسام کو یک دم پکھ پکھایا۔“
”جی جانو! بولو۔“ میں اس کے سیدیل بیل سنوارتے ہوئے نیند میں جانے والی تھی۔

”یکم اپریل کو ہمارے اسکول میں ایٹل فنکشن ہے اگرچہ ایٹل فنکشن ہماری پچھ پول دی تھیں ہمارا اسکول فکٹی ایئرز کا ہو گیا ہے اور مجھے بہت سارے نئے دیے ہیں تیاری کے لیے، ٹیچر نے کہا ہے مملا سے کہنا تیاری شروع کرو اور دس دوسری سے دن تک جتنی کلاسز کے ٹیبلوز ہوں گے نا ان کے بیک گراؤنڈ میں میں ہی ملی نغے اور پوئم اردو انکس دونوں میں پڑھوں گا۔“ ابتسام میرا چہرہ اٹھوں میں تمام کر جوش سے کہہ رہا تھا۔

”اور مملا! سب سے زیادہ چیزوں میں ہم دونوں بھائیوں کا نام ہے۔ ہم دونوں کو رس بھی گائیں گے اور سولو بھی اور سب ٹیبلوز کے بیک گراؤنڈ میں میوزک انسٹرکشن کے ساتھ پریکٹس کر کے گانا ہے“ ویری گریڈ ایڈ امپورٹنٹ فنکشن ہوگا“ سلیوٹیز چیف لیسٹ ہوں گے“ اعتصام بھی شروع ہو گیا۔“ اور یہ دیکھیں ٹیچر نے یہ آپ کے لیے لکھ دیا ہے اور یہ ملی نغوں کا لیٹ بھی۔“ وہ اپنے جیو میٹری کس میں سے کانڈ نکال لایا۔ ایک آئیشل لیٹر فنکشن کی

تفصیلات کے ساتھ اور دوسرا ٹیچر کا کسے رقصہ ”ہائے میرے اتھا میری نیند اور چھوٹی سیدھی ہو چھٹی ملی نغوں، نعت اور انکسوں لکھے تھے، بس کل سترائے سنڈے کا آف پورے پینتہ وہ ہی اسکول بس ٹائم تک کافی سے پارہ آف خدا بخش تھی دیر سکت تھی میں خیال کیا محذرت کر لوں، بچوں کو کسی اور دھیان دلوانوں جیسے وہیں مگر پھر انتظار کا اعتماد کرینڈ فنکشن ہائے میرے سارے منہ میں نے تو سوچا تھا دس دن عیش ہوں گے ہائے اتھا میں نے بچوں پر نگاہ کی جو کبھی نہ چاہتے تھے، بی بی کی آواز گونج رہی تھی ریموٹ سے بی بی آف کیا اور وہیں آف آنکھیں بند ہو رہی تھیں مگر اب وہ پہلے جیسے اور شانتی کمال تھی“

اور اب کل فنکشن تھا میں نے اپنے ذمہ جو بہت مزے اور غرمت سے کرتے تھے ہمارے جیسے کیے تھے مگر وہ سکون جو چاہے تھا وہ میرے اب یہ احساس ہلکا پھلکا کرنا تھا کہ کل میرے بچے ہی اسکول سے سب سے زیادہ ٹرائیاں کر لائیں گے۔ ہماری خود اعتمادی کا نام ہے تھا کہ پہلے اشتہام نے ایک نیا آئرن ریک بھی لگوایا بچوں نے پانچ ملی نغوں دو نغوں اور دو دو ٹیبلوز چنے تھے۔

1۔ آؤ بچو کرا میں تم کو پاکستان کی جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جانوں کی بچوں کی فائل تیاری کے بعد میں اپنی ہمتی۔ بڑے دنوں بعد خبریں سننے کا موقع تھا شعیب ملک اور ثانیہ مرزا کی شادی ویری انٹرن میں مکمل طور پر متوجہ ہو گئی۔ خبر کے ان خود اور حق برق مضامین پہنچتے دانت دیتے سیاست سوسائٹوں کے نیچے“ ڈاکٹروں نے سٹائیل

جوت کی مار فٹن۔ کچھ میں نہ آیا کون عالم سے کون مظلوم۔ بھی ویل مارتے ہیں، بھی ڈاکٹر۔ خجلتے کس کا غم کمال کہاں نکالتے ہیں۔ پہلے کے کھونے اور اب وچوں کی خلیا ہے انداز رقص کرتے لوگ پیکر کیا ہے؟ اور اب سرحد کا نام بدل کر خیبر پختون خواہ رکھ دیا گیا۔ خواہ کا مطلب جگہ ساٹھ سال بعد اپنا حق وصول لینے پر عوام کا جوش و خروش دیدی تھا۔ میں سمجھ نہ سکی کہ اپنے جذبات کیسے بیان کروں، کیا یہ تبدیلی بہت ضروری تھی۔ اور اس صوبے کو بھلا کیا تھا؟ فائدے حاصل ہوں گے۔ معاشی ترقی انسانی مذہبی بھلا کون کون سے کیا نام بدل دینے سے نیت بھی بدل جاتی ہے؟ یا انسان کے لیے تو کرتے ہیں کہ فلاں نام بھاری ہے۔ بدل دو پچھ پکار رہتا ہے اس پر نام سوٹ نہیں کیا تو سررا کو سو۔ اسی سرحد نام منحوس ہی ہو گا۔ سارے عالم کے لوگ دانت تیز کیے اس تھلی علاقے کو گھورے جاتے ہیں کبھی اس علاقے کے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوششیں کی جاتی ہیں اور کبھی اچھے خاتے گھروں سے اٹھا کر میڈیاں میں پٹھا کر کے ہیں۔ یہ ہجرت ہوئی ہے اور سارے لوگ کھسکے “انصار“ بنے کا سو پ بھرتے ہیں۔ میرے دماغ میں خیالات کی وریں سی چلتے گئی۔

اور پتا نہیں یہ سب اچھا ہوا یا۔ میں ابھمن میں پڑ گئی۔ اشتہام ہوتے تو ہم آپس میں ڈسکس کرتے۔ ہاں مگر یہ جو لوگ اتنے خوش ہیں تو یقیناً “اچھا ہی ہوا۔ ہو گا۔ اگر ہمارے پختون بھائی خوش ہیں تو ہم بھی خوش۔ اور اعتصام نے بھی طویل گفتگو اور سارے ٹاک شوز شنگ کے ہوئے۔

”عوام کو آؤنا ناؤنا کا سب سے آسان کام ہے ہماری قوم کو ایک کے بعد ایک طریقے سے بے وقوف بنایا جاتا ہے اور مزے کی بات ہے۔ ہم اس پر خوش ہو گئے ہیں نہ کالا باغ بننے دیا نہ بجلی گیس اور پانی پر دھیان ہے۔ پیٹول کن سمتر روپے سے اوپر ہو گیا۔ یہ سارا بد رونا طبقہ سامری جلدو کرے زیادہ جانو گری دکھانا ہے۔ ان سے اچھی نظر بند کی کسی کو نہیں آتی۔ سامری عوام اپنے اصل مسائل کو فراموش کیے ہیں

”وہ بی بی جی (بھارت کو جو اللہ کے نام پر مٹھی چڑھائے ہیں) پر خوش ہو رہی ہے۔ تو چلو جانے دو اتنی مصیبتوں بھری زندگی اگر خوش ہونے کو چھوٹے کو کچھ مل رہا ہے تو ٹھیک ہے اگر یہ سب خوش ہیں مطمئن ہیں تو ہم بھی خوش ہیں۔“ اشتہام نے بات سمجھتے ہوئے جھل بدل دیا۔

”مملا! جی ایک بات یوں؟“ ابتسام نے میری ٹھوڑی چھو لی۔

”جی بیٹے بولو۔“ میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔
”بہت سرحد صوبے کا نام بدل دیا ہے یہ نیا نام رکھا مشکل سا کیا۔“ وہ کہتے کہتے ایک گایا۔
”خیبر پختون خواہ“ میں نے گھر گھر کرتایا۔

”ہاں یہی خیبر۔“ تو مملائی میں نے اور بھانے اسکول میں جھٹنے یاد کیے ہیں ملی نغے اور ٹیبلوز کے اسٹوریز تو سب میں لفظ ”سرحد“ آتا ہے تو کیا اب وہ سب نغے ختم کر دیے جائیں گے۔ ہماری کس میں جو پوٹھریں جن میں چاروں صوبوں کے نام سے پوٹھری ہیں تو کیا وہ سب اب کتاب سے نکال دیں گے؟ اب کل میں کیا اٹھے نغوں میں سرحد کی جگہ یہ۔ نیا والا نام یوں لگا۔“ وہ ٹٹکتانے لگا۔

”نہیں مملا! ایسے تو ساری پوٹھریاں خراب ہو گئی۔ مملا! اب کیا ہم سب لوگوں کو نئے ملی نغے بنانے پڑیں گے؟“

وہ معصومیت سے چہرہ اٹھائے مجھے نفور دیکھ رہا تھا۔ میں نے اشتہام کی جانب نگاہ کی۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے ابتسام کے بھلے چہرے اور بے ریا آنکھوں کو دیکھنے لگے پھر بے بسی اور بے چارگی کے تاثرات چہرے پر آ گئے وہ محض شانے لچکا کر رہ گئے۔ پتا نہیں دنیا میں کتنے بہت سارے مسائل تھے جن کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس جانب کس نے دھیان کرنا تھا۔ ٹھہرا پنا مسئلہ ہر انسان کو سب سے بڑا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے ابتسام کو دیکھا وہ آنکھیں نیکیڑے ہوٹ گئی کہیے بے حد پریشان بیٹھا تھا۔

اگتسی ہو گئی تھی

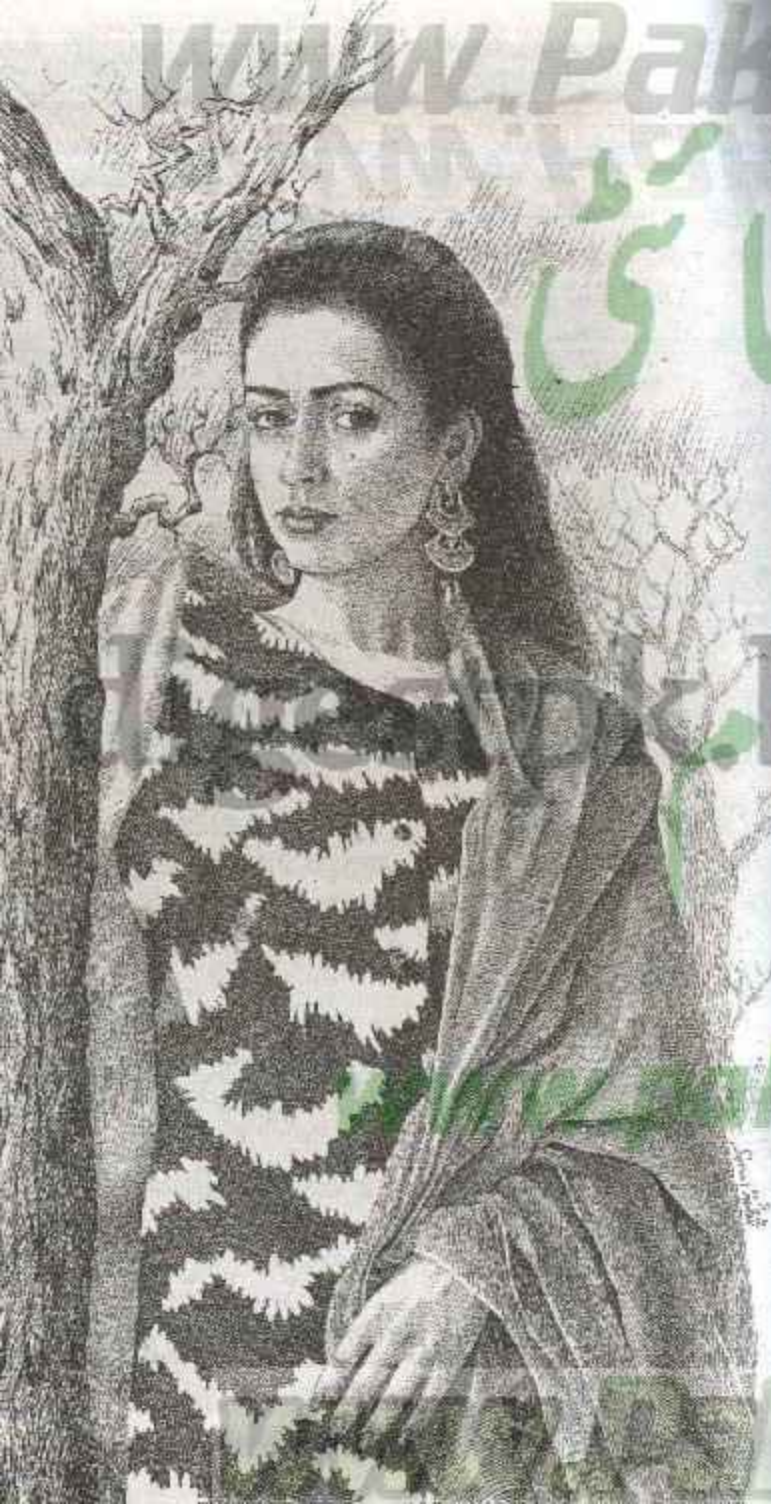
”آئی لوپ۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں“
مجھے چھوڑ کے مت جاؤ، میں تمہارے بغیر نہیں رہ
سکتا۔“ وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا گڑ گڑا رہا
تھا۔

وہ بیس برس کا لڑکا، پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا اس
کے لیے جو اسے چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے جا رہی تھی۔
وہ بے حد بے یقینی کے عالم میں گویا پتھر میں گئی تھی۔
”پیر میں میرا دل کا ٹکٹ جاؤ۔“
وہ جانتا تھا کہ وہ ہر حال میں اسے چھوڑ کے جائے
والی ہے، مگر وہ اسے روکنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو

منجھلناؤں

تیار تھا۔
”ہیکو اس بند کو علیا بن! اتم۔“ ہفتے کے مارا
کی آواز پھٹ سی گئی، کچھ کہنے کو سو بھائی نہیں۔
اس نے آگے جھک کر اپنے ہاتھ اس کے پیروں
رکھ دیے۔

وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی۔
”آئی لوپ۔ رینٹی کو ریش۔“
وہ آن کے مونچ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا
تھا۔ کسی بھی صورت اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ
محبت کا بونہ اس سے گرتا تھا۔ مگر وہ اس قدر اشتیاق



میں آجائے گی یہ عالیان نے سوچا بھی نہ تھا۔
اس نے سمجھی میں اس کے بالوں کو جکڑا اور
دوسرے ہاتھ سے تڑاں تڑاں دو تین پھیر اس کے
منہ پر دے مارے اور پھٹکاری۔
”کھل کو جب کسی خوب صورت سی لڑکی کے ساتھ
شادی کرو گے تو یہ بے وقوفی اور چکناچ پن یاد کر کے ہنسو
گے“ مذاق اڑاؤ کے خود اپنا پھر یہ الفاظ کہنا ذرا مجھ
سے۔“

اور پھر وہ چلی گئی ہمیشہ کے لیے مگر اسے عورتوں
کے لیے یہ شاید عورتوں کو اس کے لیے شجر ممنوعہ بنا کر۔

وہ کمپوزٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

اس کے کمرے کا دوروازہ بجالو اور ساتھ ہی کھل گیا۔
”ہیلو ایوری باڈی۔“ یہ چپکتی ہوئی آواز سارہ کی
تھی۔

”یلا کھرپے نہیں ہیں۔“ وہ اس کی طرف متوجہ
ہوئے بغیر ہاتھ داس پر رکھے اور نظریں بائیں پر جمائے
رکھائی سے بولا۔

مگر وہ بایوس ہو کر پلٹنے کے بجائے اندر چلی آئی۔
اس کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے اور اس کی جانب
جھکتے ہوئے بڑے انداز سے بولی۔

”تو کیا ہوا“ یلا کا بیٹا تو ہے نا کھرپے ہم اسی سے کام
چلا لیں گے۔“

”شٹ آپ سارہ!“ وہ ناگواری سے بولا۔

”افس“ سارہ نے جیسے منوایا۔ ”سنئے اچھے لگتے
ہو غصے میں کہ پتا نہیں کیا کیا جی چاہنے لگتا ہے۔“ وہ
شرارت سے بولی۔

”میرے پاس تمہاری بکواس سننے کا وقت نہیں ہے
سارہ! اگر تمہاریا سے ملنے کئی ہو تو وہ میں تمہیں بتاؤ چکا
ہوں۔“ وہ بہت رکھائی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہا
تھا۔

لیکن اوپر بھی سارہ زبان تھی اس سے ٹوٹ کر

محبت کرنے والی۔ اس کے عشق میں گم ہوئے
ڈوبی ہوئی۔

اس کی تمام تر بد زبانی اور بدتمیزی کے باوجود
ایک نیک کریوں اس کی طرف آتی جیسے پرواز
طرف آتا ہے جلے مرنے کی پروا کیے بنا۔

”اور میں نے بھی تمہیں بتایا تھا کہ میں ماموس
سے نہیں تم سے ملنے آتی ہوں۔“

وہ معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”لب مل میں ناؤ ویکٹ آؤٹ۔“ وہ دوبارہ کمر
کی طرف پلٹا۔

”ظالم انسان! اسے تمہارا کہتے ہو چار باتیں
وہ بھی جھڑکیوں میں اتنی دور سے میں یہ سننے کو
آئی۔“ وہ شکوہ کنال تھی۔

”میرے پاس یہ ہی کچھ ہے سارہ زبان! اسی سے
ہوں اس دلدل میں مت اترو ڈھنسنے کے وہ جاہل
وہ سفاکی سے بولا۔

اس کے لب و لہجے کی ٹھنڈک سارہ کو لہو بھر کر
گئی۔ سرورہ ہمیشہ کی طرح خوش کن خیالات کا
اوڑھتی مسکراتے لگی۔

”لب تو ڈھنسن چلی عالیان سکندر! گوڑے گوا۔
ڈوب گئی تمہارے پیار میں۔“

”یار کاظم مت تو میرے سامنے۔“ وہ غرلا تھا۔

”اوفوہ عالی! اتم“ مثنی الرئی“ کیوں نہیں کہتے
الرجی ہے تمہیں محبت سے؟“ وہ جھنجھلائی۔

عالیان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

دس برس پہلے اپنے چہرے پر بڑے دالے تھے
میں سے اس نے آگ کے شعلے لپکتے محسوس
تھے۔

اس کا پتی چلا اسی طرح کے تھپہ وہ سارہ کے منہ
بھی مارے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس سے کہے
وہ کچھ سمجھتی عالیان کے کیے بعد دیگرے وہ جھنجھلائی
نے اس کی دنیا بجا کر رکھ دی۔ وہ قالین پہ لٹ گئی۔

”ایسا۔ ایسا سلوک کیا تھا اس نے میرے ساتھ“

اسے اچھی طرح یاد تھا اس نے کہا تھا کہ کل کو
جب تم کسی اور کے ساتھ زندگی گزارو گے تو تمہیں

جب میں نے اسے بتایا تھا کہ میں اس سے پیار کرتا
ہوں ایسے ہی تمہیں مارے تھے اس نے میری محبت کے
منہ پر۔
وہ چلا رہا تھا اور وہ روٹا بھول کر بے یقینی سے اسے
دیکھ رہی تھی۔

”میں عالیان سکندر۔ ایک کامیاب بزنس مین،
والدین کا لاکھ پانچا اور لاڈل بھی مگر یہ دنیا یہ کسی کے لاڈ
نہیں دیکھتی۔“

اسی کو کیا معلوم یہ کامیاب بزنس مین اندر سے کتنا
باکام انسان ہے محبت میں شکست خوردہ...

وہ اپنے نیم مارک کرے میں رانگ چپڑیہ جھولتا
اپنی ذات کا کھٹار سس کر رہا تھا یا شاید خود لڑائی پر اترا
ہوا تھا۔ اپنے ہی زخموں کے کھیر نوچتا۔

”اور یہ سارہ زبان ہے تو میری پھوپھی زاد، مگر
انتہائی بے خوف، بیڈ باقی، مل ہاتھوں میں لے کے
چمکتا ہوا۔“

جلے کیوں میرے پیچھے پر مٹی ہے یہ تھک ہے
کہ تمہیں ہی سے ہمارے والدین کی مرضی تھی کہ سارہ
اس گھر میں بیوہ کے آئے مگر بچپن کی خواہشات کو
بچپن کے ساتھ ہی رخصت کر دینے میں عقل مندی
ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں جوان نہیں
کرنا چاہیے۔ ورنہ بہت قصص کا اندیشہ ہوتا ہے۔

لب و لہجے میں ہو گئیں میں نے محبت کی تو مار کھائی
ذرا ہوا یہ ہی سارہ کے ساتھ ہوا اور ہونا بھی چاہیے
علاقہ محبت کرنا ہے اسے اسی بڑائی ہے ایک شخص جو
ایسا زندگی گزار چکا ہو محبت کر لیتا زندگی گزار لینے ہی
کے مترادف ہے نا تو ایک شخص جو اپنی زندگی گزار چکا
ہو اسے بول رہا کتنا چہ معنی دار وہاں میں نے پھیر کھائے
اور ساتھ طعنت بھی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا اس نے کہا تھا کہ کل کو
جب تم کسی اور کے ساتھ زندگی گزارو گے تو تمہیں

جب میں نے اسے بتایا تھا کہ میں اس سے پیار کرتا
ہوں ایسے ہی تمہیں مارے تھے اس نے میری محبت کے
منہ پر۔

وہ چلا رہا تھا اور وہ روٹا بھول کر بے یقینی سے اسے
دیکھ رہی تھی۔

”میں عالیان سکندر۔ ایک کامیاب بزنس مین،
والدین کا لاکھ پانچا اور لاڈل بھی مگر یہ دنیا یہ کسی کے لاڈ
نہیں دیکھتی۔“

اسی کو کیا معلوم یہ کامیاب بزنس مین اندر سے کتنا
باکام انسان ہے محبت میں شکست خوردہ...

وہ اپنے نیم مارک کرے میں رانگ چپڑیہ جھولتا
اپنی ذات کا کھٹار سس کر رہا تھا یا شاید خود لڑائی پر اترا
ہوا تھا۔ اپنے ہی زخموں کے کھیر نوچتا۔

”اور یہ سارہ زبان ہے تو میری پھوپھی زاد، مگر
انتہائی بے خوف، بیڈ باقی، مل ہاتھوں میں لے کے
چمکتا ہوا۔“

جلے کیوں میرے پیچھے پر مٹی ہے یہ تھک ہے
کہ تمہیں ہی سے ہمارے والدین کی مرضی تھی کہ سارہ
اس گھر میں بیوہ کے آئے مگر بچپن کی خواہشات کو
بچپن کے ساتھ ہی رخصت کر دینے میں عقل مندی
ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں جوان نہیں
کرنا چاہیے۔ ورنہ بہت قصص کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اس بچپن پر ہنسی آئے گی۔ اس کی آنکھیں دکھ کی
شدت سے جلنے لگیں۔
”میں تمہیں بتاؤں گا میں قول ہارنے والوں میں
سے نہیں ہوں تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے یہ
زندگی تمہاری ہی یاد میں گزرنے کی۔“ اس کی آنکھوں
میں لالی اتر آئی تھی۔

”یہ شریا خالہ بھی نا! ذرا اچھے رائے نہیں بنائیں
یلا!“ وہ فقط چھٹی والے روز راضا کھاتا تھا۔ مگر وائے
قسمت! جتنا اسے پر راضا اچھا لگتا تھا اتنا ہی شریا خالہ برا
بناتی تھیں۔

”تو بیٹائی! اس کا میت آسمان ساحل ہے۔“ وہ
اپنے قریش اور نجس کا گھونٹ بھر کے گلاس رکھتے
ہوئے بولے۔

”وہ کیا؟“ وہ پراٹھے والی پلیٹ پر سے کھسکاتے
ہوئے اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

”دوبی سہل شادی۔“ وہ آرام سے بولے
عالیان سنبھلا۔

”تو کر لیں نا یلا! میری طرف سے آپ کو پوری
اجازت ہے میں ان بیٹوں میں سے بالکل بھی نہیں
ہوں جو آپ کو کچھ بھی کرنے کی آزادی نہیں دیتے۔“
وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”شٹ آپ! میں تمہاری بات کر رہا ہوں
گدھے!“ وہ ہنسے عالیان نے پراٹھے والی پلیٹ دوبارہ
اپنی طرف کھینچی۔

”جی۔ اب خالہ اتنے بڑے پراٹھے بھی نہیں
بناتیں کہ بڑھاپی زندگی برباد کرنے کی سوچے لگے۔“

”سوچو عالیان سکندر! سوچو“ میں برس کے ہو گئے
ہوں۔ اس عمر میں میری گود میں تمہیں آئے دو برس
ہو گئے تھے۔“ انہوں نے طنز کیا۔

”آپ کو ہی جلدی تھی گلے میں پھندا ڈالنے کی۔“
وہ اطمینان سے بولا۔

”اس بات کا مجھ کو بھی احساس تھا۔ جمعی قوتانی جلدی آزاد کر گئی اس پھندے سے۔“ وہ اور اس سے ہونے لگے۔

”وہ تو آپ پھر سے اپنی واسطوری لے کے بیٹھ گئے۔ ہم کچھ اور باتیں کر رہے تھے۔“ وہ جلدی سے ان کا دھیان پٹانے کو بولا۔

”ہاں۔ تمہاری شادی کی۔“
”نہیں۔ خالہ ثریا کے برے پرانوں کی۔“ وہ مکر گئی۔

”یورمت کرو یا راکوئی رونق میل لگاؤ گھر میں۔ تمہارے دس بارہ بچے اس گھر میں اچھلے کودیں میرا بھی دل بٹلے۔“ وہ اس کے کپے بارتے۔

”دس بارہ بچے۔ یعنی تین چار بیویاں؟“ اس نے بھنوسیں اچکا کیں تو وہ ہنس پڑے۔
”یہ تم پر منحصر ہے اچھے تو بس دس بارہ بچے چاہئیں۔“

”یہ تو کب نے اپنی مرتبہ سوچنا تھا اس میں تو منصوبہ بندی والوں کے منصوبے نکل نہیں کر سکتا وہ بھی اتنی بے جگری سے کہ اکتیس دس بارہ۔“ وہ بہت دنوں کے بعد در بلیکس موڑ میں تھا۔

”نہیں۔ کوئی میٹشن نہیں ایک ایک کر کے بھی دس بارہ جمع کر سکتے ہو تم۔“ انہوں نے اسے قلی دی تھی۔

”ایک اور ایک بھی گیارہ ہوتے ہیں۔“ اس نے یاد دلائی کر لگی۔

”مگر وہ حقیقت فتنہ۔“ وہ بھی اس کے باپ تھے۔
”چلیں۔ آپ کی طرح دوسرے کے بعد قتل اشاپ تو نہیں ہو گا نا؟“ وہ اب کی بار اپنی بات کہہ کر بیٹھے لگا تھا اور اتنے دنوں کے بعد یوں ہلکے پھلکے موڑ میں باتیں کرتا وہ انہیں بہت اچھا لگا۔

”تو پھر سارہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“ انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ تو وہ بھی ان ہی کے سے انداز میں بولا۔

”ہاں۔ اچھا ہے۔“
”یعنی کہ تم اس سے شادی کر سکتے ہو؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”نہیں۔ اب اتنے بھی اچھا نہیں ہے کہ اس سے شادی ہی کر لی جائے۔“

”بات کو مذاق میں نہ بناؤ۔“ وہ خفا سے ہو سکتے تھے اور عالیان سنجیدہ۔

”آپ جانتے ہیں میں مذاق نہیں کر رہا یا! ہم ایک بہت اچھی اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔“

”تمہارے خیال میں۔“ انہوں نے اسے برا تھا وہ ٹھنکا۔

”میرے خیال میں تو ہم دونوں ہی بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں یا! اس نے مجھ سے ہونے لگے۔“

”یہ نارمل انسانوں جیسی زندگی نہیں ہے علی گھر سے آؤ اور اس سے گھر بیچ میں ایک آدمی سے ملاقات اور میں۔“ انہوں نے اسے کھراک۔

”تھراؤ نہیں نہ ہوں تو میں سیسلی کوں گا یا! رقی بھر بھی اعتراض نہیں ہے۔ کب چاہیں۔“

”سے اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ کوئی کپ دیکھو کہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ آپ فلفلی اینٹ ہیں۔ وہ بڑی بے نیازی سے کہتا انہیں قصہ دلا گیا۔

”ہر بات مذاق نہیں ہوتی عالیان!“
”مذاق کون کر رہا ہے! میں بالکل سیریس ہوں۔ جہاں تک بات سے شادی کی تو وہ میں ابھی نہیں کر رہا سارے تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ قطعیت سے بات تھا۔ کئی لمحوں تک تو وہ سارے لفظ ہٹو لے رہے تھے اسے دیکھتے رہے۔

”سارہ میں کیا برائی ہے؟“
”یہ میں نے کب کہا مگر وہ مجھے سوٹ نہیں کرتی بہت بچکانہ پن ہے اس میں۔ مجھے میچور لڑکیاں بہتر لگی ہیں۔“ وہ جیسے کسی پروڈکٹ کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔

”شادی کے بعد لڑکیاں میچور ہوتی جاتی ہیں۔“
”انہوں نے اب کی بار اطمینان سے کہا۔
”مگر میں فیضان شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ آہستہ آہستہ جھجھکاؤ لگا تھا۔
”تم مجھے کوئی خوشی نہیں دینا چاہتے۔“ وہ بگڑنے لگے۔

”یہ میں نے کب کہا؟“
”تو پھر جو میں کہہ رہا ہوں وہ خاموشی سے مان کیوں نہیں لیتے فیضان کے بعد تو مجھے اس گھر سے خوشیاں روکنے کی ہیں۔ اسے دیکھو ماں کا کتنا فرماں بردار تھا یا

شاہد تھوڑی عمر لکھوا کے لیا تھا اسی لیے ساری خوشیاں دکھائی دیا ایک بار ہی اعتراض کیا ہو گا اس نے۔
”لوہر بچپن کا ہوا اور اس کی ماں اپنی ہو کو بیاد کے گھر لے آئی۔ یہ گھر کیسے خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ تم بھی تو کتنے خوش تھے۔“ وہ بے حد چنپاتی ہونے لگے تھے۔

”اور عالیان سکندر اس کی حالت عجیب سی ہونے لگی۔ وہ نہیں ماضی کے سکندر میں غوطہ لگانے سے روکتا رہتا تھا مگر صحت نہیں کر رہا تھا۔“

فیضان اس سے بڑا تھا پورے دس برس عمر کرتے اتنے فرق کے باوجود وہ فیضان کو اور فیضان اسے بہت یاد آتا تھا۔ واقعی ابھی وہ تعلیم سے فارغ ہو کر اس میں ہلنے لگا تھا کہ ماں نے بیٹے کے ”سیپول پر“ کھڑے ہونے کی خوشی میں اس کی شادی بھی طے کر دی اور وہ ماں کا کتنا فرماں بردار کہ ایک مرتبہ کے بعد دوبارہ

الطاف نہیں کیا تب ہی گھر وفاقوں سے بھر گیا تھا۔
”مجھے کیا اس گھر میں آئی جیسے گھر کا نقشہ ہی مکمل ہو گیا اس نے آتے ہی اپنے حسن سلوک اور میٹھی باتوں سے شوہر ہی کیا ساس مسرور و پور کا دل بھی

گھسیں کر لیا۔“
”جنگی پیاری اس کی شکل تھی اتنی ہی پیاری طبیعت۔“

”اور عالیان سکندر بھائی کا تو لڑا لڑا تھا ہی بھائی کو بھی

یارا ہو گیا اور عالیان نیانا فرسٹ ایر فیل اسے بچہ خود سے پانچ سال بڑی بھابی بہت اچھی لگتی تھی نا شتا کرانے، کھانا کھانے کے لیے فکر مندی سے بیچے بھاگتی۔ اور اسے میں فیضان جیسے مردانیک بندے کے ساتھ کئی ہلکے پھلکے سین عالیان کی نظر میں آتے رہتے تھے۔

فیضان کا بے خود ہو کر عہدہ کو کتنا اس کی اچھی ڈر سکتا ہر تعریفوں کے بل پائے خدا اور ایسے میں عہدہ کا سب سے بڑا چور اور شر مہو حیا۔۔۔
”میں بھی ایسی ہی کسی لڑکی سے شادی کروں گا۔“ عالیان نے بار بار سوچا تھا۔
”اور اوصرفیضان شاید تھوڑی ہی عمر لکھوا کے لایا تھا۔ شادی کے محض چار برس بعد ابھی جبکہ عہدہ کی گود بھی ہری نہ ہوتی تھی محض اکتیس برس کی عمر میں ان سب کو وہ تاجھوڑ گیا۔

رات کو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے سو جانے والا جانے کب سانس کا بندھن توڑ گیا اور وہ اس کے بازو پہ سوتی رہ گئی۔
ایک قیامت تھی کہ جس کا سامن تھا موت تو موت ہی ہوتی ہے مگر اس قدر جوان موت کہ خوشیاں ابھی جس کی منتظر تھیں اور وہ نئے سفر پر نکل گیا اور محض تین ماہ کے بعد ماں بھی اس صدمے میں خدا کو پیاری

یارا ہو گیا اور عالیان نیانا فرسٹ ایر فیل اسے بچہ خود سے پانچ سال بڑی بھابی بہت اچھی لگتی تھی نا شتا کرانے، کھانا کھانے کے لیے فکر مندی سے بیچے بھاگتی۔ اور اسے میں فیضان جیسے مردانیک بندے کے ساتھ کئی ہلکے پھلکے سین عالیان کی نظر میں آتے رہتے تھے۔

فیضان کا بے خود ہو کر عہدہ کو کتنا اس کی اچھی ڈر سکتا ہر تعریفوں کے بل پائے خدا اور ایسے میں عہدہ کا سب سے بڑا چور اور شر مہو حیا۔۔۔
”میں بھی ایسی ہی کسی لڑکی سے شادی کروں گا۔“ عالیان نے بار بار سوچا تھا۔

”اور اوصرفیضان شاید تھوڑی ہی عمر لکھوا کے لایا تھا۔ شادی کے محض چار برس بعد ابھی جبکہ عہدہ کی گود بھی ہری نہ ہوتی تھی محض اکتیس برس کی عمر میں ان سب کو وہ تاجھوڑ گیا۔

رات کو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے سو جانے والا جانے کب سانس کا بندھن توڑ گیا اور وہ اس کے بازو پہ سوتی رہ گئی۔
ایک قیامت تھی کہ جس کا سامن تھا موت تو موت ہی ہوتی ہے مگر اس قدر جوان موت کہ خوشیاں ابھی جس کی منتظر تھیں اور وہ نئے سفر پر نکل گیا اور محض تین ماہ کے بعد ماں بھی اس صدمے میں خدا کو پیاری

یارا ہو گیا اور عالیان نیانا فرسٹ ایر فیل اسے بچہ خود سے پانچ سال بڑی بھابی بہت اچھی لگتی تھی نا شتا کرانے، کھانا کھانے کے لیے فکر مندی سے بیچے بھاگتی۔ اور اسے میں فیضان جیسے مردانیک بندے کے ساتھ کئی ہلکے پھلکے سین عالیان کی نظر میں آتے رہتے تھے۔

فیضان کا بے خود ہو کر عہدہ کو کتنا اس کی اچھی ڈر سکتا ہر تعریفوں کے بل پائے خدا اور ایسے میں عہدہ کا سب سے بڑا چور اور شر مہو حیا۔۔۔
”میں بھی ایسی ہی کسی لڑکی سے شادی کروں گا۔“ عالیان نے بار بار سوچا تھا۔
”اور اوصرفیضان شاید تھوڑی ہی عمر لکھوا کے لایا تھا۔ شادی کے محض چار برس بعد ابھی جبکہ عہدہ کی گود بھی ہری نہ ہوتی تھی محض اکتیس برس کی عمر میں ان سب کو وہ تاجھوڑ گیا۔

رات کو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے سو جانے والا جانے کب سانس کا بندھن توڑ گیا اور وہ اس کے بازو پہ سوتی رہ گئی۔
ایک قیامت تھی کہ جس کا سامن تھا موت تو موت ہی ہوتی ہے مگر اس قدر جوان موت کہ خوشیاں ابھی جس کی منتظر تھیں اور وہ نئے سفر پر نکل گیا اور محض تین ماہ کے بعد ماں بھی اس صدمے میں خدا کو پیاری

یارا ہو گیا اور عالیان نیانا فرسٹ ایر فیل اسے بچہ خود سے پانچ سال بڑی بھابی بہت اچھی لگتی تھی نا شتا کرانے، کھانا کھانے کے لیے فکر مندی سے بیچے بھاگتی۔ اور اسے میں فیضان جیسے مردانیک بندے کے ساتھ کئی ہلکے پھلکے سین عالیان کی نظر میں آتے رہتے تھے۔

فیضان کا بے خود ہو کر عہدہ کو کتنا اس کی اچھی ڈر سکتا ہر تعریفوں کے بل پائے خدا اور ایسے میں عہدہ کا سب سے بڑا چور اور شر مہو حیا۔۔۔
”میں بھی ایسی ہی کسی لڑکی سے شادی کروں گا۔“ عالیان نے بار بار سوچا تھا۔
”اور اوصرفیضان شاید تھوڑی ہی عمر لکھوا کے لایا تھا۔ شادی کے محض چار برس بعد ابھی جبکہ عہدہ کی گود بھی ہری نہ ہوتی تھی محض اکتیس برس کی عمر میں ان سب کو وہ تاجھوڑ گیا۔

رات کو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے سو جانے والا جانے کب سانس کا بندھن توڑ گیا اور وہ اس کے بازو پہ سوتی رہ گئی۔
ایک قیامت تھی کہ جس کا سامن تھا موت تو موت ہی ہوتی ہے مگر اس قدر جوان موت کہ خوشیاں ابھی جس کی منتظر تھیں اور وہ نئے سفر پر نکل گیا اور محض تین ماہ کے بعد ماں بھی اس صدمے میں خدا کو پیاری

یارا ہو گیا اور عالیان نیانا فرسٹ ایر فیل اسے بچہ خود سے پانچ سال بڑی بھابی بہت اچھی لگتی تھی نا شتا کرانے، کھانا کھانے کے لیے فکر مندی سے بیچے بھاگتی۔ اور اسے میں فیضان جیسے مردانیک بندے کے ساتھ کئی ہلکے پھلکے سین عالیان کی نظر میں آتے رہتے تھے۔

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسید سلیم قریشی کے 3 دیکشن ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ بھی بیوی والی سی	500/- روپے
آرزو گھر آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

پہلی مگرانے کے لیے نئی کتاب ڈاک فرج 450/- روپے

مگرانے کا پتہ:
آسید سلیم قریشی، ڈی جی ٹی، فون نمبر 32735021

ہو گئی تو پیچھے رہ جانے والے تینوں نفوس گم صم سے
تھرا کی رشتا کو سمجھتے رہ گئے۔

اور عالیان کو اچھی طرح یاد تھا وہ دن جب عمیمہ
نے پلایا سے واپس گھر جانے کی بات کی تھی۔ پلایا تو
ساکت رہ گئے مگر عالیان کو کیا ہوا تھا ساڑھے انیس
برس کا وہ لڑکا بالکل خود بولنے کی طرح روئے چلا گیا۔
وہ خود بھی روئے لگی۔ تب وہ شانت ہو گیا۔ اسے لگا
کہ اب وہ رُک جائے گی۔ کبھی واپس نہیں جائے گی۔
اپنی ماں کے علاوہ اس نے عمیمہ ہی کو محرومت کے
دوب میں اس گھر کو سمیٹتے دیکھا تھا اب وہ اسے کبھی
کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اسی احساس میں اسے پتا ہی
نہیں چلا کہ عمیمہ کے پار کو وہ کس رشتے لے جا رہا
ہے۔ وہ واپس نہیں لگی مگر پھر والدین کے مجبور کرنے
پر وہاں لگی تو سکندر عمر بھی اس پار کچھ نہ بولے۔

کس رشتے؟ کس برتے پر اسے روکتے جس سے
محرم کا رشتہ تھا وہ ہی نہ رہا تو جوان لڑکی کو کس رشتے
سے روکے رکھتے اس کے سامنے ابھی پوری زندگی
پڑی تھی مگر اس نے کوئی سو امنوں نے اسے جانے کی
اجازت دے دی۔

مگر عالیان نے جب سنا تو وہ ساکت رہ گیا اور پھر
جیسے پاگل ہو گیا۔ پلایا نے اسے بت سمجھایا۔ لوگوں کی
سوچ بتائی مگر وہ سب کچھ سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پارہا
تھا۔

”میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔“ وہ غم آنکھیں
لیے اس کے کمرے میں چلا آیا۔

وہ ابھی ہنساکے لگی تھی ڈرائیو سے پل خشک کر رہی
تھی۔ بناوٹے کے اپنے دھیان میں مگن تھی تب ہی
دروازہ کھلنے کی آواز نہیں آئی۔ آئینے میں عالیان کو
دیکھا تو گڑبڑا کر ڈرائیو آف کر کے رکھا اور پلٹ کر
جلدی سے بیڑ پر راہ پٹا اٹھا کر اوڑھا۔

اور وہ جو گئے کیا تھا بھول کر یک تک اسے دیکھے
گیا۔

”دروازہ ناک کے بغیر اندر آنا تہذیب کے خلاف
ہے۔“ وہ توجہ انداز میں بولی۔

”آپ جارہی ہیں؟“ عالیان کسی خواب
چونکا۔

”ہاں۔“ وہ تکیف و سے احساس میں
اپنے ہاتھوں کو ریزینڈ میں بکڑنے لگی۔

”آپ مت جائیں“ ہمیں رہیں ہمارے پاس۔
جذباتی ہونے لگا۔

”نہ ممکن نہیں ہے علی! مجھے جانا ہی ہو گا۔ ماری
میں اس گھر میں تو نہیں رہ سکتی ہوں۔“

وہ بمشکل خود پر قابو پائے ہوئے تھی وہ کسی فیصلے
کی یادوں کو سینے سے لگائے بس یوں ہی زندگی گزارنے
کا تہیہ کیے ہوئے تھی مگر اس کے والدین اس کی
واپسی پر مصر تھے اور وہ ان کا کناٹا نہیں سلکتی تھی۔
”آپ انکار کریں اپنے اپنی“ ابو کو ہم یہاں سے
خوش ہیں۔“

”خوشی اب کہاں اب تو محض زندگی گزار رہی ہے
اور زندگی تو ہمیں بھی نزاری جاسکتی ہے۔“ وہ سوچنے
پھیلنے انداز میں مسکرائی۔
”میں انہیں انکار نہیں کر سکتی علی!“

”میں آپ کی عادت ہو چکی ہے ہم کیسے رہیں
گے؟“ وہ برا فروخت ہونے لگا۔ عمیمہ کا ہاتھ اس
اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”عادتوں کو بدلا بھی جاسکتا ہے عالیان! اور چند دنوں
یا مہینوں کی بات ہے ہم بھول بھی جاؤ گے۔“ وہ چل
بوڑھ کر رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے سختی سے کہتے ہوئے نفی میں
سر ہلایا۔

”یہ سمجھی نہیں ہو سکتا میں آپ کو کبھی
سکھ آپ جانتی ہیں آپ میری آئیڈل ہیں۔“

”ہم رابطے میں رہیں گے عالی! آفون“۔
”ہٹ“ اب تو دوری بھی دوری نہیں رہی۔“ وہ کہ
تکی دے رہی تھی۔

”نہیں۔ آپ یہاں سے کیس نہیں جائیں
گی۔“ وہ اٹل جیسے میں بولا۔

تو اس کے انداز عمیمہ کو الجھن میں مبتلا کرنے

مجھے خود اس کے لگاؤ سے وہ اچھی طرح واقف
تھی مگر وہ عمر کے اس حصے میں تو تھا جی کہ اس کی
مجبوری کو سمجھ سکتا۔

”مجھے جانا ہی ہے عالیان! اور یہ بات طے ہے۔“
اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں کی رفت سے نکالتے ہوئے وہ
دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

بے حد تنیدہ اور کچھ رکھائی سے کہنے الفاظ نے
عالیان کو چوکا پھینکا تھا۔

”آپ یہاں خوش نہیں ہیں؟“
”میری خوشی فیضان تھا علی! تم لوگوں کے ساتھ
میں رہ تو رہی ہوں مگر جو میری زندگی تھا وہ ہی نہیں رہا تو
میں کھوکھلے فتنے و حقیقت خوشی نہیں کھلا سکتے۔“ وہ
دکھ کی دھند میں گھرنے لگی۔

”اور میں؟“ وہ بے باکی سے پوچھنے لگا۔
”تم؟“ وہ تھکی۔

”ہاں آپ میرے لیے یہاں نہیں ٹھہر سکتیں۔“ وہ
اجازت دے رہا تھا۔

”تکلی دہیو۔ آپ جانتی ہیں۔“
”مجھے بھی تم بہت پارے ہو عالیان! مگر تمہاری
کو سمجھ نہیں رہے۔ بے وقوفی میں زندگی نہیں گزارتی“
بت سے مشکل ڈھیلے بھی کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ اسے
بھلاتے ہوئے بولی مگر وہ ابھی اسی نکتے پر تھا۔

”میں واقعی میں آپ سے محبت کرتا ہوں
عمیمہ! آپ کی بار عمیمہ کو مجھ کا لگا تھا۔“

وہ اسے مت کم بھائی کہہ کر ملتا تھا۔ زیادہ تر آپ
طلب ہی سے کھل چلا لیتا تھا۔ مگر اس طرح بد تمیزی
سے اس کا ہٹ نہیں لیتا تھا۔ وہ کھٹکا کھادی۔ اور
بڑھ چیدی سے بولی۔

”تم نے خود ثبوت دے دیا کہ اب ہمارا رشتہ وہ
نہیں رہا عالی! تم مجھے بھائی بھی نہیں کہنا چاہتے۔“

”ہاں۔“ ہمیں کہنا چاہتا۔ مگر میں ہمیشہ کے لیے
آپ کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں“ اسی گھر میں۔“ وہ
بالکل گرجا تھا۔

”نہت آپ عالیان!“ وہ گاؤاری سے بولی۔ اسے

کچھ غلط ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔
”اب تم جاؤ“ مجھے اپنی پیکنگ کرنی ہے۔ کل ایو
مجھے لینے آ رہے ہیں۔ پلایا سے اجازت میں لے چکی
ہوں۔“ وہ ایک دم اجنبی سی بن گئی تھی۔

”اسی بھی نہیں“ آپ بھی نہیں ہوں گی تو ہمارا کیا
ہو گا؟“ وہ حواس باختہ ہو گیا۔

عمیمہ کو اس پر ترس آنے لگا اور بار بھی بھائی
اور ماں کے مرنے کے بعد تو وہ بالکل ہی بچپن گیا تھا اور
عمیمہ نے بھی اسے یوں ہی سمیٹا تھا کسی تھکے بچے کی
طرح۔ مگر اب زندگی ایک نئے رخ پر چل پڑی تھی۔

جسے بدلنے سے وہ خود بھی قاصر تھی۔
اس کے ماں باپ اسے یوں زندگی برباد کرنے کی
اجازت دینے والے نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے اگلے دو
چار برسوں میں وہ اسے پھر سے یاد دیتے ابھی وہ محض
چھبیس برس کی تھی۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا۔ چند دن مشکل ہوگی پھر سب
سیٹ ہو جائے گا۔ خالہ ثریا سوٹ کوارٹس میں آگئی
ہیں اپنی فیملی کے ساتھ۔ انہیں میں نے سب سمجھا دیا
ہے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی تو وہ بے یقینی سے
اسے دیکھنے لگا۔

”آپ واقعی جلی جائیں گی؟“
”عالیان! مجھے تنگ مت کرو۔“

”پلیز۔ عمیمہ! پلیز۔“ وہ دفعتاً گڑ گڑانے لگا۔
عمیمہ سر تپان ہو سکی آگ میں جل اٹھی۔

”نہت آپ عالیان! جبراً جو تم نے میرا نام پکارا تو“
جاؤ یہاں سے۔“

”نہیں۔ پہلے تم کو کہہ دو واپس نہیں جاؤ گی۔“ وہ
پاگل لگ رہا تھا۔ عمیمہ کے حواس ٹھہر گئے۔

”عالی! یوں بات کرو گے اب مجھ سے؟“ وہ ایک دم
سے بار کر ٹھکت خود وہ سا گھنٹوں کے بل اس کے
سامنے گر سا گیا۔

”آئی لو! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں“
تمہارے بغیر وہ نہیں سکا مجھے چھوڑنے کے مت جاؤ۔“

وہ اس کے لیے رو کھڑا آیا اس کے پاؤں بھی پڑ گیا۔

مکرمہ لے میں عہدہ سے اسے کیا گیا۔
 چھٹے تین چھٹے جن کی جگہ آج بھی وہ اچھی
 طرح محسوس کر سکتا تھا اور ایک طعنہ۔

نکل کو جب اپنی خوب صورت سی بوی کے ساتھ
 زندگی گزارنے کو تیار ہوئے تو قیام کر کے فرسنگ
 اور پھر وہ تو پہلی ہی مگر یہ طعنہ عالمیان سکندر کے دل
 میں تیرہن کے پوسٹ ہو گیا۔

”وہ کیا سمجھتی تھی کہ میں اس سے محبت کا ٹانگ
 کر رہا ہوں یا میری محبت میں کوئی کھوٹ ہے۔ میں
 اسے دکھاؤں گا کہ میں پوری زندگی اس کے نام پہ بیٹھ
 سکتا ہوں۔ اس ”بے وقوفی“ پہ ہنسنے کے بجائے میں
 اسے پوری زندگی پہ محیط کرنا چاہتا ہوں۔ جو وہ بھی وہ
 کوئی اور عورت نہیں ہو سکتی۔“

عالمیان سکندر نے پھر بڑے انداز میں سوچ لیا تھا۔
 وہ طبعی تھی۔ مگر عورتوں کو اس کے لیے شجر
 ممنوع بنائی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ جانے کتنے سالوں کا سفر
 کر آیا تھا۔

ابو اسب یہ سارہ زمان اس نے دانت پیسے اس کی
 انکوئی پھوپھو کی نازوں میں بی بی اس کی جان بھی کو انکی
 تھی یہ ٹھیک ہے کہ سب کی خواہش تھی کہ وہ عالمیان
 کی بیوی بن کے اس گھر میں آئے مگر اسے یہ بھی تو
 سوچنا چاہیے کہ عالمیان ایسا نہیں چاہتا۔

گزرے دس برسوں میں اس کے مزاج میں بہت
 بڑی تبدیلی آئی تھی۔ وہ خوابوں میں جینے والا دنیا تک
 سالز کا ایک آس برگ بن گیا تھا۔ ایک کلیشہ یا پھر تندر
 مزاج مضمون میں پھرنے والا۔

”اور اب یہ پیلہ۔۔۔ اس نے مہری سانس بھر کے خود
 کو دیکھ لیا۔“

”میں ہمیشہ آپ کو خوش رکھنا چاہتا ہوں پیلہ!“ وہ
 نرمی سے بولا۔

”تو پھر تم سارہ سے شادی پہ راضی ہو؟“ وہ بے حد
 خوش ہو گئے۔

”ہاں۔۔۔ مگر میری ایک شرط ہے۔“ وہ کچھ سوچتے
 ہوئے مسکرایا۔

”ہر شرط منظور ہے تخت جگر۔“ وہ شش ہوئے
 ”یہ شادی تب ہی ہوگی جب پہلے سارہ سے
 رضامندی لی جائے گی۔ اور آپ اس سے خود پوچھیں
 گے پیلہ! پھوپھو نہیں۔“

وہ اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر چکا تھا۔
 ساتھ ہی اس کے سامنے اپنی کم کشتہ محبت کا اعتراف
 بھی۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ نازوں میں اس خادو اور در
 پر قدم ڈالتی۔ سو وہ مطمئن تھا اس کے بعد دعا۔۔۔ یہی اپنی
 رضامندی دے دی۔

”اے میں خود پوچھوں گا سارہ سے۔ حالانکہ
 سب ہی کو پتا ہے کہ وہ ہمیں بہت پسند کرتی ہے۔“
 اب سکون تھے۔

”سکندر کا کیا بے پناہ بولوں میں بدلتی ہے ہو سکتا ہے
 وہ بھی کسی اور ”مہیو“ کو پسند کرنے لگی ہو۔“ وہ ہنس
 ذہن ہکا بھکا ہو چکا تھا۔ اسے دھیان آیا ایک بڑے
 پہلے ہی تو اس نے اپنی راہ صاف کی تھی۔ اب تو وہ
 عالمیان کے سامنے کپاس بھی نہ آتی۔

پیلہ آج پھوپھو کے گھر سے ہو کے آئے تھے۔
 عالمیان نے ان کے چہرے سے کچھ اندازہ لگا چکا کہ
 تب ہی ان کے مہیاں پہ کل آئی تو وہ اٹھ کر بھاگ کر
 گئے۔

وہ مطمئن سے اسپورٹس چینل پہ کارڈیں دیکھنے
 میں مگن ہو گیا۔ اگر کچھ زیادہ سیریس ہو تا تو وہ آئے ہی
 بات کرتے تو کب آئے اس کے پاس بیٹھے عالمیان
 خبر بھی نہیں ہوئی۔

”کیا پور کر رہے ہو یا رائیو ڈانگاؤ۔“ انہوں نے کہا
 چونکہ کروہ مسکراؤ اور یہ موت لان کی طرف بڑھتا
 ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں نے تمہیں توجہ دے کو نہیں کہا۔“
 ”تینہ آ رہی ہے پیلہ! صبح ویسے بھی اسلام آباد۔“

”وہ کچھ کہہ رہا تھا۔“
 ”تھوڑی دیر میں کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ بولا۔

ان کے اثرات پر غور کرنا وہ بیٹھ گیا۔
 کیا خبر سارہ نے پورا واقعہ بھی سنا دیا ہو۔ معذرت
 کے۔

”ج میں سارہ سے ملے گیا تھا۔“ وہ سنجیدہ تھے اور
 عالمیان تھوڑا سا پریشان ساری بات کو پتا کو پتا نہیں چٹنا
 چاہے تھی۔ ہاں بس وہ عالمیان سے شادی سے انکار
 کر دیتی اینڈ ڈس آل۔

”کیا پیلہ! وہ سر جھکا کے بیٹھ گیا۔“
 ”میں نے خود اس سے پوچھا تھا تم سے منقطع۔“

وہ بات کرتے کرتے رکے پھر پوچھنے لگے۔
 ”تم تو بولی کی کوئی لڑائی ہوئی ہے؟“ وہ ہمیں بہت برا

بھلا کہہ رہی تھی؟
 ”نہیں تو۔۔۔ وہ مگر گیا۔ وہ بھی تو سب چھپائی تھی۔“
 ”اچھا۔۔۔ بہر حال وہ پورے دل سے راضی ہے اس
 شادی کے کوئی اعتراض نہیں۔“

وہ اطمینان سے کہنے لے جھکے سے اڑا گئے۔ منہ
 اٹھائے وہ بے وقوفوں کی طرح ان کا جملہ دہی کوڈ کر رہا
 تھا۔

”کیا بات ہے یقین نہیں آ رہا؟“ وہ ہنسے۔
 ”آئی ڈونٹ کیوڈس۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”اب اتنے بڑے بھی نہیں ہو یا را۔“ انہوں نے
 ٹانہ جھپٹتے ہوئے کہا اسے حوصلہ دیا تھا۔ مگر وہ اتنی
 لیڈن میں تھا کہ مسکرا بھی نہیں سکا۔

”آپ نے خود پوچھا تھا یعنی اس نے خود آپ کو
 بول دیا پھوپھو کے ذریعے کہلوایا ہے؟“

”مگر قن علی کہہ تو رہا ہوں کہ میں نے آئے
 سامنے بیٹھ کے اس سے پوچھا ہے اور اس نے صاف
 منقطع میں کہا ہے کہ وہ اپنی دل کی خوشی میں خوش ہے
 اور یہ بھی کہ اسے اس شادی پہ کوئی اعتراض نہیں۔“

وہ بعد مضمون تھے۔
 بہت عرصے کے بعد اس گھر کی دو لقیں لوٹنے والی
 تھیں۔ فیضان اور عہدہ کے بعد تو یہ گھر بھی اور
 قنعلی کو ترس گیا تھا۔ اور ان کی نصف بہتر جو دل
 جہاں سے گئی تھی وہ تو بھی مٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر

اب تو ان کی بچوں کی خوشیوں میں انہیں اپنی خوشیوں
 ملا تھی۔ انہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”مجھے فینڈ آ رہی ہے۔“

”لب یاد رکھنا میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ کل
 اسلام آباد سے ہو کے آؤ تو میں سفینہ سے شادی کی
 تاریخ مانگوں گا۔ مفتی و مفتی کا لبا پکڑ نہیں رکھنا۔“ وہ
 سب سے کیے ہوئے تھے۔

اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ فی الحال مفتی بی کا پکڑ
 چلائے گا۔ شادی تک کے پیرٹ میں وہ سارہ سے کسی
 طریقے سے جان چھڑا سکتا تھا۔ مگر تو اس کی ساری
 راہیں مسدود کیے دے رہے تھے۔ بہت بڑے موڈ کے
 ساتھ وہ اپنے کمرے میں آیا تو لفظ بھر کو وہ نوں پسیلیوں
 پہ ہاتھ جھانکے وسط میں کھڑا رہا۔

جی چاہ رہا تھا ہر شے کو ٹھوکر دے رکھ لے۔ تمس
 نہیں کر دے۔ وانتوں پہ دانت جھانکے وہ بمشکل خود کو
 کنٹرول کر رہا تھا۔

”تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی سارہ زمان! مجھ سے
 بڑھ گئے کی۔ لکنا میں نے تمہیں جو ٹیڑھ دکھایا ہے
 وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔“ اسے در حقیقت سارہ
 سے دشمنی ہو گئی تھی۔

شروع ہی سے وہ عالمیان کے لفٹ نہ کر دینے پر بھی
 اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔ وہ جس قدر
 جھنجھلاؤ آتا تھی وہ انجوائے کرتی تھی۔ مگر وہ ساری
 عمر کے لیے سر منڈھ دی جائے گی یہ اس نے بھی سوچا
 بھی نہیں تھا۔

اس کی زندگی میں سارہ تو ایسا کسی بھی عورت کی کوئی
 جگہ نہیں تھی۔

اس کے اسلام آباد سے لوٹنے ہی واقعی پیلہ نے
 پھوپھو سے شادی کی تاریخ مانگی تھی۔
 ”قار گارڈ سیک پیلہ! اتنی جلدی کیا ہے یہ پیندا
 ڈالنے کی۔“ وہ جھنجھلائی ہو گیا۔

ایک دھشت لا محدود تھی جس کا وہ شکار تھا مگر کوئی

کیا سمجھتا۔
 "تو زندگی کا کیا بھروسہ، جلدی جلدی خوشیاں
 دیکھ لینی چاہئیں۔" وہ آرام سے بولے۔
 "میں اتنی جلدی مرے والا نہیں ہوں۔" وہ غصے
 سے بولا، "میرا کی زندگی پر رگت دیکھ کر فوراً ہی اس
 کا غصہ عتاب ہو گیا۔"
 "سوری پلایا!"
 "مگر تم شادی نہیں کرنا چاہتے تو مت کرو، مگر
 آئندہ اس طرح کی فضول بات مت کرنا۔" وہ زور دے کر
 ہو رہے تھے، "عالیان نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان
 کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
 "آؤ ریشی سوری پلایا!" وہ ٹام لہجے میں بولا تو وہ
 خوش ہو گئے۔
 "ٹھیک ہے، بس اب تم شادی کی تیاریاں کرو،
 شاپنگ کرو اور اپنے تمام عزیز و اقارب کو بلانے کی
 سارے معاملات سمجھ کر چھوڑ دو۔"
 "اؤکے۔" وہ بار بار دہرایا تھا، مگر اس نے سارہ کو
 ایک کھل ضرور کی تھی۔
 "تم نے انکار کیوں نہیں کیا؟" پچھکار کر پوچھا گیا۔
 "جواب اس کا کچھ اتنی ہی شانت تھا۔
 "میں ماننے والوں کو خالی نہیں لٹا کرتی، ماسوں
 تمہارے لیے مجھے ماننے آئے تھے۔" اس کے
 ٹکڑوں لگی سر پہ جا پھوٹی۔
 "شٹ اپ سارہ، زبان ادا توں کی بھوت ہو تم میں
 تمہیں اچھی طرح سے سمجھاؤں گا اس زبردستی کا نتیجہ
 بہت برا ہو گا۔"
 "مجھے دھمکیاں مت دو، اتنے ہی مرو تھے تو اپنے پلایا
 کو گھر پر روکتے نہ آتے دیتے تھارے ہاں۔" سارہ
 کے جواب نے اسے ہلکے سے اڑا دیا۔
 اس قدر فضول بات وہ کھول کر رہ گیا۔
 "تمہیں تو میں اچھی طرح بتاؤں گا کہ میں کتنا مرو
 ہوں سارہ، زبان! ڈانٹ نہیں کر سکتا تو وہ قدرے تسخیر
 سے بولی۔
 "اس گھر میں میرے ماسوں بھی رہتے ہیں، عالیان

سکندر! وہ تمہیں اتنا بھی منہ زور نہیں ہونے
 دے گی۔"
 "اور تم۔ کیا ہوگی اس شادی سے؟ عالیان نے
 کی نفرت؟ وہ سفالی سے اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔
 "تمہاری بیوی بن کے کوں کی تو تم سے محبت
 وصول کروں گی عالیان سکندر! وہ بیوی مطمئن تھی
 پتا نہیں کون سی مردانہ بی کے بیٹھی تھی۔ سکندر
 ہوئے عالیان نے لائن ٹنکٹنکٹ کر دی۔
 اس کے جود میں خون کی جگہ جیسے لاوا دوڑ رہا تھا۔
 کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس
 بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسولانی کی
 اسی شعر کے مصداق سارہ زبان بھی عالیان کو
 چھوڑنا چاہتی تھی۔
 ایک زبان جانتا تھا کہ عالیان کی شادی سارہ ہی
 ہونی ہے، پھر ایک دم سے اس دشت سے انکار کر
 بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔
 "سارہ! تم فقط بے وقوفی کر رہی ہو، کون کون
 جیل نہیں ہے، بھول جاؤ عالیان سکندر کو دینا بھی
 پڑی ہے ایسوں سے۔" یہ اس کی عزیز از جان دوست
 قاتلہ تھی۔ شادی کے بعد جو کینڈہ اچلی تھی مگر
 نے سارہ سے مسلسل رابطہ رکھا تھا۔ فون پر بھی اور
 انٹرنیٹ پر تو روز رات کو بھی چیٹنگ ہوتی تھی، ابھی
 وہ ان لائن تھی۔
 "تم جانتی ہو میں نے اپنی آؤمی زندگی بھاری
 سکندر کو سوچا ہے، اب دل کو کیسے کھرچوں؟" سارہ
 نے لکھا تھا۔
 "اور وہ جو تھیں بارے ہیں اس نے من سے
 ٹھکانے پر نہیں آیا؟" وہ یقیناً تھکے میں تھی۔
 "اسے کسی سے بے وفائی ملی ہے جانو!" سارہ
 اسے تسلی دی۔
 "شٹ اپ سارہ! اپنی زندگی براہِ راست کرنا
 کسی کو سچی شدت سے چاہ چکا ہے، بلکہ کسی

چاہتا ہے سچی تو تمہیں بھی شٹ نہیں کرا تا۔"
 "اس لوگے" سارہ نے مختصر لکھا۔
 "میں ناٹ او کے سارہ! جذباتی فیصلہ مت کرو،
 اسے کسی سے بے وفائی ہے تو اس کا یہ مطلب
 نہیں کہ وہ تم سے بدلہ لینا چاہو یا ساسی سلوک کرے
 جیسا اس نے عالیان کے ساتھ کیا تھا۔"
 "اور حقیقت سارہ کے اس فیصلے کے خلاف تھی اور
 پریشان تھی، پتا نہیں ہوئی تو اسے کبھی بھی اس اندھی
 تھالی میں چھلانگ نہ لگنے دیتی۔
 "اسے محبت کی ضرورت ہے، قاتلہ اور تم جانتی ہو
 بلکہ وہ بھی جانتا ہے کہ میں اس سے سچی محبت کرتی
 ہوں۔"
 "تجربہ ہی بہت زبردست جواب دیا ہے اس نے
 تمہاری محبت کا۔" قاتلہ کو غصہ آیا تھا۔
 "تجربہ اچھا ہی ہو گا یا میرا اسے سدھار لوں گی؟"
 "تم سارا جواب" سارہ نے لکھا تو جواب اسے نہیں کا
 "اسان پر سوچو، اور ساتھ میں الفاظ
 "تمہاری حقیقت پر۔" سارہ گری ماسوں بھر کے رہ
 گئی۔
 "مگر کیا کرتی؟ اس کے دل نے اس کے مقابل
 نہ کر رہی، بھاری دلت عالیان سکندر کے حق میں کرایا
 تو۔
 "اسے بے وفائی کسی سے ملی تھی وہ میری طرف
 نہیں کر گیا ہے۔" سارہ نے لکھا تو جواب آیا۔
 "اور وہ ساری زندگی ہی یہی کرتا رہے گا۔"
 "یہ تو ہے ہی تھا کہ میری ساری زندگی اس کے
 ساتھ زور سے ڈیر اور پھر جو اسے چھوڑ گئی ہے اس
 کو لایا گا خود کو۔" سارہ مطمئن تھی مگر قاتلہ نہیں۔
 "ایک بار پھر سوچو، سارہ! زندگی بچوں کا کھیل نہیں
 ہے، بگاڑتے پھر شروع کر لیا۔"
 "گوشت دوری، جمع تفریق، ضرب، سب کچھ کر کے
 دیکھتی ہو، جواب صرف ایک ہی آتا ہے۔"
 "محبت نہیں، بے وقوفی، تلی ایک ہاتھ سے نہیں

بچتی سارہ۔"
 "ہماری بھی جائے گی۔"
 "ہاں! اگر اس کا ہاتھ بھالو، تمہارا منہ تو جی ہی
 جائے گی۔" قاتلہ سگ رہی تھی۔
 مگر سارہ زبان کیا کرتی، جس کے دل میں بچپن ہی
 سے عالیان سکندر کی محبت نے گہر کر لیا تھا، اب تو اسے
 سوچے رہا تھا، لینا بھی دشوار لگتا تھا۔
 اور پھر وہ دن بھی آئی گیا کہ جب وہ بڑی شان و
 شوکت کے ساتھ اسے یہاں لے گیا۔
 "تو ہے،" وہ بے فکشتی میں عالیان سکندر جو
 ایک سیکند کو بھی مسکرایا ہو۔ "یہ سارہ کی بچاؤ تھی۔"
 "وہ ایسا ہی ہے سچیدہ مزاج۔" سارہ کی بڑی بہن
 نے محنت سے کہا۔
 "اور اوپر سارہ شوخ و چٹلی، بوڑھی خوب ہے کی،
 دیکھو کون کس سے پیار تک چڑھا رہا ہے۔" اس کی زبان
 خاصی منہ پھٹ تھی۔
 سارہ خاموشی سے سب کی سن رہی تھی۔ بڑی
 ڈھٹائی سے اپنے فیصلے پر ڈٹے رہنے کے بعد اب جبکہ
 وہ نکاح نامے پر سامن تھی کچل چکی تھی تو دل جانے کیوں
 ڈوب ڈوب جا رہا تھا۔
 عالیان کا مزشتہ وقت یاد آتا تو لگتا غلطی کر لیا۔ کبھی
 اس نے ماس کے ہاتھ کی تھی اور لوہر سارہ زبان نے
 ساری عمر کا نشانہ اس سے وابستہ کر لیا تھا۔
 مگر پھر اپنی محبت کی جیت کا خیال آتا تو دل فہم نے
 سا لگتا، "کو شش کیے بغیر ناکام ہو جانا یا شکست تسلیم
 کر لینا، ساری عمر کی خللیں دے دیتا ہے۔
 وہ مطمئن تھی کہ زندگی میں اپنی محبت تو پائی۔
 خوشبوؤں میں لپٹی عالیان سکندر کے لیے پور پور
 سجائے گلاب اور موشے سے بھی سج پر وہ بے قرعہ
 سے دھڑکتا دل لیے لگی تھی اور خوب صورت زندگی کی
 شروعات کے لیے تیار تھی۔ نگاہ بار بار کلائی پہ بندھی

گھڑی کی سونیلوں سے الجھتی بھلا رات کے دو بجنے کو تھے۔
 تھکن اور غم سے یو جھل آنکھوں سے اس نے والہ کلاک پہ نگاہ ڈالی تو اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔
 کلاک پہ گھڑی غلط ٹائم نہیں بتا رہی تھی۔
 اس صبح پر وہ ایک بجے سے بھیجی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹہ ہونے کو تھا اور عالیاں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس امید چھوڑ دیتی دوڑا نہ بے چارہ اور کوئی اندر آیا۔
 سارہ نے سنبھلتے ہوئے نگاہ جھکا لی تھی۔ وہ عالیاں ہی تھا۔
 دروازہ بند کر کے دھڑو دھڑا کرے کے وسط تک آیا۔ شہروانی اندر کے کرسی پر پہنچی اور آگے بڑھ کے ہاتھ بڑھایا اور بند سائیکل پہ لٹکی پھولوں کی لڑیوں کو بے دردی سے کھینچ کر توڑ ڈالا۔
 اس کے ہر پرانہ ازبے درشتی جھلک رہی تھی۔ سارہ کا دل سنبھل گیا۔ ان دو چھڑیوں کی یاد سے گال سنبھلنے لگا تھا۔
 ”اگر یہ آن بھی اسی وحشانہ پن پہ اتر آئے تو ہمیں تو کسی کو ڈانڈینے جوگی بھی نہیں۔“
 اس کی ریزہ کی بڑی میں اک سنسنی آمیز سی دوڑ گئی۔ وہ بند پڑ گیا۔ کھٹک کر جوتے اندر رہا تھا۔ سلیپر پینے پھر وائش روم میں گھس گیا۔ وہ جو سانس بھی سسم کر لے رہی تھی گھڑی سانس بھرتی سیدھی ہو بیٹھی۔
 پہلے ہی قدم پر احساس ہونے لگا تھا کہ کسی پر مسلط ہونا اور اس کی سربراہی کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔
 وہ ٹائٹ سوٹ پہنے ہوئے تھے سے چو خٹک کر تباہ ہر آیا۔ اوپر وہ ذات کے احساس میں گھری اس کا انتظار کر رہی تھی۔ فقیروں کی طرح کسی جھیک کا انتظار۔
 قلیہ کر سی کی پشت پر پھیلا کر وہ ڈرنک قہیل کے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اندر تو جانے کیا ندر رچا ہوا تھا۔ مگر نظا پرست اطمینان سے بل برش کیے۔
 وہ محضے میں تھی۔ اٹھ جانا چاہیے یا بیٹیں بہ شرموں کی طرح خستہ رہنا چاہیے۔ عالیاں کے رویے

میں کوئی چٹک نہیں تھی۔ وہ ہٹ کر بیڈ کی طرف آگیا۔ سارہ نے بے ساختہ ہی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔ بیٹھ اس سے بہت بے تکلفی سے والی سارہ اس سے نگاہ چرا گئی۔ ایک مسکراہٹ نے عالیاں کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔
 ”اب تک تو تمہارا شوق پورا ہو جانا چاہیے۔ میری بن کے میری بیچ پہ بیٹھنے کا۔“ الفاظ تو کھلے کانٹوں کی طرح سارہ کو چبے تھے۔ مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ بہت جلد سے عالیاں کو پرورش کرے گی۔
 ”اب تم یہاں سے اٹھ جاؤ کیونکہ میں جلد سولہ کاغذی ہوں۔“ وہ رکھائی سے کہہ رہا تھا۔
 سارہ کو ذات کا احساس ہوا۔ ”مگر یہ اس کا کیا فیصلہ تو تو اس کے فائدے اور نقصانات بھی اسی کے تھے۔ وہ انظار میں کھڑا تھا کہ سارہ وہاں سے اٹھ کر سوئے کے لیے بیٹھ۔
 ”اپنے دوست پر غور کرو عالیاں! میں تمہاری بیٹی ہوں اب۔“ اس نے بہت نرمی سے کہا۔ تو اس کے تاثرات میں پھر یارین اترنے لگا۔
 ”تو۔“ تو کیا کرنا چاہیے مجھے؟ وحوم و حاسہ۔ گولڈن ٹائٹ منائی چاہیے؟ وہ طعناستہ اسے بھڑکائے انداز میں پوچھتا ہے شرمندہ کر گیا۔
 وہ یقیناً اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا، اس بات کا اندازہ ہوتے ہی وہ مزید کچھ کہنے بغیر لڑکا سمیٹتی بیڈ سے اتر گئی۔
 عالیاں نے بستر پر سے پھولوں کی پتیوں جھاڑیں اور بیٹھ گیا۔ سارہ بہت کچھ دل کے ساتھ اپنا نام نہاد اٹھا کر وائش روم کی طرف بڑھی تھی۔
 زور اتار کر نشو و نما میں لینا اور کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو بہا۔ جس کے لیے وہ پور پور سجا کے تیار ہوئی تھی اس نے ایک غلط ڈانچ بھی کھانا کھا لیا تھا۔
 وہ چنچ کر کے نکلی تو اسے اور روئے آیا۔ کمرے کا لائٹ آف تھی۔ صرف ٹائٹ بلب جل رہا تھا۔ ہٹ تمام ڈرنک تک صبح کر اس نے زور رات و روز

دلے اور رش سے کرپا ل کھولنے لگی۔ ”مکھیں بھر بھر آ رہی ہیں۔“
 اس قدر ٹائٹ کے روپ آیا تھا آج اس پر سب ہی کہہ رہے تھے نظر نہ لگ جائے۔ آج تو عالیاں ندر ای ہو جائے گا اس پر۔ اور کسی کو کیا خبر بھی کہ نظر لگ بھی جائے۔
 ”آج سے ایک ہی زندگی۔ آرائش کی صورت شوق ہوئی سارہ زمانہ۔“ اس نے خود کو یاد کرانے پر بیڈ کے ایک کنارے پر اپنی جگہ بنائی اور لیٹ گیا۔
 ”آج پہلی رات تھی، اس لیے چھوٹ دے رہا ہوں۔ مگر کل سے اپنے بستر کا کہیں اور بندوبست کرو۔ یہ میرا ستر ہے اور اس پر تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔“
 ”مگر میں اس کی سرد و سپات آواز گونجی تو وہ رات کی رہ گئی۔“
 دل میں کیس بہت گہرائی سے درد اٹھتا تھا۔
 ”اب تمہاری زندگی اور عمر میں میری جگہ تن چکی ہو نہ کیوں نہیں؟“ وہ پوچھتی۔
 زندگی اور عمر میں تم اپنی مرضی سے گئی ہو، مگر میرے نکاح میں تم میری مرضی سے رہو گی، اور سلا سلا کر یہ کہ مجھے عورت کا فضول بحث کرنا بالکل بھی پسند نہیں۔“ وہ اسی سرد اور بے اثر لہجے میں بولتا ہے۔
 ”موت کر گیا۔“ آنے والے وقت کی یہ ترتیب دیکھ اس کی ماحول نے ابھی سے سن لی تھی۔

”آم سوری پلہ! مجھے پسند نہیں اس لیے میں نے جتا دیا۔“ وہ آرام سے ناشتا کرتے ہوئے بولا۔
 ”ایسے نہیں بیٹا جی! ایوں جھکا دے کے چھڑنے سے دامن چھٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے آرام سے، کبلی سے، کوئی ریزن دے کے کسی سے معذرت کرتے ہیں۔“ وہ قدرے فحشگی سے گویا ہوئے۔
 ”تو ریزن آپ تیار کر لیں نا! آپ کو میری طرف سے اجازت ہے۔ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں گا۔“ وہ لا پرواہی سے بولا تو اپنے لیے چائے گرم کر کے لائی سارہ کڑھی۔ (سڑیل پد مزاج اور پورنگ آدمی۔)
 ”گو کے میں کر تا ہوں کچھ مگر ہر حال میں کسی سے یہ سنا نہیں چاہتا کہ دولت کے نشے میں چور ہم اپنے رشتہ داروں کو کچھ سمجھتے نہیں ہیں۔“
 انہوں نے بات ختم کر دی تو عالیاں نے یوں ہی اثبات میں سر ہلایا تو سارہ کو بولنا پڑا۔
 ”مگر آپ کے کھڑو جانا ہی پڑے گا۔ انہیں کیا ریزن دے سکتے ہیں؟“ اس نے اپنی بڑی شادی شدہ ہن کا ذکر کیا۔ اس سے پہلے کہ سکندر صاحب کچھ بولتے عالیاں درشتی سے بولا۔
 ”بیٹیوں کی بات کا احترام کرنا سیکھو سارہ! جب بیلا نے ایک بات کہہ دی تو اسے احسن طریقے سے نبھاؤ۔“
 اس کے انداز پر سارہ بے طرح شرمندہ ہوئی۔ ماموں کے سامنے بے عزتی کر کے رکھ دی تھی اس نے۔
 ”دو فوہ کیا بھی۔“ خیرا جو ہماری بیٹی کو یوں روکا تو کھا بولنے والے۔ یہ مینا ہے ہماری۔“ انہوں نے تادیبی انداز میں عالیاں سے کہا تو وہ لب بھینچ کے رہ گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔
 ”مگر بیلا یہ بھی تو سوچے کہ اگر کسی ایک کے ہاں بھی دعوت پر گئے تو دوسرے رشتہ دار کو کتنی باتیں بنانے کا موقع ملے گا کہ جی ہمارے ہاں تو نہیں آئے۔“
 ”یہ تو ہے۔“ بیلا بیانی الغور بولے تو سارہ گہری سانس بھر کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔
 اسے پتا چل رہا تھا کہ عالیاں سکندر اب زندگی کے

فیصلوں کی اختیار اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے اور یہ بھی کہ اب وہ اسے ہر معاملے میں مات دینے کی کوشش کرنے والا تھا۔ سوائے اسے بھی اپنے مہربانہ احتیاط سے آگے بڑھانے تھے۔

مگر ایک ذات اور بھی تو ہے جو سب سے زبردست ہے۔ سب جس کے زبردست ہیں۔ خدا کی ذات جو کسی کو اس کی مرضی کے بغیر بلکہ اپنے بنائے ہوئے پلان سے زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تیسرے روز بیانے کھانے کی ٹیبل پہ لندن کی دو ریٹرن ٹکٹس عالیان کے سامنے رکھ دیئے۔

”تم لوگ کسی بھی رشتہ دار کے گھر دعوت پہ نہیں جاسکتے کیونکہ تم ہم بنی مون پہ جا چکے ہو۔“ وہ مزے سے بولے تو جہاں عالیان کو تھکا کر رکھا تھا وہاں سارہ کو بھی آگئی۔ ایک نظر ناگوار سی سے اسے دیکھنے کے بعد وہ پھر سے بولا۔

”فکر ہم تو ہمیں ہیں بیلا۔“
”یہ تو میں تمہارے جانے کے بعد سب کو بتاؤں گا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنی بیٹھک میں سالن نکال کر ڈونڈا سا رکھ دیا۔

”تو بے بیلا! آہم سوری“ میں یہاں سے بالکل بھی نکل نہیں سکتا۔ کئی اہم ڈیٹنگز کرنا باقی ہیں۔“ وہ رکھائی سے بولا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا پھر بغور اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ علی! اسے میریس تو تم کبھی بھی نہیں تھے جتنے شادی کے بعد ہو گئے ہو۔“ ان کے یوں نشانہ دہی کرنے پر وہ تدریس سنبھلا۔

”پوری لائف بڑی ہے ہوتے پھرتے کو ویت آف ٹائم سپیریٹل۔“ وہ جبراً مسکرایا۔

”رشتہ داروں کی دعوئوں میں تم نہیں جانا چاہتے“ بنی مون انہیں ویت آف ٹائم لگا ہے۔ ان سب باتوں سے میں کیا سمجھوں؟؟“

انہیں شادی کے بعد سے دونوں کا خاموش اور لیا دیا سا رویہ ٹھنک رہا تھا۔ نئے نوے شادی شدہ جوٹوں والی شوخی انداز اور بات چیت سب مشہور تھا۔

”کیا بات ہے سارہ! علی سے لڑائی ہوئی ہے؟“ انہوں نے سر جھکائے ناشتا کرتی سارہ کی خاموشی حیرت سے دیکھا تھا۔

”نہیں تو ماہل جان! یہ تو بس ایسے ہی تم کو ہے ان کے مزاج کا۔“ وہ بھرپور طریقے سے مسکراتے ہوئے اس کی ناگوار کالت کرنے لگی۔

وہ مطمئن ہوئے یا نہیں! الگ بات تھی مگر اسے سارہ کو دیکھنے کے بعد وہ عالیان کی طرف متوجہ ہوئے اور قطعیت سے بولے۔

”دس تاریخ کی سیٹس کنفرمڈ ہیں تمہاری بیلنڈ کوئی جواز نہیں۔ یہاں کا ہر معاملہ مجھے چھوڑنے سے پہلے بھی میں بہت اچھی طرح سنبھال لیتا تھا۔“ انہوں نے عالیان کے بولنے کی تمغیاش سے بے چھوڑی تھی۔ سارہ کو اس کی شکل دیکھنے کے بھی لگتی اپنی بیٹھک پر جھک گئی مگر عالیان اس کی بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

”کمرے میں جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔“
”بہت شوق ہے تمہیں بنی مون پہ جانے؟“
”یہ میرا نہیں ماہل جان کا فیصلہ ہے۔“

”مگر تمہیں کئی کیوں نہیں کہ تم میرے ساتھ نہیں جانا چاہتیں۔“ وہ زور پر بولا۔

”کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہی جانا چاہتی ہوں۔“ وہ فوراً بولی تو اس نے قطعی لہجے میں کہا۔
”مگر میں تمہیں لے جانا نہیں چاہتا۔“

”تو جلا! اکیلے بنی مون منا آؤ۔“ سارہ نے مسکراہٹ دہائی اور زمین پر بچھلے اپنے بستر پر بیٹھ کر کے دراز ہو گئی۔

”متم اگر سمجھتی ہو کہ اس طرح کی فضیلت حرکت سے میری زندگی میں ڈسٹرکشن پیدا کر دیتی تو یہ تمہارا بھول ہے۔“ وہ سلگا۔

”تم غلطی پر ہو عالیان! میں تمہاری زندگی ڈسٹرکٹ کرنے نہیں بلکہ اسے سنوارنے اور خوش کرنے آئی ہوں۔“ محبت پر تمہارا اعتبار بھل کر

”میں اسے آگے بڑھاتا ہوں تو وہ مزید چٹکتا۔“

”تم نے محبت کا سبق لوں گا جسے میں آتے ہی اس کی دولت بنا چکا ہوں۔“ اس کے انداز میں حقارت تھی۔ سارہ کوئی لذت پہنچی مگر اس نے اپنے تاثرات سے عالیان کو احساس نہیں ہونے دیا اور رساں سے بولنے لگی۔

”میری نہیں کہ ہر آویں ہر وقت صحیح ہی سوچتا ہو! ایک وقت آئے گا جب تمہیں اپنی لفظی کا احساس ہوگا اور میری محبت کا۔“

”ہب! دنیا دیکھو گی۔“ وہ استہزائیہ ہنسا اور چٹچ کر نشان دہی میں چلا گیا۔

سارہ نے کمری سانس بھرتے ہوئے اندر کے غبار کو تر کرنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ میں سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ عالیان کی سوچ کو کیسے بدلا جائے۔

وہ اس کی زندگی میں آگئی تھی مگر اپنا ایک مقام اور وقت بنا دیا۔ یہ دونوں کام اسے جوئے شیر لانے کے حوالہ تک پہنچے تھے۔

بھو واپس پورٹ پر اترتے ہی شدید دھند اور منجھد لپٹنے والی ٹھنڈ نے ان کا استقبال کیا۔ امیگریشن سے زلفت سا کر ٹیکسی لے کر وہ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اپنے فلیٹ پہنچے۔ جو عالیان بنی نے خرید رکھا تھا۔ گریڈ دو تہہ کرانے پر ہی ریتل۔

ان کا اتفاق یہ تھا کہ ان کا پورے گھر امن گیا اور سابقہ لائسنس دار ابھی پچھلے ہفتے ہی فلیٹ خالی کر کے گئے تھے۔

”کیا بھار ہو عالیان! سکندر صاحب کا لینڈ کا چکر لگاتے ہی فلیٹ کے ایک کمرے میں رہائش کا انتظام ہو گیا۔ گیسٹ روم کے طور پر بند رہتا تھا اور اسے لائسنس داروں کے سپرد نہ کیا جاتا تھا۔ سارہ نے فلیٹ کو گھر کے ویکلڈ گیسٹ روم سمیت دو بڈ رومز لائسنس داروں کے ساتھ دو ہاتھ دو مز اور کچن پر لگائے۔ سارہ نے ان کے ساتھ ساتھ رہنا شروع کیا۔

عالیان نے گیسٹ روم کا لاک کھول رکھا تھا۔ ”یہاں بستر اور کیمبل وغیرہ پڑے ہیں سب دیکھ لیتا۔“ وہ ریسیور اٹھا کر لینڈ لائن کنکشن چیک کر رہا تھا۔ ڈائری میں سے دیکھ کے اس نے کسی بیٹنی کا نمبر ملایا اور ان سے رینٹ پر گاڑی بیٹنی کی اسٹارڈ عالمی۔ اپنی دیر میں سارہ نے ڈیپریسنگل کر سید۔ بچھا دیا تھا۔

”ساری بھانڈا پونچھ کر لو اور دیکھ لو یہاں سونا ہے یا گیسٹ روم میں! اپنی جگہ سلیکٹ کر لو۔“ وہ اجنبیت سے کہہ رہا تھا۔ سارہ نے نظر انداز کیا۔

”اور کچن کا سامان؟ فریج خالی ہے اور کچن کیبنٹ بھی۔“

”ابھی تو خیر میں ریسٹ کروں گا۔ اور ہم کون سا یہاں کچن چلانے آئے ہیں۔“ وہ بے اختیار بولا تو سارہ نے بھی ہر جتہ کہا۔

”بنی مون مٹانے بھی تو نہیں آئے چائے کافی تو خودی دینا ہوگی یا پھر ناشتا۔“

عالیان اسے بے دروغی سے دیکھا۔ کتنی میں نکل گیا تو وہ کمری سانس بھرتی اولن مسکراہٹ کے ساتھ بستر پر گر پڑی۔

وہ سارہ کے ساتھ آگیا مگر جب وہ دونوں باہر نکلتے تو وہ یوں تھوڑ کر تاجیے تھامی آیا ہو ساتھ چلتی باتیں کرتی سارہ کوئی اجنبی تھی یا پھر خود سے باتیں کرنے کی شوہین، کوئی ذہنی مریض۔ تیسرے ہی دن سارہ کا دل گھبرا اٹھا۔

”خدا ہوئی ہے اجنبیت کی عالیان سکندر! لفت میں داخل ہوئے ہی وہ پھٹ پڑی تھی۔ فوراً تلوار کاٹ دیا تو وہ استہزائیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

”یہ ہم بنی مون منار ہے جن؟“ ایک مشرق میں تو وہ سرا مغرب میں! اور میں کچن اس کرتی جارہی ہوں مگر تم یوں کان بند کیے بیٹھے ہوئے ہو جیسے کوئی لفظ سمجھ نہیں آ رہا۔“ اسے ساتھ ساتھ رہنا بھی آیا۔ کس سنگدل سے دل لگا بیٹنی تھی اور طریقہ کہ اس

کی سنگدلی ادا نہ بھی نگل پڑی۔

”میں تو ایسے ہی بنی مومن منانے آیا ہوں اور رہی بات کہ تم کو اس کئی رہتی ہو اور میں کوئی جواب نہیں دیتا تو اس ویری سچل سمجھے کو اس کی سمجھ واقعی نہیں آتی۔“ وہ بڑی لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔

سارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی اس کی بات سن کر بھی مگنی۔

”بہت برے ہو عالیشان سکندر! اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں تمہارے اس رویے پر طوفان کھڑا کر دیتی اور تم اپنی طرح جانتے ہو کہ اکی اور مابول کا شمار کیا جا سکتا ہے۔“ وہ اس کی بارش میں جھپکتی ہنس پر مسکراتا تھا۔ نگاہ کو اس کے خوب صورت لٹکا والے لبوں نے جکڑا تو اسے کچھ بھر کو احساس ہوا کہ وہ بہت خوب صورت تھی مخفیہ سے جھپکے سے لٹک رہی تو اگلے ہی پل اس نے خود پر نظرین بھیجے ہوئے نقشے کے دروازے سے باہر قدم رکھ دیا۔

بالکل سامنے ہی ان کا فلیٹ تھا وہ لاک کھولنے لگا۔

”یہ محبت کے لطیف مجھے مت سنایا کرو۔“ اس نے درشت لہجے میں کہا تو وہ بے بسی سے ہوئی۔

”تم کچھ بھی کہو مگر حقیقت جانتے ہو یہ محبت ہی ہے جو مجھے تمہارے قدموں میں بدل رہی ہے ورنہ کیا مجھے کوئی اور رشتہ نہ ملتا یا پھر میں کسی غریب گھرانے کی لڑکی تھی جس نے گھر اور گاڑی کے لالچ میں تم سے شادی کر لی؟“

”تو جو کرتا ہے وہ سہتا ہے، جو محبت کے چکر میں پڑتا ہے یوں ہی خوار ہوتا ہے۔“ وہ ہر جنگلی سے کہتا ہوا لاؤنچ میں پرے کاؤچ پر بیٹھ گیا اور بوی کار بموت پکڑ لیا۔

”ضروری تو نہیں کہ محبت کرنے والے کو محبت کرنے کی سزا دی جائے۔“ وہ یا سیت سے کہتی اس کے سامنے صوفے میں دھنس گئی۔

اسے خود اس سے محبت اور توجہ کی ہیکسا آٹنا اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس رشتے کو ناکامی کے حوالے کرنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ ایک بار اس کا دل وہیں پلٹ

جاتا تو وہ ہوش اسی کا ہو کر رہتا تھا۔ مگر کچھ بہت کڑا تھا۔

”یہ سزا تو میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتادی تھی تم خود اپنے شوق سے اس دلدل میں اتریں۔“ ان کے کہنے جھپٹل تبدیل کرتے ہوئے سرو من بولا۔

”تم ساری عمر یوں ہی تو نہیں رہ سکتے عالی! سوگ میں۔“ وہ غری سے اسے سمجھانے لگی۔

اس کی بات سخت کر تیز لہجے میں بولا۔

”وہ سکا ہوں! اگر تمہارے ان چاہے ساتھ رہ سکتا ہوں تو یہ تو پھر میری اپنی محبت ہے۔“

”ایک بات جو ختم ہو چکی ہے اس کو تم اپنی زندگی پر محیط کیے بیٹھے ہو۔“

”محبت ختم نہیں ہوتی۔“

”دوسری بار تو ہو سکتی ہے نا؟“ سارہ نے غصے سے لہجے میں کہا تو وہ استراحتیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔ ابھی سے ٹھک گئیں؟ کئی گنا نام نہاد یاد رہی جس کے بل بوتے پر تم میری زندگی میں آئی تھیں؟“

”میری محبت تو یہ ہے عالیشان! کہ میں یہ ہونے بھی تمہاری زندگی میں چلی آئی کہ تم سے محبت کر چکے ہو۔ صرف اس آس میں کہ تم میری بات کے جواب میں مجھ سے محبت کرنے لگو گے۔“

وہ بے بسی سے بولی تو وہ اطمینان سے گویا بولا۔

”تو اب اپنی آس توڑ دو۔“ کیونکہ مجھ سے محبت امید رکھنا تمہاری بیوقوفی ہے۔“ وہ اس کا منہ بٹھا۔

”وہ جو کوئی بھی تھی عالیشان! وہ تم سے محبت کرتی تھی۔ اب تک تو وہ کسی اور سے شادی کر چکی ہوگی۔ اور تم بیوقوفی تو تم کر رہے ہو۔“

محبت کے مزار کے چاروں طرف سے ہونے۔

سارہ کو بھی غصہ آ گیا۔

”شٹ اپ۔۔۔ کو اس بند کرو اپنی۔“ وہ چلائی۔

”چلانے سے حقیقت نہیں بدلتی عالی۔“

بوشی کرو۔“ سارہ نے اس کی برین واشنگ جاری رکھتے ہوئے نڈرے ٹوٹنے سے کہا۔

”تم اس کی باتوں سے محبت کرنا چاہتے ہو۔۔۔“

”تم اس کی باتوں سے محبت کرنا چاہتے ہو۔۔۔“

”تم ساری عمر اسے یاد کرو۔ اپنی محبت کتنی پروا نہیں۔ تم ساری عمر اسے یاد کرو۔ اپنی محبت کے طور پر! ابھی یاد کے طور پر۔ لیکن ہم دونوں بھی اسے دوست بن سکتے ہیں نا؟ جو رشتہ ہمارے لیے ہے اسے ابھی طرح نبھانے ہیں۔“

”ایک کاغذی رشتہ ہے سارہ! اور میں۔ میں تم پر خوش کر چکا تھا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا اس کے باوجود تم میری زندگی میں گھر آئیں تو لانا! تم نے کچھ سوچ سمجھ لیا ہوگا۔ لیکن آگم سوئی۔ میں اپنی زندگی میں اپنی ترجیحات سیٹ کر چکا ہوں۔ اور ان میں تم کہیں بھی نہیں ہو۔ اور مجھے بار بار یاد دلانے کی کوشش مت کیا کرو کہ ہمارے بیچ کیا رشتہ ہے۔“

”کہ تم آگم کا کہ کو تش کرلو میں اس رشتے کو “پیش” نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے امید ہے تمہیں میری بات کی کچھ آگم ہوگی۔“

اس نے اس قدر سفاکی سے اپنی اور اس کی زندگی کو ایک کر کے اکٹرا کر صورت حال کا نقشہ کھینچا کہ سارہ ششدر رہ گئی تھی۔

رات گزارنے کے لیے سارہ نے بیڈ روم کو چنا تو عالیشان نے گیسٹ روم میں ڈیر ہو ڈال لیا۔

دو رات سارہ نے روتے ہوئے گزار دی۔

زندگی اس کے سامنے ایک سوالیہ نشان کی مانند آن گئی ہوئی تھی۔



باہم تباہی کے میوزیم میں کتابی وقت گزار کے وہ دو دن یونانی اجنبی مسافروں کی طرح اپنے آپ میں گم ہونے لگی تھی۔

بچی بھی تو سارہ جھنجھلا سی جاتی۔ لندن کا ایک اپنا علیحدہ ٹکٹ ہاجل تھا۔ اوپر سے تفریح کے لیے آئے ہوئے نوجوان جوڑے۔۔۔ اتنی بے باکی اور جھنجھلا کے منظر اس نے صوبہ میں نہ دیکھے ہوں گے۔

جتنے کہ ان چند دنوں میں سڑکوں پر کیئے ہوئے لوگوں میں اتنی قربت کے من ہو کر فارق نہ ہوا۔

ایسے میں وہ ساتھ چلتے عالیشان پر ایک چورنگا ڈالتی تو وہ پتھر ناک کی سیدھ میں چلے جاتا جیسے ایک مشتکی انسان ہو۔

کتنی ہی بار اس کا جی چلا وہ چلتے چلتے عالیشان کے سامنے آجائے شرارت میں اس سے ٹکرا جائے اور وہ اسے ہاتھوں میں بھر لے تو وہ کھلکھلا کے ہنس دے۔

وائے حسرت۔ اس نے گہری سانس بھری۔

پتہ نہیں اس سنگدل شخص کا کس کیسا ہوگا؟ اس کے وجود میں سنسنی کی دوڑا تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کے عطا کردہ ہنسی یاد آئے تو کمال بھی سننا اٹھل جیسے پورا ہنسنے لگا کہ اس کی سرخی جھپٹتی رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ اپنے خاتون ہی میں گم کسی سے زوردار طریقے سے ٹکرائی تو آنکھوں کے آگے ساری دنیا ہی گھوم گئی مگر ساتھ ہی کسی نے اسے شانوں سے تمام کر سنبھل بھی لیا۔

”ہے محم۔! ذرا سنبھل کے۔“ وہ ایک خوش شکل برٹش لڑکا تھا۔ سارہ کے حواس ابھی تک قابو میں نہ آئے تھے۔

”ایٹھین بیوٹی۔۔۔“ وہ لڑکا اسے خوبصورت تھا لڑکی سمجھ کر فری ہوا تو وہ کسمپاس اس کی گرفت اپنے شانوں پر سے ہٹا کر پیچھے ہوئی۔

”آگم فریڈی۔۔۔ الفرڈی۔۔۔! واٹس یور گنڈ نیم؟“

وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ تب ہی اس سے کچھ فاصلے پر خود میں گم چلتے ہوئے اس سے دور نگل جانے والے عالیشان کی نگاہ اس منظر پر پڑی تو وہ اڑنا ہوا ان تک پہنچا۔ اس نوجوان کا سوال بھی سن چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ سارہ روانہ ہو جاتی اور تعارف کی رسم ادا کر لیتی وہ سرو لہجے میں بولا۔

”اب اتنا بھی گنڈ نہیں کہ ہر ایک کو بتائی پھرے۔“

الفرڈی نے استفساریہ نظروں سے عالیشان کو دیکھا پھر سارہ کو۔

”میں چلتے ہوئے بے حیائی میں اس سے ٹکرائی تھی۔“ سارہ نے اردو میں عالیان کو بتایا۔
”تو یہ کہاں لکھا ہے کہ جس سے ٹکراؤ ہو گئے ہی پڑ جائے چلو۔“

وہ اسی سڑک پر سے گویا ہوا تو وہ لب بھینچی سیر حیاں اترنے لگی۔
”ہے۔“ انگریز کے دل و ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے لپکتے کو تھا جب عالیان نے اس کی گڈی اپنی منبجہ گرفت میں تھا مٹی اور حقارت سے بولا۔

”شی اندامی وائف!۔۔۔ ڈیم فیل۔“
اس کی آواز اتنی بلند ضروری تھی کہ سارہ کی سماعت تک پہنچ گئی۔ اس نے بے اختیار مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا تو انہیں پرانے دشمنوں کی طرح آنے سے سانسے کھڑا دیکھ کر گھبرائی اور زور سے عالیان کو پکارا۔

”نہاں! اس سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی بات بڑھ جاتی تو۔۔۔“
سارہ اس سے الجھنے لگی تو وہ طنز سے بولا۔
”بات بڑھ نہ جائے اسی لیے اسے اس کی اوقات یاد دلانے لگا تھا۔“

سارہ کا چہرہ جل اٹھا۔
”وہ محض مجھ سے میرا نام پوچھ رہا تھا۔“
”ہر ٹکرائے والے سے تو نہیں پوچھتا ہو گا۔“
اس کا لہجہ ہنوز تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بیٹھا تو سارہ نے اندر بیٹھ کر دو آنہ زور سے بند کر کے اپنے شیشے کا نظارہ کیا۔

”جس طرح ہم دونوں یہاں اجنبیوں کی مانند پھرتے ہیں مجھے تو ہر کوئی تنہا ہی سمجھتا ہے۔ پھر ایسے واقعات پر اتنا غصہ کیوں؟“

”کلی بات یہ کہ تم میری کرن ہو اور دوسری یہ کہ میرے نکاح میں ہو۔ ایسے میں کسی اور کا تم سے قری ہو نا مجھے بالکل بھی پسند نہیں۔“ وہ بھی سگ کر بولا۔
”اچھا کیا اسے بتا دیا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔“

وہی تو کسی کو گندھی نہیں۔“ وہ طنز سے بولا۔
”جو چار دن رہ گئے ہیں وہ تمہارے گزراؤں کی طرح۔“
پلو۔ لندن دیکھنے کا شوق تو پورا ہو گیا ہو گا تمہارا۔
بے اشتیاقی کی حد تھی۔ سارہ کی آنکھیں لگیں تو اس نے چہرہ پھیر لیا۔

موسم کی شدت کا اثر تھا۔ عالیان کے تیز بخار میں بدل گیا۔
”یا اللہ۔“

وہ چکر اسی گئی۔ یہاں کے روش کا یہ بیوقوفانہ پلٹ تھی اسے تو یہاں کی ڈرائیونگ سینیٹر تھی۔ کیا کسی ڈاکٹر کے پاس اسے لے جاتی۔
”میرے بیگ میں وائٹ باکس براؤنکس۔“
کچھ میڈیسن موجود ہیں۔ وہ باکس نکال لائے۔
عالیان کے کہنے پر وہ شکر لوار کرتی فوراً اسے جا کر اس کے بیگ میں سے وائٹ ٹر کا باکس لائی۔

”چائے بناؤ۔ تمہارے لیے۔“
سارہ کو فکر ہو رہی تھی۔ انکیت میں جواب کچن میں آئی اور دو کپ چائے کے لیے پانی چھلکے رکھا اس کے چائے لے کر آنے تک وہ وہی حالت بے دم سالیٹ چکا تھا۔

چائے سائیز پر رکھ کر وہ چند لمحوں تک رکت رہی۔ وہ شکر تھا جسے چائے کتنے سالیٹ سے کر رہا تھا۔ جلی آ رہی تھی۔ پیشانی پر بے ہوش ہونے ہاتھوں اور مخمور نقوش کے ساتھ۔
موندے۔ سارہ کی آنکھیں غم ہونے لگیں۔
وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھی اور نرمی سے اس کے بالوں کو پیٹنے لگی۔ وہ بھرتے رہا تھا۔

سارہ نے نرم ہاتھوں سے اس کا سر وہاں نہ کر دیا۔
”مجھے ماسوں جان کو اطلاع کرونا چاہیے۔“

”کس سے ڈرتے ہو عالی؟ مجھ سے یا اپنے آپ سے؟“
”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“ حسب توقع وہ جھکا۔
نگہ اس قدر شدید بخار نے اس کا دم خم نکل دیا تھا۔
وگرنہ ابھی تک اسے اٹھا کے گیسٹ روم میں رخ آیا ہوتا۔

”تو پھر سو جاؤ۔ مجھے آج رات کے لیے اپنی نرس سمجھ لو اور بس۔“
سارہ نے اطمینان سے مشورہ دیا تو عالیان نے چکر کر آنکھیں موند لیں۔ اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس حالت میں اس سے لمبی چوڑی بحث کرے۔

مگر رات کا جانے کون سا بل تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے داہنی طرف کروٹ لی۔
وہ زور سے چونکا۔
ایک نرم گرم سا وجود اس کے بالکل پاس تھا۔
اس کے ذہن میں فوری طور پر کچھ نہ آیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔

عالیان نے شانے سے تمام کرا سے سیدھا کر کے کی سعی کی اور وہ بھی تھا کہ ٹائٹ بلب کی روشنی میں کچھ جلیں سگے۔ مگر وہ خند میں کسمکھ کر اس کے بالکل قریب آئی عالیان نے سانس روک لی۔
”سارو!“
اسے جھٹکا سا لگا۔ یہ یہاں سوری ہے؟
عالیان نے آہستگی سے اسے پیچھے کرنا چاہا مگر وہ تو جیسے آٹو پیس کی طرح اس سے چمٹ گئی تھی۔
وہ اسے خود سے لار کرنا چاہتا تھا اسے دھتکار دیتا چاہتا تھا۔ مگر جانے یہ رات کے فلوں خیر مل تھے یا اس کی بھری کمزوری۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ اور جذبات کے سیل رواں میں بہتا چلا گیا۔

”مگر مجھے تمہاری ضرورت ہے عالیان! تمہاری۔۔۔“
اس کی جرات نے عالیان کو تنگ کر دیا۔
”پلو۔ وہیں اس کے پاس جگہ بناتے ہوئے ناگھیں پلو کر لیں۔“

گوہ آج میں سو سوں گی بھی بیس۔ کیا خبر رات کو سکرانہ پانی یا کسی اور شے کی ضرورت پڑ جائے۔“ وہ

”کس سے ڈرتے ہو عالی؟ مجھ سے یا اپنے آپ سے؟“
”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“ حسب توقع وہ جھکا۔
نگہ اس قدر شدید بخار نے اس کا دم خم نکل دیا تھا۔
وگرنہ ابھی تک اسے اٹھا کے گیسٹ روم میں رخ آیا ہوتا۔

”تو پھر سو جاؤ۔ مجھے آج رات کے لیے اپنی نرس سمجھ لو اور بس۔“
سارہ نے اطمینان سے مشورہ دیا تو عالیان نے چکر کر آنکھیں موند لیں۔ اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس حالت میں اس سے لمبی چوڑی بحث کرے۔

مگر رات کا جانے کون سا بل تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے داہنی طرف کروٹ لی۔
وہ زور سے چونکا۔
ایک نرم گرم سا وجود اس کے بالکل پاس تھا۔
اس کے ذہن میں فوری طور پر کچھ نہ آیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔

عالیان نے شانے سے تمام کرا سے سیدھا کر کے کی سعی کی اور وہ بھی تھا کہ ٹائٹ بلب کی روشنی میں کچھ جلیں سگے۔ مگر وہ خند میں کسمکھ کر اس کے بالکل قریب آئی عالیان نے سانس روک لی۔
”سارو!“
اسے جھٹکا سا لگا۔ یہ یہاں سوری ہے؟
عالیان نے آہستگی سے اسے پیچھے کرنا چاہا مگر وہ تو جیسے آٹو پیس کی طرح اس سے چمٹ گئی تھی۔
وہ اسے خود سے لار کرنا چاہتا تھا اسے دھتکار دیتا چاہتا تھا۔ مگر جانے یہ رات کے فلوں خیر مل تھے یا اس کی بھری کمزوری۔۔۔ وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ اور جذبات کے سیل رواں میں بہتا چلا گیا۔

”مگر مجھے تمہاری ضرورت ہے عالیان! تمہاری۔۔۔“
اس کی جرات نے عالیان کو تنگ کر دیا۔
”پلو۔ وہیں اس کے پاس جگہ بناتے ہوئے ناگھیں پلو کر لیں۔“
گوہ آج میں سو سوں گی بھی بیس۔ کیا خبر رات کو سکرانہ پانی یا کسی اور شے کی ضرورت پڑ جائے۔“ وہ

خنگ کرتی پونی والی وہ گیسٹ روم تک آئی۔ دروازہ کھول کے بھانکے تو خالی کمرہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ شانے اچکا لی پشت بنانے کی غرض سے لیکن میں چلی آئی۔ جمال اسے عالیان کے قریب آنے کی خوشی ہو رہی تھی وہیں اس کا متوجہ تو عمل سوچ کر وہ کچھ خائف بھی تھی۔ اگلے دماغ کا شخص جانے اب لفظوں کے کیسے تیر جاتا۔

اپنا پشت بنانے کے بعد اس نے موبائل سے عالیان کا نمبر لیا۔ مگر وہ فی الحال بند مل رہا تھا۔ سری سانس بھرتی وہ ناشتہ کرنے لگی۔ یہاں آئے کے بعد یہ پہلا دن تھا کہ وہ یوں اس کے بغیر اور بیٹا جائے مگر سے باہر گیا تھا۔

دیسر کو بھی وہ نہیں اوتا اور نہ ہی اس کا موبائل کوئی رسا اس دے رہا تھا۔ سارہ کا دل بھرانے لگا۔ وہ دل وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ مگر دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

ان کا نیوی اسکرین پر اور دماغ میں کس اور تھا۔ جب پریشانی حد سے بڑھی تو شام کے سائے پڑتے دیکھ کر وہ دل مضبوط کرتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

"نونی بس اگلے موڑ تک دیکھ کے آئی ہوگی۔ شاید آسانی ہو۔" اس نے شان پینتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

اگلے موڑ تک پہنچی اور پھر سامنے پارک کے دروازے کی طرف پارک پیچھے رہ گیا اب وہ چرچ روڈ پر تھی۔ چرچے کو ٹھوٹے وہ یوقونی میں فلیٹ سے نکلتی دور آئی ہے یہ اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

"ہیلو بی بی!" وہ تھرا سی گئی جب ایک سیاہ قام شخص دانت گونستا ایک دم سے اس کے سامنے آیا۔

اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ "گھبراؤ مت ڈار لنگ! میرے پاس کھڑو نہیں مگر آج کل میں ایک رانی ٹوٹی ہوئی لاوارث گاڑی میں رہ رہا ہوں۔ مگر اس کی پچھلی نشست آرام کے لیے شاندار ہے۔"

وہ اپنے بھدے ہاتھ پھیلائے ٹیڑھے دانت گونستا

اسے اس اندھیرے میں ایک عفریت سی لگا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی غلطی کر چکی ہے۔ اس پر کچھ سی طاری ہوئی۔ قدموں بھاگی۔

ابھی ملک میں یہ ایک عظیم غلطی تھی۔ غیانا وہ بھگت رہی تھی۔

اسے پیچھے بھانکے قدموں کی آواز نے اسے بھانکے اور پھر چننے پر مجبور کر دیا۔

یوں اندھا دھند بھانکے ہوئے وہ من روٹھ گئی۔ جمال روٹھنیوں کا راج اور پشتے مسکراتے چہرے۔ روال ٹریفک اور شور تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وہاں تمباہے اور ایک سیاہ قام اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

آسویں نے اس کا دیکھنا چل کر وہاں کی گاڑیوں کی زور دار ٹھوکر کھا کے منہ کے بل نیچے گری۔ اس نے بے اختیار بازو زمین پر ٹکائے منہ تو فوجی مگر کنبہ چوٹ نے اسے تڑپا ڈالا۔ اس پر مستزاد وہ شخص کے سر پر آپٹیا۔

"یہ تم نے کیا کیا سوٹ مارٹ اٹھیں گے۔ خود کو زخمی کر لیا۔ چلو اٹھو کہاں لے کے جاتا ہے۔" جس نے اسے تیار ہوں۔ آج کی رات میری قدر کی خوبصورت ترین رات ہوگی اور میں اسے دھن رکھوں گا۔

اس کے منہ سے بدبو کے بجھکے نکل رہے تھے۔ یقیناً "نشے میں تھا۔ اسی لیے اس پاس گزرتے لوگ کی اسے کوئی پروا نہ تھی۔ سارہ نے زور زور سے شروع کر دیا۔

"لو۔ میری سینڈر ملا میں تمہیں اٹھانا ہوں۔" ہاتھوں میں بھر کے۔

وہ اپنے غلیظ ارادے کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا بے بس سی ہو کر مدد کے لیے چلائے گئی۔

اسی وقت شاید... بلکہ یقیناً "خدا نے اس کی ہڈیوں کی مدد کے لیے آئے والے اس سے بے رحمی اور لاتوں سے رکھ لیا۔

اس کے کپڑے گرد آلود تھے۔ جس بری طرح سے وہ گری تھی اگر اس نے جیکٹ نہ پہنی ہو تو اس کی کھنڈیاں چھل جائیں۔ ابھی صرف اس کے گھٹنوں پہ چوٹ آئی تھی۔ البتہ کنبہوں میں اٹھنے والی ٹیسس شدید تھیں۔

"یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم مجھے ایسے چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔ پورا دن بنا رابطے کے۔" وہ شکایتی انداز میں منہ بسور کر لیتی تو اسے بالکل ٹھیک حالت میں پا کر عالیان کا قصہ بھی عود کر آیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں یوقونی کی طرح مجھے لندن کی سڑکوں پہ ڈھونڈنے لگن گئیں۔ یہاں اس بات کی پروا کیے کہ تمہیں واپسی کا راستہ یاد رہتا ہے یا نہیں۔ اس پر مستزاد تمہارا موبائل بھی فلیٹ میں ہی تھا۔ اگر کچھ غلط ہو جاتا تو۔۔۔؟"

"تو۔۔۔؟ تو پھر وعدہ کرو آئندہ مجھے ایسے اکیلے چھوڑ کے کبھی نہیں جاؤ گے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو عالیان نے ہونٹ نیچے ہونے لگا پھیری۔ اور اضطرابی انداز میں پلٹ گیا کیا کیا نہ یاد آ گیا تھا۔

گزری شب ان دونوں کے سچ کے تمام فاصلے سمیٹ کے لے گئی تھی۔ اور یہ بات عالیان کو سارا دن ملامت کرتی رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا۔ کیوں ہوا؟ میں جو خود کو اتنا مضبوط سمجھتا تھا اس قدر ہوا لگا؟"

اور ایک عورت کے ہاتھوں شکست۔ اس قدر جذبات کا غلام ہوں میں۔ اور وہ جو عرصہ نے طعنہ دیا تھا۔ وہ سچ ہونے جا رہا ہے؟ سارا دن وہ لندن کی سڑکوں پہ بھٹکتا رہا تھا۔ مگر اندر سے اٹھتی آوازوں سے چچا نہیں چھڑا سکا۔

"عالیان!۔۔۔ اتنے قریب آ کے پھر سے دور مت جاؤ پلیز۔" وہ کچھ کچھ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگاتی اس کی پشت سے آگئی۔

اچانک سے پلٹتے ہوئے عالیان نے اسے جھٹک دیا۔ اس کا بازو لیا۔

اس کے کپڑے گرد آلود تھے۔ جس بری طرح سے وہ گری تھی اگر اس نے جیکٹ نہ پہنی ہو تو اس کی کھنڈیاں چھل جائیں۔ ابھی صرف اس کے گھٹنوں پہ چوٹ آئی تھی۔ البتہ کنبہوں میں اٹھنے والی ٹیسس شدید تھیں۔

"یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم مجھے ایسے چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔ پورا دن بنا رابطے کے۔" وہ شکایتی انداز میں منہ بسور کر لیتی تو اسے بالکل ٹھیک حالت میں پا کر عالیان کا قصہ بھی عود کر آیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں یوقونی کی طرح مجھے لندن کی سڑکوں پہ ڈھونڈنے لگن گئیں۔ یہاں اس بات کی پروا کیے کہ تمہیں واپسی کا راستہ یاد رہتا ہے یا نہیں۔ اس پر مستزاد تمہارا موبائل بھی فلیٹ میں ہی تھا۔ اگر کچھ غلط ہو جاتا تو۔۔۔؟"

"تو۔۔۔؟ تو پھر وعدہ کرو آئندہ مجھے ایسے اکیلے چھوڑ کے کبھی نہیں جاؤ گے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو عالیان نے ہونٹ نیچے ہونے لگا پھیری۔ اور اضطرابی انداز میں پلٹ گیا کیا کیا نہ یاد آ گیا تھا۔

گزری شب ان دونوں کے سچ کے تمام فاصلے سمیٹ کے لے گئی تھی۔ اور یہ بات عالیان کو سارا دن ملامت کرتی رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا۔ کیوں ہوا؟ میں جو خود کو اتنا مضبوط سمجھتا تھا اس قدر ہوا لگا؟"

اور ایک عورت کے ہاتھوں شکست۔ اس قدر جذبات کا غلام ہوں میں۔ اور وہ جو عرصہ نے طعنہ دیا تھا۔ وہ سچ ہونے جا رہا ہے؟ سارا دن وہ لندن کی سڑکوں پہ بھٹکتا رہا تھا۔ مگر اندر سے اٹھتی آوازوں سے چچا نہیں چھڑا سکا۔

وہا۔
 "اپنی حد میں رہو سارہ! تم جانتی ہو کہ میں
 بھانگی بوش و خواں۔ تمہیں چھوٹے کا رولوار بھی
 نہیں ہوں۔" وہ خنکی سے بولا۔
 میں تمہاری بیوی ہوں عالی! فطری تعلق ہے
 ہمارا۔" وہ رہنہ سکی۔
 "شٹ اپ۔" کھوں کی کمزوری کو اپنی مرضی کا نام
 مسموم۔"

وہ بھڑکا اور صاف لفظوں میں جتایا کہ وہ وقتی
 جذباتیت کا شکار ہوا تھا اور بس۔۔۔
 سارہ کو اپنی توہین محسوس ہوئی تھی۔ "یہ تو وقت
 بیتانے کا عالیان! کہ تمہارا اور میرا رشتہ کتنا مضبوط
 ہے۔"
 وہ تھمتھاتے چہرے کے ساتھ کہتی وہ جا کر صوفے میں
 دھنسن گئی۔
 عالیان نے تعلق نگاہوں سے اسے دیکھا تو زیاں کا
 احساس اندر غماض میں مارنے لگا۔

وہ دن کے بعد وہ پاکستان واپس آگئے۔ اور ان دو
 دنوں میں عالیان نے بھولے سے بھی اسے مخاطب نہ
 کیا تھا۔

سکندر صاحب نے ڈرائیور سمیت گاڑی
 ایرپورٹ پر بھجوا دی تھی۔ جہاز کے سفر اور ایک لمبی
 تھکاوٹ والی ڈرائیو کے بعد وہ گھر پہنچے تو یوں جیسے وہ
 اجنبی مسافر ایک سی ساری میں بیٹھ گئے ہوں۔
 وہ دونوں نیچے اترے۔ ڈرائیور مستعدی سے
 دروازے کھولنے کے بعد وہی میں سے سہانہ نکالنے
 لگا۔

پلاٹاؤن جنسی میں بیٹھے ہوئے مل گئے۔
 "سفر کیسا رہا؟"
 "فائن بیلا!"

وہ ان کی پرسشیت یا انہوں کے گھرے میں تھا۔
 سارہ سے بھی وہ بہت محبت سے ملے اور پھر باتوں

کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس میں سارہ کی
 بھی آیا تو انہوں نے سارہ کے ساتھ ساتھ عالیان
 بھی بات کی۔
 رات کا کھانا دونوں ہی نے گول کیا تھا۔
 جہاز میں کھانا کھاتے تھے۔
 "کل سے ٹھیک دو ٹین شروع ہو گئی۔ ابھی
 کے ٹائم کے مطابق خواں چل رہے ہیں۔"

سارہ نے چائے میں ان کا ساتھ ضرور دیا تھا۔
 نیند آ رہی تھی وہ تو معذرت کرنی کمرے کی طرف
 نئی جبکہ عالیان اور پیلا اب بڑے ڈسکس
 تھے۔
 وہ کمرے میں آیا تو اسے بیڈ کے پتھوں پر

استحقاق سے محاورہ اختیار کر سکا۔
 حالانکہ وہ اول روز ہی اسے تھکا چکا تھا کہ سارہ
 کی جگہ نہیں ہے۔ اور وہ نیچے بستر بچھا کے سوئی
 رہی تھی پھر اب۔
 "یہ مجھے کیا جتنا چاہتی ہے؟"

عالیان ٹھٹھکا سا گیا۔ گزرے ہوئے کئی دنوں
 نگاہوں میں پھر گئے ہوا سے کمزور ہو گئے تھے۔
 وہ غلطی کی ایک بار ہوتی ہے سارہ بیکار رہا۔
 وہ استراحتیہ انداز میں سوچنا پڑے۔ جیروں
 کے لیے خواں دوم میں چلا گیا۔

اپنی اس بیری کمزوری پر وہ اس قدر مضبوط
 اس روز وہ واقعی سارہ کو چھوڑ کے کس بھاگ چلا
 تھا۔ وہ واپس آیا اور چند لمحوں تک اسے
 سوئے دیکھا رہا۔ پھر جھک کر اس کو ہانڈ سے
 کر چھوڑا۔
 اس انقلاب پر وہ ہزبڑا کر اٹھی۔
 "کیا ہوا؟"

اس کی آنکھوں میں کتنی تیز کا گلابی بنا ہوا
 عالیان نے بے اختیار خود کو کمزور پڑا محسوس
 "میں نے سوتا ہے۔"
 وہ اکھڑے میں بولا تو اس نے حیرت سے
 پچھلا لیا۔

"جسبہا میں نے کب منع کیا ہے؟"
 "میرا بستر ہے۔"
 وہ جھٹکنے والے انداز میں بولا تو سارہ نے بھی اسی
 کے انداز میں گویا اسے یاد دلایا۔
 "اور میں تمہاری بیوی ہوں۔"

"وہ بدستی کے رشتوں کو میں نہیں مانتا۔"
 اس نے بے رہی سے کہا۔
 وہیں اپنی زندگی پر یاد کر رہے ہو عالی! خواہ
 روگ لگا کے بیٹھے ہو کسی ایسی لڑکی کے لیے جو اپنی
 زندگی میں کسی کے ساتھ خوش اور مطمئن ہوگی۔"

سارہ نے بڑے ضبط کے ساتھ اسے سمجھانے کی
 کوشش کی مگر وہ ٹھٹھکا ہوا تھا۔
 "وہ ایسا بھی نہیں کر سکتی۔ سمجھیں تم۔ وہ تمام عمر
 ایسے ہی گزار دے گی اور مجھ کو آئے گی یہ دیکھنے کہ میں
 اپنی محبت میں کتنا چلتا تھا۔

تم کیا یاد کرو وہ میرے بھائی سے کتنی محبت کرتی
 تھی۔ وہ تو اس کے نام پر ساری عمر گزار دے گی مگر کسی
 دوسرے سے محبت نہ کر پائے گی۔"
 "اور میں؟" اس نے بے جو محبت کی ہے تم سے
 اس کا کیا؟

"وہ تمہارا درد سہرے میں نے جس میں اس کا انعام
 پس ہی تھا دیا تھا۔ مگر تم خود ہی چھپر کھانے کے شوق
 میں رہی تک چلی آئیں۔"
 وہ مسخروں انداز میں بولا تو وہ تفس سے اسے
 دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اگر تم نے واقعی میں کسی سے محبت کی ہوتی تو
 ٹھکانے جانے کی اذیت سے بھی واقف ہوتے۔
 جسکو قدر ہی میں ہے محبت کی عالیان! تم کیا کسی
 سے محبت کرو گے۔ تمہارا جذبہ صرف وقتی کشش
 ہو گا کسی لیے تو اس پر اثر نہیں ہوا۔"
 "اچھا۔" اس نے ان ہی مسخروں نظموں سے
 استغیثہ ہوئے گویا اس کا مذاق اڑایا۔
 "تو تمہاری محبت نے کون سا مجھ پر اثر کر لیا؟ اس
 کوشش کا اور کیا یہ کیا ہے؟"

"یہ تو تمہیں وقت ہی بتائے گا عالیان! میری محبت
 تو تمہارے چھپر کھانے کے بعد بھی کم نہیں ہوئی
 تھی۔" اس نے بڑے حوصلے سے کہا۔
 "تم نے صرف اپنے دل کی ایک خواہش کو پورا کیا
 ہے اور بس۔"

وہ تنفر سے پُرجے میں بولا تو چند ٹائپے تفس سے
 اسے دیکھنے کے بعد سارہ نے گروت بدل لی۔
 عالیان نے لب بچھڑے۔
 اب وہ اسے اٹھا کے نیچے تو پھینک نہیں سکتا تھا۔
 بے زار کن سوچیں لیے وہ لائٹ آف کر کے زیر و لب
 جلا کر اپنی جگہ پر کھڑا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آفس سے
 گھر پہنچے گا تو اس ہستی کو اپنے سامنے پائے گا۔
 پلاٹاؤن سے پہلے گھر آتے تھے اور وہ ان ہی کے
 ساتھ بیٹھی بیٹھ کر لڑائی لڑتی۔
 "عمیمہ! وہ ساکتی تو رہ گیا۔
 (تو ذلت بھی ہو کر رہی رہتی تھی۔)
 "یہ تو کیا عالیان بھی۔"

پاپائے اسے لاؤنج کے سرے پر بٹھا کر ادیکھ کر اونچی
 آواز میں اسے مطلع کیا تو وہ تیزی سے کھڑے ہوئے
 ہوئے پٹنی اور پھر کھل کے مسکراتے ہوئے اس کی
 طرف بڑھی۔
 "ہیلو یک مین!" اس نے عالیان کی جانب ہاتھ
 بڑھایا۔

وہ جانتی نہیں تھی۔ اور جان بھی نہیں سکتی تھی کہ
 وہ ٹوٹ پھوٹ کے کس عمل سے گزر رہا ہے۔
 ٹراس کی کی کیفیت میں اس نے عمیمہ سے ہاتھ
 ملایا۔

وہ کیا کہہ رہی تھی۔ کیا بتا رہی تھی اس کی ساتھیوں
 کچھ بھی سن نہ پادی تھیں۔ وہ محض اس کے بیٹے
 لیوں کو دیکھ رہا تھا۔
 گزرے سالوں میں وہ ڈھلنے کے بجائے مزید فریش

اور خوبصورت ہوئی تھی۔ یوں جیسے کسی بھی عہد نے اسے چھوای نہ ہو۔
 (شاید عہد نے اسے چھو کر نکل کر دیا ہے؟)
 وہ پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔ اور اس دوران وہ قطعاً نہیں جان پایا کہ سائڈ والے صوفے پر بیٹھی سارہ کیا کیا انداز سے نگاہیں لگا رہی ہے۔
 اور یہ پہلے ہی دن کی جھلک تھی۔
 عہد کے انداز اتنے بے تکلفانہ اور اپنا نہایت بھرے تھے کہ عالیشان کا خود پر چڑھایا خشک و بد مزاجی کا خول خود بخود پھٹ گیا۔ اور اندر سے نکلنے والا عالیشان اصل عالیشان سکندر تھا۔
 خوش مزاجی ریحہ گفتگو کرنے والا اور۔
 اور عہد سے محبت کا عوے دار۔



اس نے عہد سے ایک لفظ نہ پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہی کیا کرتی رہی۔ اسے خوشی تھی تو لفظ یہ کہ وہ اس کے پاس لوٹ آئی تھی۔ اور بس...
 "پاپا آخر اسے میری محبت کتنی پہنچ رہی لائی۔" وہ خوش ہو کر سوچا مگر جب سارہ کو دیکھا تو اسے ملال گھیرنے لگا کہ اسے اتنی آسانی سے اس شادی کے لیے ہمارے نہیں ماننا چاہتی تھی۔
 آج کل اس کا سارا وقت عہد کے لیے تھا اور بس۔ اور سارہ بچی نہیں تھی کہ عالیشان کے انداز نہ پہنچاتی۔ یہ تو محبت کرنے والوں کے انداز ہوتے ہیں جو عالیشان کے عہد کے لیے تھے۔

وہ بے اختیار اس کی طرف دیکھا اس کی باتوں پر رستا اور ہر بات پر اس کی رضا کو ترجیح دیتا تھا۔ سارہ ششدر ہی تو رہ گئی۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتی تھی کہ عالیشان کی محبت عہد ہوگی۔
 "اور اب یہ وہیں آئی ہے۔ یہ تو عالیشان کو لکھ رہی تھی پھر اب؟ اس گھر سے بھلا اس کا کیا رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ مرنے والا مگر گیا۔ اور عالیشان سے اس کا کوئی ایسا ویسا تعلق نہ تھا تو پھر اب اتنے ساروں کے بعد؟"

وہ دونوں صبح واک کے لیے جاتے تھے۔ اکٹھے کرتے گفتگو کے پروگرامز بناتے۔ حالانکہ سارہ بھی ہوتی مگر نہ ہونے کے برابر۔
 "انتا بولتے ہو حال! اسے بولنا نہیں سکتا کیوں؟"
 بہت باتوں اور کئی تھکی۔
 عہد اسے کوئی مگر وہ فحش کے یوں مانتا تھا کہ کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔
 اور اسے چاہئے والی۔ بہت کافی نہت اور سارہ اس مقام پر آگے ایک خوفزدہ سی لڑکی بالکل ڈر ہو کر۔
 (وہ کیا اب یہ مجھے چھوڑنے والا ہے؟)
 وہ عہد کے انداز اور رویے کا بھی پارہ جاترہ لیتی کہیں اسے تو عالیشان کی محبت لائی لائی؟

وہ بھی تو عالیشان کو بہت چاہتی تھی۔ ایک رشتے کے سہمی مگر ماضی میں وہ اس کے غمغیزے اٹھایا کرتی تھی۔ اور وہی محبت اس کے سبب اب بھی جھلک رہی تھی۔
 سارہ کھل کر خوب ڈوب گیا۔

انہما میں ٹوٹیلٹس کی ہینڈکوز کی نمائش تھی۔ "سارہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔" عہد سنتی ہی کہ۔
 پاپا بھی انہما کے لیے نکلے تھے۔
 سارہ کچھ کے بنا خاموشی سے برتن اکٹھے کر گئی۔

"یہ کیا کرے گی وہاں جا کر۔ اسے تو چھوڑی کی ذرا بھی شہد نہیں۔ تصویر الٹی بھی لگا دو گے نہیں چلے گئے۔" وہ مذاق اڑاتے لگا۔
 "تم کن علی! میں دیکھ رہی ہوں تم سارہ پر رعب ڈالتے ہو۔ اور جہاں تک سارہ کو میں جانتا ہوں وہ چار اور لحاظ میں برداشت کر جاتی ہے اور نہ بولتا اور حساس طبیعت کی لڑکی ہے یہ نہیں سمجھتی۔"

"عالیشان تو بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے تم نے اسے بدل کیوں نہ لیا۔ بہت قدر کرے گا تمہاری۔" عہد نے کہا تو وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
 "پہلے تو شاید تہریل ہوئی جاتا مگر اب مجھے توقع نہیں رہی۔"
 "کیوں۔ اب کیا ہے؟"
 عہد نے پوچھا تو وہ اندر تک سکی۔ اسے عہد کی لاعلمی اٹیکٹنگ لگ رہی تھی۔
 "اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرنا تھا۔" سارہ نے ایک دم سے حملہ کیا تو وہ لحظہ بھر کو چپ رہ گئی۔ پھر غلط انداز میں بولی۔
 "دکھنا تھا۔" پاپا ماضی کی باتوں کو ماضی کے ساتھ دفن دینا چاہیے۔ "مگر وہ اب بھی اس محبت کو اپنے جذباتوں کا پانی ویسے جا رہا ہے۔" سارہ نے دھماکہ کر دی دیا۔
 "جیسے اس کی محبت نے اس کے منہ پر پھلجھارے ویسے ہی وہ میری محبت کے منہ پر بھی مارنا چاہتا ہے۔ اور جیسے وہ اسے چھوڑ گئی شاید ویسے ہی وہ مجھے بھی۔" وہ دکھ کے مارے سکسا تھی۔
 "نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔" عہد نے اضطرابی انداز میں کہا۔
 "آپ۔ وہ آپ ہی ہیں نا؟"
 سارہ نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اسے سن کر ڈالا تھا۔

عہد کو اپنا آپ صلیب لٹکا ہوا محسوس ہوا۔
 "آپ کیوں آئی ہیں یہاں پر اسے مجھ سے چھینے؟" وہ گلابی کی انتہا پر تھی۔
 "سارہ!" وہ بے اختیار بلند لہجے میں اسے لوک گئی۔ مگر وہ خود پر مزید قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔
 "آپ تو جیسی تھی تھیں اسے چھوڑ کے تو اب پھر سے کیوں آئی ہیں اس کے سامنے۔ وہ میرا ہونے والا تھا مگر آپ کی وجہ سے ہم پھر سے میلوں کے فاصلے پر آگئے ہیں۔"

"نہاں گا؟" عہد کو غصہ آنے لگا۔
 "ہم دونوں ہی مجبور تھے۔"
 "تو تو بے وقوف کے بعد بولی تو سارہ کی نگاہوں میں تیرا کیا تھا۔"
 "میں مجبوری؟"
 "میں اپنے دل کے ہاتھوں اور وہ شاید ماموں جان کے۔" سارہ شکست خوردہ آواز میں بولی۔
 "کہہ۔"

عہد نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔
 "نہاں گا؟" عہد کو غصہ آنے لگا۔

”وہ اگر بیوقوف ہے تو تم اس سے زیادہ بیوقوف ہو۔“ اب کی بار اس نے بھی تیز آواز میں کہا تو سارا نے سر جھٹکا۔
”دیکھو! اگر جتنے کو نکلے کو پکڑنے کی ضد کرے تو اسے پورا نہیں کیا جاسکتا۔ بچہ چاہے کتنا ہی لاڈلا کیوں نہ ہو۔ عالیشان کا بھی وہی حال تھا۔ وہ وقت تو بیت گیا۔ اور یقین کرو میں نے تو اس کی بیوقوفی کو یاد تک نہیں رکھا۔ وگرنہ ایک بار جانے کے بعد یہاں بھی نہ آتی۔“

عمیمہ کو یوں صفائیاں پیش کرنے کی عادت نہ تھی۔ اسے عجیب تو لگ رہا تھا مگر ان حالات میں اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔
”مگر آپ کے یوں چلنے آنے سے وہ پھر اسی وقت میں لوٹ گیا ہے۔ آپ کو محسوس نہیں ہوئی اس کے بے اختیار انداز۔ اس کے وہ قہقہے جو بچپن ہی برسوں سے ہم نے نہیں سنے تھے وہ ان چند دنوں میں سن لیے۔“

وہ سخت برکشتہ تھی۔ اس سے خفا تھی۔
اور لوہر عمیمہ کو کبلی بار اپنی سیل گڈ پر افسوس ہوا۔ ورنہ اتنے دنوں سے وہ بہت خوش تھی۔ اپنے پرانے کمرے میں سوتی۔

یلا کے ساتھ کیمیں لڑاتی۔ عالیشان کے ساتھ سیر و تفریح کے پروگرامز میں شریک ہوتی۔ وہ اپنا ہر کدھر ہر تکلف چھوڑ کر کیمیں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔
مگر آگے جو مسئلہ کھڑا ہوا تو وہ بہت جھجک اٹھتی۔

وہ تصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی تصور وار فحش لڑائی جاری تھی۔ اس پر مستزاد اپنی صفائیاں پیش کرنے کا مطلب تھا مخالف کو مزید شہر کر۔ اس کے اندر کی عمیمہ پورے خطر لاق سے جاگتی۔

”تم جو کچھ سوچتی ہو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں سارا! اور میں تم سے مزید کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ میں جان گئی ہوں یہاں محض لفظوں سے بات نہیں بنے والی۔“ وہ اس سے محض اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اپنے پیچھے

سارہ کے چلانے کی آواز سنی۔
”آپ چلی گئیں! میں جانتی ہوں آپ سے چھوڑ کر نہ جلد یاد رہے اسے اپنا بیانیہ کی۔ مگر آپ اس کے دل سے اپنا سایہ ہٹائیں ہی تو۔۔۔“
وہ ایک کمرے کے عالم میں جا کر اپنے کمرے میں ہو گئی۔

”عمیمہ کہاں ہیں؟“ عالیشان نے آتے ہی پوچھا۔
”آج میں نے ایک نئی تھائی ڈش ترائی کی ہے۔“
عالیشان! ہمیں پسند ہے۔“

وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔
اسے گھورتے ہوئے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔
سارہ تیز قدموں سے اس کے پیچھے آئی۔ وہ اپنے کوٹ اتار رہا تھا۔

”لاؤ۔ میں ڈینگ کروں۔“ وہ آگے بڑھی۔
”اپنا جدمش رہو سارا! اور وہ میں تمہیں تھائی ہوں۔“ وہ سر دھری سے اسے وہیں روک گیا۔
”یہاں بیوی کے تعلق کی کوئی حد نہیں ہوتی۔“
عالیشان! خدا کے بنائے رشتے پر اپنی حدود لاگو نہ کرو۔“

وہ نرمی سے بولی۔ وہ اس کا میوڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود اپنا کوٹ الماری میں ڈینگ کر چکا تھا۔
”عمیمہ کہاں ہیں؟“ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ سارہ نے بمشکل اپنی ناواری پر قابو پاتے ہوئے لا پرواہی سے کہا۔

”میں کون سا ان کی سیکرٹری ہوں۔ میںیں تیار ہوں گی۔“
”واٹ؟“ وہ جیسے اچھل ہی تو پڑا۔
”یہ سلوک ہے تمہارا کھر آئے مہمان کے ساتھ؟“

سارہ سلگ اٹھی۔
”مہمان کے ساتھ حسن سلوک کی بری فکر ہے تمہیں۔ کیا اللہ کے ہاں بیوی کے ساتھ کیے سلوک

وہ عمیمہ کے کمرے میں دستک دے کر داخل ہو رہا تھا۔
اسے اپنا سوٹ کیس ہیک کرتے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”میں نے سوچا بہت ہو گئی سیر و تفریح اب لوٹنا چاہیے۔“ وہ کیمیں بیٹا شت بھرتے ہوئے بولی۔
”کیا کیسے ہو سکتا ہے ابھی تو بہت سے پروگرامز باقی ہیں۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”پھر سہی۔ یار زندہ صحبت بھلتی۔“ مگر والدی سے کہتے ہوئے عمیمہ نے قہقہے تہہ کر کے سلیٹے سے سوٹ کیس میں بھائی۔
”کپ مت جائیں۔ ہمیں وہ جائیں ہمارے پاس۔“

عالیشان نے کہا تو بے اختیار عمیمہ کو میس برس کی عمر کا وہ لڑکا یاد آنے لگا۔ اس سے ”بیوقوفانہ“ محبت کا دعوہ ابدی رہا۔

”نہ بلایا میں کچھ دن اور یہاں رہی تو نظر لگ جائے گی تم دونوں کی جوڑی کو۔ اتنے ذریعہ سورت لگتے ہو ماشا اللہ۔“ عالیشان نے اس کے چہرے پر ہنسنے اور طنز کھو جانا چاہا۔ مگر وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

”یہ شادی میری مجبوری تھی عمیمہ! اگر آپ میرے کانٹیکٹ میں ہوتیں تو میں کبھی بھی یہ شادی نہ کر کہ میں آپ کو یہ کہنے کا موقع بھی نہ دیتا کہ ”یہ کچھ مجھ سے محبت کرنے کا دعوہ دار اب اپنی بیوی کے ساتھ کتنا خوش ہے۔“ وہ جذباتی ہوا۔

عمیمہ ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ پھر ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

”تم ابھی بھی اتنے ہی بیوقوف ہو عال! میں کیوں کہوں گی بھلا ایسا؟ اور میں تو جب سے اس گھر میں بیابہ کے آئی تھی تب سے سارا کے لاوڑ تمہارا نام آکھتے سنا تھا پھر مجھے کوئی اہم کام کیسے ہوتا؟“

”فیضان بھائی کو آپ سے محبت تھی اور مجھے فیضان بھائی سے۔ میں آپ کو یہاں سے روکے ہوئے جانے نہیں دیتا چاہتا تھا۔ میں روک لیتا چاہتا تھا آپ کو کیسے ہنسی سی۔“ وہ ایسے ہی ہنسیاں پچھتے ہوئے بولا۔

”میں نے چاہا ہے؟“
”آپ چلی گئیں! میں جانتی ہوں آپ سے چھوڑ کر نہ جلد یاد رہے اسے اپنا بیانیہ کی۔ مگر آپ اس کے دل سے اپنا سایہ ہٹائیں ہی تو۔۔۔“
وہ ایک کمرے کے عالم میں جا کر اپنے کمرے میں ہو گئی۔

اور وہ واقعی میو کمرے کے جدید تراش کی لائٹ شرٹس رٹاؤز میں اچھی لگ رہی تھی۔
عالیشان کی نگاہ بے اختیار رہی تھی۔
سارہ کے لیے اس کی اتنی ہی نرمی بہت تھی۔ فوراً“
اس کے وجود سے اٹھنے والی تیز مگر دلکش سی خوشبو نے عالیشان کا گھیر لو کر لیا۔

یہ خوشبو۔ یہ لمس۔ یہ گداز سر ہا۔۔۔
عالیشان کو لندن کی رات یاد آئی۔
وہ بتا سکتا تھا جھرتا نہیں۔ شوریدہ سر تند تیز ندی

جس میں آتی تو ایسے ہی اسے بہا لے جاتی۔ خس و خاشاک کی مانند۔ درحقیقت وہ سارا کو ناپسند نہیں کرنا تھا۔ وہ خوبصورت تھی اس سے محبت کرتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس کی منکوحہ بیوی تھی۔

تو پھر عمیمہ؟ وہ کون تھی اس کی؟ وہ کیوں ٹھکراتا تھا؟
اور وہ؟ کیا صرف اس لیے کہ عمیمہ کا تجربہ درست ثابت نہ ہو جائے؟ یا پھر اس پر پکا نہ محبت کے ”بچے“ کی ”ثبوت“ کرنے کے لیے؟

اس وقت اس کا سوال کلیننگ آؤٹ اور چونک کر حواس میں لوٹ سارا کو پیچھے بھٹاتے ہوئے اس نے موبائل کیس نکالا۔
”یہ تمہارا کھانا ہے۔“ آپ کہاں ہیں؟

”ہی؟“ عمیمہ ہی سے تھوٹھو تھوٹھو سارا کا تھن ہلکا رہا۔
”میں کیمیں آگ میں جل اٹھا۔“
”تو کب سے کرتے ہو اسے بیکر نظر انداز کرنا کمرے سے باہر نکل کر چلا۔ کچھ خیال آنے پر سارا اس کے

پچھلے خیال۔

”اور اس کا تھیں وہ یوقوانہ طریقہ ہی ملا۔ مجھے
 رو پڑ کر گرنے لگا۔ اور میں نے کٹا شندار جواب دیا تھا
 ”تھیں۔“ وہ زور سے ہنسی۔
 ”میں اب بھی آپ سے شادی کرنے کو تیار
 ہوں۔“ وہ مضبوط کچے میں بولا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔
 ”اور سارہ۔! ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ اس کی کیا
 جگہ ہے تمہاری زندگی میں۔؟“
 اور باہر کان لگائے کھڑی سارہ کا روالا روایا جیسے
 کان بن گیا۔
 عالیان سے نگاہ ملانی مشکل ہوئی۔
 مگر وہ عمیمہ سے بھوت نہیں بول سکتا تھا۔
 ”اس کی میری زندگی میں اہمیت مسلم ہے۔ اس
 میں کوئی شک نہیں کہ وہ آہستہ آہستہ میرے دل و دماغ
 پر قابض ہو رہی ہے مگر میں آپ سے۔۔۔
 ”مجھ سے کیا؟ مجھ سے بھی شادی کر دو گے۔؟“ وہ پھر
 سے ہنسی جیسے اس کا مذاق اڑایا ہو۔
 ”استوینہ۔ یہاں سے جانے کے سال بھر بعد ہی پاپا
 نے میری شادی کر دی تھی۔“
 اس نے انتہائی اطمینان سے دہرا کر دیا تو وہ انتہائی
 بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔
 عمیمہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 ”اور ابھی میں اس سے لڑکے یہاں آئی ہوں۔ پاپا
 کے پاس جاتی تو وہ سیدھا مجھے وہیں بھیج دیتا۔ سب ذرا
 موصوف ناک رگڑنے پہ آمادہ ہوئے ہیں تو میں نے
 سوچا کہ اس سے زیادہ کیا سناں۔“
 ”کیسے۔ آپ نے شادی کر لی تھی۔؟“
 وہ متحیر بلکہ بے یقینی کے عالم میں تھا۔
 ”زندگی محض کسی کی یادوں کے سارے گزارا
 نہیں چاسکتی عالیان! والدین ساری عمر تو میرے ساتھ
 نہ رہتے۔“
 وہ پریکٹیکل ہونے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
 عالیان کے ذہن کی گریڈ نکلتی کھلی۔
 یہ تو بہت عام سی لوگ تھی۔ یہ وہ عمیمہ تو نہ تھی جو
 سارا دل فیضان کی تصویر سے باتیں کرتے وقت گزار
 دیتی تھی۔ اس کے کپڑوں کو استری کر کے خزانہ

انہاری میں لٹکاتی اور کبھی تہہ کر کے رکھتی۔ اور
 جوتے پالش کرتی۔ جیسے وہ زندہ ہو اور کسی بھی
 لوٹ آئے گا۔
 یہی سب تھا جس نے عالیان سکندر کو پانچ
 اسے فیضان اور عمیمہ کے رشتے بلکہ ان کی محبت
 انداز سے محبت ہو گئی تھی۔
 اور اب۔۔۔
 ”ابھی تم مجھے ایئر پورٹ پر چھوڑ کے آؤ گے
 اس نے میری سیٹ کنفرم کرا دی ہے۔ اور میں
 خفا کرنا نہیں چاہتی۔“
 تھکنا نہ کیجیے میں بولتی عالیان کو کہیں سے مجھ
 ”خاص“ عمیمہ نہیں لگی جس کے سحر میں وہ یہ
 سے جکڑا ہوا تھا۔
 اس کے ”عام پن“ نے ایک لمحہ لگا دیا تھا ان
 دیکھوں کو توڑنے میں۔
 ”اوکے میں فریض ہوس کے آتا ہوں۔“ وہ بے
 انداز میں کتابوں کی پلٹ سارہ کی کسی چیز
 وہاں سے ہٹ گئی۔

 وہ اسے ایئر پورٹ چھوڑنے آیا تھا۔ مسافر
 چلے گئے اندر جانے سے پہلے وہ بھر کے
 کیس پاس رکھی۔
 ”آتم سواری عالیان! اگر میری کسی بات
 تمہیں تکلف پہنچی ہو۔ میں اپنی زندگی میں
 خوش اور مطمئن ہوں۔ کم از کم آج تک کل کا بار
 نہیں۔ سارہ بہت اچھی ہے اور سب سے پیار
 تم سے محبت کرتی ہے اس کی قدر کرو۔ اسے
 مت تنہا اور میرے لیے بوجھ کرنا۔“
 اس کے لب کھپکا اٹھے تو آنکھوں کی نمی چھپ
 کے لیے اس نے حیرتی سے سن گھاڑا۔
 خدا حافظ کہتی اپنا سوٹ بیس دھلیکی اندر رکھتی تھی۔
 عالیان بھی وہی دور خالی الذہنی کیفیت میں کھڑا
 رہ جانے والے رستے کو دیکھ رہا۔

پاپا نے آتے ہی عمیمہ کا پوچھا اور پھر خفا ہونے
 لگا۔
 ”بہت بے وفائی ہے۔ مجھ سے مل کے تو جاتی۔
 خیر فن بہ خبر لوں گا اس کی۔“
 ”وہ کمرہ دہی تھیں چنانہ بہت ضروری ہے۔ ان کے
 سسٹم نے شاید سیٹ تنگ کر دی تھی۔“ سارہ
 بے حد مطمئن اور شاد تھی۔
 عمیمہ کے متعلق اس کے خدشات بے جا نظر
 تھے۔
 ”کس کے سسٹم نے؟“
 ”میمہ بھابھی کے۔“
 وہ ان کا کوٹ لے کر اپنے بازو پہ ڈالتے ہوئے
 مسکرائی۔
 ”یوقوف۔ فیضان کے بعد تو اس نے شادی کی ہی
 نہیں۔ دس سال ہو گئے ہیں اسے فیضان کے ہم
 بیٹھے۔“ وہ دیکھ بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولے تو سارہ
 ششدر رہ گئی۔
 ”وہ۔۔۔ وہ تو کمرہ دہی تھیں کہ ناراض ہو کے
 یہاں۔۔۔“
 وہ الفاظ بھولنے لگی۔
 ”ہاں۔ ناراض ہو کے ہی آئی تھی اپنے باپ سے۔
 وہ لوگ اس پہ دوسری شادی کرنے کے لیے زور دے
 رہے ہیں۔ مگر وہ فیضان کو بھول نہیں پار ہی بات پر بھی
 زنجار کے یہاں آگئی۔ اب شاید وہ اس کی بات مان
 گئے ہوں گے۔“
 وہ کہہ رہے تھے اور سارہ کی پیشانی عرق آ رہی
 تھی۔
 ”وہ سب عالیان کو خوش سے متفر کرنے کے لیے
 لڑیں گے کیا کہ نہیں کہ وہاں سے۔۔۔“
 وہ ان کا کوٹ پیلٹ پہ ڈالتی خود کو جیسے تھپتی ہوئی باہر
 لے آئی۔
 ”آتم سواری عمیمہ! میں آپ کو اتنا ملنا بھیجی۔“
 آنکھوں میں آنی نمی کے ساتھ اس نے اپنا پیغام
 وہاں کے سیر کیا تھا۔
 عالیان بولا تو بے حد ناراض تھا۔

سارہ نے اس کے چہرے پہ کچھ کھوجنا چاہا۔
 ”کیا کوئی رہی ہو؟“
 اس نے ایک دم سے اس کی چوری پکڑی تو وہ
 خفیہ سی ہو گئی۔
 ”میمہ سچی نہیں؟“
 ”ہاں۔“ اس نے کمری سانس بھرتے ہوئے سارہ کا
 ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے متعلق کیا۔
 ”آتم سواری سارہ۔“
 سارہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ یہ عالیان
 سکندر ہی تھا۔
 ”بعض اوقات زندگی میں کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں
 جن کے چہروں پر اچھالی اور عقلمت کے اتنے
 خوبصورت نقاب ہوتے ہیں کہ ہم بے اختیار ان سے
 متاثر ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنا آئینہ ملنے لگتے
 ہیں۔ مگر جب وہ نقاب سرکاتا ہے تو آئینہ یزوم کا بھوت
 دم دیا کے بھاگ جاتا ہے۔۔۔ میں بھی سمجھ کر۔۔۔ اک
 ذرا الفت سی ہو گئی تھی اور بس۔۔۔ وہ صاف گولی سے
 کمرہ رہا تھا۔
 سارہ کی آنکھیں بھگی گئیں۔ (آپ ہمیشہ یاد رہیں
 گی عمیمہ!)
 ”میں نے تمہیں تحیر مارے تھے۔ وہ یاد آگئے
 ہوں گے؟“ وہ ایک دم سے بولا تو اسے بے اختیار ہنسی
 آگئی۔
 ”یہاں۔۔۔ اور یہاں۔“
 وہ اس کی طرف جھکا تو سارہ دیک کر چیخے ہوئی۔
 ”ہیں۔ اتنی ہی بہت تھی۔ میرے میدان میں
 آتے ہی بھاگ گئیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔
 سارہ مسکراتی ہوئی اس کے شانے سے آگئی۔
 ”مجھے عمیمہ سے یاد آئیں گی۔ شاید تمام عمر۔۔۔ وہ
 اواسی سے بولی۔
 ”وہ کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔
 ”میں یونہی۔۔۔ ان سے الفت سی ہو گئی ہے۔“
 سارہ کا دل عمیمہ کی حقیقی خوشیوں کے لیے دعا گو
 تھا۔



سائو عارف

سیرتِ صالحہ کا کلاں

نارولہ

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی لفظی کا احساس ہوا تھا وہاں اس نے سارا علوی کو دیکھا تھا۔ بے حد خوب صورتی سے سجا ہوا وسیع و عریض لائونج، صاحب خانہ کی خوش ذوقی کا اعلان کر رہا تھا اس کے قدموں کی رفتار و جھمی ہو کر اسے بالکل ہی سہل ہو گئی تھی وہ سارا علوی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

”السلام علیکم آئی“ اس کی آواز پر سارا علوی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ان کے ہاتھ پر ہلکی سی ہلکی سی تیرتی اسے دور سے بھی دکھائی دے گی تھی۔

”وعلیکم السلام آؤ وقت کیسی ہو۔“

ایک ہی جھٹے میں ساری مہمان نوازی نینا دی جلاؤنگہ لفظوں کے استعمال میں وہ اپنی بھینس تھیں۔ مگر وہ لفظوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی تھیں۔

”آئی میں مہین سے مل لوں۔“ سارا علوی نے

بخور دیکھنے پر اس نے جھرا کر یہاں سے کھٹک جانا ہی بہتر سمجھا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنا دایاں ہاتھ پشت کے پیچھے چھپایا تھا۔

”ہوں اپنے کمرے میں ہے۔“ سارا علوی اطلاع دے کر دوبارہ چھتیس انچ کے بلازمہ کی وی کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔ جہاں ان کا کوئی پسندیدہ ٹاک شو آ رہا تھا اس نے بھی بل کے بل ایک نظر اسکرین پر ڈالی تھی۔

حزب مخالف اور حکمران جماعت کے ارکان آنے سامنے بیٹھے برسرِ پیکار تھے۔ کئی مین تان کر ایک دوسرے کے کردار پر شانہ بازی کی جارہی تھی۔ انکو فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ چائے کے سپ لے رہا تھا۔

”سب اندر سے ایک جیسے ہیں۔ ایک ہی غامدان“ برادر ہی غلطی سے تعلق اور محض دکھلوے کی مخالفت، دونوں کی کھینچا تائی۔ ”رفعت نے ماہین کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے پل بھر میں تجزیہ کیا تھا۔ مگر ابھی وہ پہلی سیڑھی پر ہی تھی جب اوپر سے آتی ہوئی میرب سے سامنا ہو گیا تھا۔

”ہائے رفعت باہی آتی ہیں۔ کسی ہیں آپ باہی؟“ اس نے اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کی عمر جتنا اور اپنے آپ کو کم عمر ظاہر کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔

”ٹھیک ہوں۔“ مختصر ”کہہ کر اس نے فوراً اور کی راہ لی تھی۔ میرب نواز کو بھی سارا علوی کی طرح طنز کی عادت تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ماہین اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے نوحہ اوجھڑا تھا۔

”ماہین۔ ماہین بی بی!“ اس نے وسط میں کھڑے ہو کر آواز بلند کرنا اس نے جانے پٹیا پٹیا کیا ابھی جیساں رکھا تھا۔ کہہ بولنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ”یہ کوئی نئی کریم یا کوئی نیا ٹونکا؟“ رفعت نے اس کے چہرے کی جانب اشارہ کیا۔

”مرسلے میں رنگ گورا کرنے کا طریقہ پر بحث تھا۔“ ماہین نے آہستہ سے کہا تھا کہ چہرے کے اکثرے ہونے عضلات کا تعلق چہرے کی جلد پر نہیں ہوتا بلکہ اسے ”جاؤمنڈ وچو کر آؤ۔“ رفعت نے اسے علم دیا۔

”اوں ہوں۔“ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے گھورا اور فوراً ”انکار میں گردن ہلائی۔ بڑی شش سے دیکھی دوائیاں ہیں کر این بنا کر لگایا تھا۔ رفعت نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے لرایا۔

”میں نے مانا، جاؤمنڈ وچو کر آؤ۔ ان چیزوں سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہارا علاج یہ ہے۔ میرے پاس۔“ اس کے ہاتھ میں اب سفید رنگ کی پلاسٹک کی ایک شیشی نظر آ رہی تھی۔

”جاؤ کی بوتل۔“ اس نے مسکرا کر معنی خیزی سے کہا تھا۔ مگر اس انزیشن نے بھی ماہین پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ منہ اوپر اٹھائے کچھ سے اپنا مالک نکھانے میں مصروف تھی۔ رفعت نے گھور کر اسے دیکھا۔

”ماہی! اگر وہ منہ پر سے یہ برٹل۔“ اس کے ظہر پر ماہین غصہ ہائی نے کھ جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر مڑ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ رفعت کے

ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے اطمینان سے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

”بل بل یو کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ کچھ ہی دور بعد وہ تویے سے منہ زنی اس کے سر پر آکر جیتی تھی۔

”کوئی تکلیف نہیں۔“ اس نے اطمینان سے اسے دیکھا کہ وہ سیاہ رنگت پر سفید پانی کے ذرات ستاروں کی مانند چمک رہے تھے۔ وہ یکدم اٹھی اور اس کا ہاتھ تمام کر قریب بٹھالیا۔

”یہ دیکھو۔“ اس کے صرف دس دن کے استعمال سے ہی تمسار رنگ گورا ہو جائے گا۔ ایسے جیسے میرا ہے۔“ رفعت نے اپنے چہرے کو سامنے کرتے ہوئے اشتراکات میں آنے والی ملاں لڑکیوں کی طرح اپنے

چہرے کی نمائش کی، اس کا فخریہ لہجہ پل بھر کے لیے ماہین کو جھلسا گیا تھا۔ لوگ اپنی خوبیاں جتانے کا کوئی موقع ہاتھ نہیں جانتے۔ دیکھتے خواہ کوئی کتنا ہی قریبی عزیز ہو یا دوست۔۔۔

”بھواس“ غصوں ایسا ہی دعوائے تین ماہ پہلے بھی کیا تھا۔ جب پارروالی سے چار کریموں کا منسک جو لے کر آئی تھیں۔ پورے تین ماہ کے استعمال کے

باوجود اتنا بھی فرق نہیں پڑا کہ وہ ہزار ہی پورے ہو جائے۔ اتنا نقصان ہوا۔ دیکھو یہ واسے لہجہ بھجائیاں۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ مجھے پر ان کریموں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔“ اس نے اداسی اور یاسیت سے کہہ کر اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ رفعت نے ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ایسی باؤسی کی باتیں کیوں کر رہی ہو“ اللہ سے اچھی امید رکھو۔“

”اچھی امید۔ اس کی آواز میں ٹوٹے کالج کی کھٹک تھی۔ اس نے باؤسی سے کہہ ”میں نے امید ختم کر دی ہے۔“ رفعت اٹھ کر ہر قسم کی خوش گمانی سے نکل آتا پاتھی ہوں۔“

اس کے کمرے سانولے چہرے پر تاریکی پھیل گئی تھی جس نے اسے مزید یہ صورت بنا دیا تھا۔ رفعت نے بے ساختہ نظر چرائی، کبھی بھی حقیقت کا سامنا واقعی بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

”باؤسی گنہ ہے ماہین!“ اس نے دوبارہ سمجھایا۔ ماہین کے چہرے پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے مڑ کر رفعت کو دیکھا۔

”کچھ نہ اٹھانے میں بھی تو سرزد ہو جاتے ہیں نا رفعت۔“

”تم سمجھتی نہیں ہو۔ راتوں رات رنگ گورا کرنے والی کوئی جاؤنی کریم ابھی تک ایچو نہیں ہوئی۔ صبر اور جوش سے کام لے کر یہ کریم متواتر استعمال کرو۔ پھر دیکھنا رزلٹ۔“ رفعت نے سفید پلاسٹک کی سیاہ ڈمکن والی شیشی اسے تھمائی۔

”کاش“ کاش کوئی ایسی جلدی کریم ہوتی کہ میں رات کو اسے چہرے پر لگاتی اور دن کو میرا چہرہ بدلا ہوا ہوتا۔“ وہ حسرت سے کہتی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ تلخ حقیقتوں کو قبول کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے اور وہ یہ کام آئینہ دیکھتے ہوئے دن میں کی بار کرتی تھی۔

سیاہ رنگت، چہرے پر والے اور چھائیاں بھدے نقوش پستہ قد، آئینے میں سامنے وہ خود کو دیکھ رہی تھی۔ وہ نوازا اکرم جیسی تھی۔

”کاش میں ماما جیسی خوب صورت ہوتی۔“ ایک آہ اس کے منہ سے نکلی تھی۔

”سارا علوی جیسی خوب صورت، حسین تو میرب ہے ماہین!“ اس کے بالکل پیچھے رفعت کی آواز گونجی تھی۔ اس نے غصے سے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”تم میری دوست ہو یا میرب کی؟“ اس نے غصہ سے ڈانٹا۔

”تمہاری! میں نے تو بونہی ایک بات کی ہے۔“ رفعت نے فوراً ”پس اپنی اختیار کی۔ ماہین کے مونڈ کا ٹوکھا جانا نہیں چھٹا تھا۔ سب بڑھائے اور اس کے میڈ کا بگڑنا اس وقت رفعت انورڈ نہیں کر سکتی تھی، اپنی کریم کے لیے بھی لینے تھے!“

”تم دیکھنا اس کریم سے کتنی پیاری ہو جاؤ گی۔“ اس کی دیکھ کر رگ کا رفعت کو علم تھا۔ ماہین کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

”تسے دن تک؟“ اب کے اس کا لہجہ ہموار تھا۔ ”دوبہتے۔“

”مسلمانوں کو اگلے ہفتہ آنا ہے۔ اگلے ہفتہ تک۔“ کچھ نہ کچھ تو فرق پڑی جائے گا۔“ ماہین نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی بات پر رفعت کا دل چاہا اور اسے قہقہہ لگائے گمہائے اپنا منلو۔۔۔

”ہاں۔“ اس کی بال میں خاصی چمکیا ہٹ سی تھی۔ کچھ نہ کچھ تو فرق ضرور پڑے گا۔“ اس کی بات پر ماہین نے مطمئن ہو کر پلاسٹک کی شیشی کو دیکھا۔ ”یہ کہنے کی ہے؟“ اب وہ صحن انار کر اسے سوکھ

دہی تھی۔
 ”زیادہ منگی نہیں دو ہزار کی ہے۔“ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”ہوں دو ہزار کلفی منگی ہے۔“ مابین ہنسی تھی۔
 پہلی دہائی...
 ”جنا بیا پہلی دہائی میں تین کریمیں تھیں۔ اس میں منگی والی سات کریمز کمز ہیں۔ اس کا رزلٹ بھی ایک سیلنٹ ہے۔“
 ”اچھا۔“ مابین سر ہلاتی درواز کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے الماری کے لاکھ دروازے اپنا پرس نکال کر دو ہزار کے دو ٹیپے نئے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے تھے۔
 ”تھینک یو۔“ رفعت کے چہرے پر خوشی پھیل گئی تھی۔ اسے اپنی محنت کا پھل ہمیشہ اسی طرح بروقت ملتا تھا۔
 ”میں لگا کر دیکھوں اسے۔“ مابین نے انگلی پر کریم لگائی۔
 ”تھیں نہیں پاگل ہو رات کو کافلی ہے۔ صرف رات کو۔ دن میں مت لگا لیا۔“ اس نے فوراً تنبیہ کی۔
 ”صرف رات میں پھر کیا اثر ہو گا۔ دن رات میں لگائے۔“
 ”نہیں۔“ اس نے مابین کی بات کٹ کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔
 ”جلد بازی کا کام ہمیشہ خراب ہوتا ہے مابین ڈیراؤن میں یہ کریم لگا کر ہر گھنٹی تو اسکن خراب ہو جائے گی یا راکٹ پیسے میں کتنی ہوں۔ ویسے ہی کیا کرو۔ اتنی تھینک تم نے پہلے بھی یہی کیا ہو گا۔ تب ہی تمہاری اسکن خراب ہوئی۔ اب مجھے سمجھ میں آئی ہے۔“ اس نے گھور کر مابین کو دیکھا۔
 ”جی نہیں۔ میں نے تمہاری ہدایات پر پورا پورا عمل کیا تھا۔“ مابین نے ناراضی سے اسے جواب دیا۔
 ”اچھا بابا! اچھا مگر اب تم اس فارمولے کو بھی ویسے

ہی استعمال کرنا جیسے میں نے بتایا ہے ان شاء اللہ بہت اچھا رزلٹ آئے گا۔“ اس کی تعین دہائی برائین کے خاموش ہو کر سر جھکا لیا تھا۔ رفعت کو وہ یہ مدت اداس لگی تھیں۔
 ”کیا ہوا مابین۔“ اس نے سیاہ رنگت میں کھلی غم کی پرچھائیاں محسوس کر لی تھیں۔ اسی لیے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے پوچھا تھا۔
 ”کچھ نہیں جس آجے رزلٹ کا خیال آ گیا تھا میرے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں ہوتا رفعت۔“ اس کی سیاہ آنکھیں جھلک رہی تھیں۔
 ”پھر وہی مایوسی کی باتیں۔“
 ”کل رات میرب نے جو باتیں مجھے سنائی ہیں۔ تم سن لو تو مجھ سے زیادہ مایوس ہو جاؤ گی۔“
 ”کیوں کرتی ہے وہ ایسی باتیں۔ میری بہن ایسی ہوتی تو قسم میں اس کا گلا دبا دیتی۔“ رفعت کو اس کا خوں طبع پائیں اور اکڑا سے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی وہ خود کو بہت کچھ اور دوسرے کو بالکل ہی زیادہ سمجھتی تھی۔ رفعت سے تو خاص طور پر پر قابض تھی کہ وہ مابین کی بددست تھی اور مابین کے ساتھ اس کے منہ میں نشانہ بنتی تھی۔
 ”گلا تو میں بھی دباؤں۔ مگر ماماں کے ساتھ اس کی اوصال بنی ہوئی ہیں۔ بتا ہے رفعت! وہ جھلکا مائی آنکھوں کے ساتھ اس کی جانب مڑ کر اسے دیکھتی ہی اس کی قاتل رحم لگی تھی اسے۔
 ”وہ ہمیشہ ماما کی انٹی تھا ہے آگے آگے ہوتی تھی اور میں پیچھے گئے خاندان برادر ہی اسکول کالج ہر جگہ جگہ ماماں اپنے ساتھ لے کر جاتی تھیں۔ سب سے ملواتی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے میرب کا ہاتھ تھام کر اسے آگے کرتی تھیں اور کہتی تھیں۔
 ”یہ ہے میری بیٹی میرب! تو مجھے بڑی حسرت ہوتی تھی میں سوچتی تھی وہ اب بھی کہیں گی یہ ہے میری دوسری بیٹی مابین مگر میں نے اپنی بیٹیکیں سالہ زندگی میں ایک بار بھی ان کے منہ سے ایسا تعارف نہیں سنا۔“

”کیوں؟ جانتی ہو کیوں؟ کیوں کہ میں اپنی ماں سارا علوی جیسی حسین و جمیل نہیں ہوں میں اپنے بابا نواز اکرم جیسی ہوں۔ بد صورت، بھدی، بد شکل وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ کیونکہ میں بیلا جیسی ہوں اور وہ بیلا سے بھی نفرت کرتی ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر بد صورت شخص سے نفرت کرتی ہیں۔“
 مابین بغیر رکنے پر پوتی گئی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو روانی سے بہ رہے تھے۔ اس کے لفظ لفظ میں آہیں اور سسکیاں تھیں، گلے شکوے تھے رفعت کو اپنا حلق ٹمکین محسوس ہوا تھا۔
 ”مابین! مابین! سارا علوی کی آواز پر وہ چونکی۔“
 رفعت جی گھبرا کر فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
 ”میں چلتی ہوں۔“ رفعت کے لیے اب مزید یہاں رکنہ خطرے کی علامت تھی۔
 ”ماما سے ڈر کر گھبرا گئی ہو۔ میرب کی فریڈز آتی ہیں تو سارا سارا دن اس کے پاس رہتی ہیں۔ انہیں تو ماما نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ تم تو میری ایک سی فریڈ ہو۔“
 ”شاید۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ تم میرب نہیں ہو۔“ اس نے طنز سے جھلکا تو مابین نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر وہ کچھ نہیں۔
 ”کیوں آئی تھی۔ اور اتنی دیر سے تم دونوں اندر کمرے میں کیا کر رہی تھیں؟“ لاؤنج کے دروازے سے چند قدم باہر رفعت کو کھلے دروازے سے سارا علوی کی آواز آئی تھی۔ وہ یکدم ہنسی بروقت بیچ گئی تھی۔
 ”ماما! مائی ہو گی، کوئی رنگ گورا کرنے والی کریم۔“
 ”پیسے اس کا دایاں ہاتھ نہیں دیکھا۔ کچھ چھپا رہی گی لاپٹے کے پیچھے۔“ مابین کے جواب سے قلم ہی میرب نے جواب دیا تھا۔
 ”غیبت کھنی! مابین نے اسے دل ہی دل میں اسے جھکادی۔
 ”اب چھپا رہی تھی۔ تم نے مجھے اس وقت کیوں لگا ہٹایا۔ میں اسے ٹھیک کرتی۔ اس نے ہزاروں

روپیہ پور لیا ہے مابین سے۔“ سارا علوی نے غصہ سے کہا۔ مابین بے ساختہ دروازے سے پیچھے ہو گئی تھی۔
 ”ماما! اسے خود عقل ہونا چاہیے۔ پیدائشی کالا رنگ بھی کبھی بدلا ہے جسے گورا کرنے کے چکر میں وہ بالکل ہو رہی ہے۔“ میرب طنز سے ہنسی تھی اور اس کا یہ جملہ دروازے کی اوٹ سے سنتی مابین کے دل میں پیوست ہوا تھا۔
 ”کیا کروں میں؟ اس بے وقوف پاگل کلا سے سمجھ نہیں ہی نہیں ہے اللہ ایسے دن رات میری جھولی میں ڈال دے تم نے۔“ سارا علوی نے سر تھام کر بے زاری اور کوفت سے کہا تھا میرب زور سے ہنسی۔
 ”دن رات۔ یعنی میں دن اور دن رات۔“ اس نے مابین کے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مثال دی تھی اور پھر دوبارہ زور سے ہنسی تھی اور اس بار اس کی ہنسی کا سارا علوی نے بھی ساتھ دیا تھا۔ دروازے کے چنٹل پر مابین کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اس نے باہر نکلنے کا ارادہ موقوف کیا اور دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔
 ”یہ شہزادہ بھی نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ ایک بار گھر سے نکل جاتا ہے تو واپسی کا راستہ بھول جاتا ہے۔ پتا نہیں کہاں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔ اس لڑکے کی مجھے الگ پریشانی لگی رہتی ہے۔“
 ”ماما! کتنی بار آپ کو سمجھایا ہے ان کی فکر نہ کیا کریں۔ وہ لوگوں کو مفت مشورے دے کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ گروہ ہوں گے ان کا نام کہیں۔“
 میرب طنز سے ہنستے ہوئے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جبکہ سارا علوی بھٹائی کی وجہ سے پریشان بیٹھی تھیں۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا انہیں پریشان کر تا اپنی اولی جلول حرکتوں کی وجہ سے وہ سارا کو پریشان ہی رکھتا۔ کبھی تو بے حد حد مند و انشور خلا سفر بن جاتا تھا اور کبھی بالکل سکی خبیثی۔ اسی لیے اب

تک اس کا کمر بھی نہیں بس سکا تھا۔ جدھر مل چاہتا نکل جاتا تھا۔
سارا نے سروصوف کی پشت سے نکال دیا۔ "نہ جانے کہاں ہو گا؟"



وہ بہت دیر سے کھڑا اس اسکوڑوالے کو دیکھ رہا تھا جس کا اسکوڑو شاید خراب ہو گیا تھا اور وہ بے چارہ اسے اشارت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ شہزاد کچھ دیر تک تو بیٹے غور سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے قریب آیا۔

"بھائی صاحب! کیا ہوا اسکوڑو خراب ہو گیا ہے؟" انہیں نہیں سنا۔ لڑکا یکدم چونکا۔ سر تپا شہزاد کو دیکھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے سے بے پال، مذہب لاجب اور بڑی زبردستی پر سنائی والا خوب صورت بندہ تھا۔

یہ وہ لڑکا تھا جو ہوا تھا۔
"جی سر! جانتا نہیں کیا ہوا ہے۔ اشارت نہیں ہو رہا۔"

"لو وہ ٹھیک لگاؤ۔" شہزاد نے نہایت سنجیدگی سے چاروں جانب گھوم پھر کر اسکوڑو کا بڑی عمیق نگاہوں سے جائزہ لیا تھا۔

"لگا رہا ہوں، بڑی دیر سے۔" لڑکا اس کا پدایت پر دوبارہ نگہ ڈالنے لگا۔

"پلگ میں کچرا آ گیا ہو گا۔" وہ سرا مشورہ اور بھی سنجیدگی سے دیا گیا۔

"وہ بھی صاف کر چکا ہوں سر! لڑکا بے حد عاجز آیا ہوا تھا۔

"پتہ نہیں چیا خلی نکلی ہے۔"
"ہے اچھی تو ہے۔" لڑکے نے اسکوڑو ہلا کر تنگی چیک کی۔

"لو وہ۔۔۔ پھر کیا مسئلہ ہو گیا! بے حد پریشانی سے شہزاد نے کہا تھا۔

"تھینک یو سر! آپ بہت ہیلپ فل انسان ہیں۔"

اس دور میں تو کوئی کسی ڈمچی کو سڑک سے اٹھا کر ہسپتال نہیں لے کر جاتا کہ وقت ضائع ہو گا۔ آپ کو میری پریشانی کا کتنا احساس ہوا۔ سوائپ دھکا لگا کر گئے۔

"دھکا! شہزاد کو یکدم جھکا لگا تھا۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"بھئی احساس کیا یہ مطلب یہ تو نہیں کہ تم مجھ سے دھکا لگاؤ۔ میں تو بیمار بندہ ہوں گرنے کی تکلیف ہے۔ ڈاکٹر نے وزن اٹھانے سے منع کیا ہے۔ کسی اور کو بلا لویا اس موٹے کو بلا لو۔ کافی زور لگا ہے اس میں۔"

پل بھر میں شہزاد کی پوری پریشانی سامنے آ گئی تھی۔ لڑکے نے حد حرانی سے اسے دیکھ کر کیا تھا۔

"بہت شکریہ ماموں۔" مفت مشورے کا۔ اس نے خوب جمل بجن کر کہا تھا۔ مگر شہزاد کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

"ماموں! حق تو سچے جا رہا تھا کہ اس لڑکے کو میرا یہ نام کس نے بتایا۔"



"میاں! مٹھو! چوری کھاؤ گے اگر چوری نہیں کھاؤ گے تو دو لائی جیتی ہو گی۔" وہ اپنے لاڈلے کے بچے کے باپ کو کڑی بہت دیر سے اسے مٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ سر جھکائے، ناراض ناراض سامان موڑے کھڑا تھا۔

"میں تمہیں کرنوی دو لائی پلا دوں گی بد تمیز کیسی بات نہیں سنتے ہو تم۔" اب کے اس نے ڈانٹ کر کہا تھا۔ اس کی ڈانٹ پر بچے میں بندہ مٹھانے شور مچا رہا تھا۔

"جی، صابقی ٹٹو۔ اگر اتنی اس کی پروا ہے اسے کو اتنی ناراضی چھوڑ کر کھانا شروع کر دے۔ اس نے مڑ کر شور مچائی مٹھو کو بھی ڈانٹ دیا تھا۔

"نیں نہیں نہیں۔" میاں مٹھو کو بھلا دیکھتا ہوا تھا۔

بیٹا کی بے عزتی کہاں برداشت تھی۔ فوراً "شور مچا دیا۔" ہوں۔۔۔ اب آئے ہونا لائن پر چلو کھاؤ۔" شہزاد نے ہنستے ہوئے چوری اس کی بیٹائی میں ڈالی اور پھر لان کے دو سرے سہرے پر بیٹے خرگو خوشوں کے بچے کی طرف آئی۔

"بہت گند کر دیا ہے انہوں نے۔ آج الیاس آتا ہے تو اس سے ساری صفائی کروائی ہوں۔ کم بخت کام چہرے میں کا لوپر سے بھانڈا لگا دیتا ہے اور بچوں کی صفائی کرنا نہیں ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بچے کے باہر اور اور گرد گردی ہوئی گھاس اٹھا کر خودی سمیٹنے لگی۔

اسی اثناء میں ایک دیوار سے محسوس ہوا۔ جیسے فون کی بیل ہو رہی ہے۔ گھبراہٹ سے جانوروں اور پرندوں میں اس قدر دھمک اور مست تھی کہ اس نے اس وقت اندر جانا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور وہ اپنے پیارے دوستوں کو چھوڑ کر جاتی بھی نہیں تھی۔

"ہاں آئی ہو تم بھی۔" کہاں تو آ رہی گردی کر رہی تھی۔ "مالو بیٹے پاؤں چاہتے ہوئے میاؤں۔"

میاؤں کی آواز اس نے اسے بھی ڈانٹ دیا۔

"میاؤں۔" وہ منہ اٹھائے بار بار بول رہی تھی۔ شہزاد نے بڑی۔

"بھوک لگی ہے نا! مجھے پتا ہے۔ بھوک کے وقت حق میں تمہیں یاد آتی ہوں۔ چالاک بیٹی، چلو میں آتی ہوں۔" وہ فوراً اپنے برتن کے قریب بھاگ گئی تھی شہزاد نے ہنستے ہوئے CatFord کا ڈیرہ اٹھایا اور اس کے قریب آئی۔ اس کے برتن میں دودھ اور کارن فلیکس ڈالے پھر وائس مڑ کر پرندوں کو دیکھا۔ سبھی کھانے پینے میں مصروف تھے، اطمینان سے کھ رہی تھیں۔

بھوک لگی تھی، جواب چھوٹے چھوٹے پیوں میں تھیں اور بوری تھی۔ مگر خرگوں میں بھی کھس جاتے تھے اور انہوں نے ایک کیاری کی مٹی بھی اٹھیر دی تھی۔

"ہائے ہائے ڈیری کے کتے خوب صورت پیوں۔" یہ سنا تہی۔

کی بھیری لگا کی تھی ساری بریاد کر ڈالی۔ وہ بھیرے ہوئے ساری مٹی دیوارہ ٹھیک کرنے لگی۔ اور ایک گھنٹے بعد وہ لان سے اٹھی تو بہت حد تک اسے حالت درست ہو چکی تھی۔

"ان بد تمیزوں کو اب نہیں کھولیں گی۔ سارا اور بیوے بریاد کر دیتے ہیں۔" اس نے غصے خرگو خوشوں کے بچے کو دیکھا اور پرندے میں آہی لان ڈیوارہ مٹی کی صفائی باقی تھی۔

"میں صدمے جاؤں، کتنا پارا پتہ نکلا ہے۔" مٹی پلائٹ کے پتے جو جوتے ہوئے اس نے سے بے حد نازک، کول، ہلکے سبز رنگ کے ٹوڑا پتے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے پیوں سے، پھولوں، فقرت سے عشق تھا۔

"ارے فون کی بیل ہو رہی ہے۔" اس نے دوران فون کی آواز سنی تھی۔

کی بھیری لگا کی تھی ساری بریاد کر ڈالی۔ وہ بھیرے ہوئے ساری مٹی دیوارہ ٹھیک کرنے لگی۔ اور ایک گھنٹے بعد وہ لان سے اٹھی تو بہت حد تک اسے حالت درست ہو چکی تھی۔

"ان بد تمیزوں کو اب نہیں کھولیں گی۔ سارا اور بیوے بریاد کر دیتے ہیں۔" اس نے غصے خرگو خوشوں کے بچے کو دیکھا اور پرندے میں آہی لان ڈیوارہ مٹی کی صفائی باقی تھی۔

"میں صدمے جاؤں، کتنا پارا پتہ نکلا ہے۔" مٹی پلائٹ کے پتے جو جوتے ہوئے اس نے سے بے حد نازک، کول، ہلکے سبز رنگ کے ٹوڑا پتے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے پیوں سے، پھولوں، فقرت سے عشق تھا۔

"ارے فون کی بیل ہو رہی ہے۔" اس نے دوران فون کی آواز سنی تھی۔

"آ رہی ہوں، بھئی۔" آہستہ آہستہ چلتے ہو۔ فون اسٹینڈ تک آئیں۔ بائیں بلوم کے سفید اور کاسی اسپیکر کی شکل والے پھول فون اسٹینڈ کے اوپر ہوئے تھے۔

"شہزاد! پچھو کہاں تھیں آپ؟" اس نے جو فون اٹھایا وہ سری جانب سے مابین چچی اٹھی تھی۔

"آؤ مجھے کھٹے سے فون کر رہی ہوں۔"

"لان میں تھی تو نو میرا یہ وقت کہاں گزر گیا۔" جانتی ہوں۔ اور اس وقت آپ کو ڈسٹرک بھی بہت برا ہوتا ہے۔ مگر میں آپ کو بہت مس کر رہی تھی پچھو! اس نے لاڈ سے ٹھیک کر کہا۔ شہزاد بے ساختہ تھی۔

"میری جان! تم مجھے ڈسٹرک کر سکتی ہو۔ تمہیں حق حاصل ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیوں یاد کر رہی تھیں؟"

"بس یو نی دل اواس ہو رہا تھا۔ آپ بھی تو نہیں آتیں نا!"

"ارے یہ میرے نہ آنے کا غصہ ہے۔" وہ

یہ سنا تہی۔

یہ سنا تہی۔

اسی لیے میں بھی کام کرنا رہا۔" کاشف کی بات پر وہ ہلکے سے ہنسے۔

"تم تو اپنی بات کہہ رہے ہو۔"

"جی سر! وہ مبالغہ واری سے سر ہلایا ہر نکل گیا تو نواز بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"سر کاشف بہت صحتی لڑکا ہے۔" ڈرائیور شیر خان نے کہا تو نواز نے چلتے چلتے اس کے دیکھ کر اسکو اشارت کر رہا تھا۔ گاڑی تیزی سے اس کے قریب سے گزری۔

کشتل پر گاڑی رکی تھی۔ اس نے جتے بجتے نیون سائن کو دیکھا۔

"رشا کے دونوں بیٹے اور میری دونوں بیٹیاں... ایک بار پھر سوچ نیون سائن کی طرح ان کے مدغ میں جتنے بجتے گئی تھی۔

"میں نے نواز سے بات کی ہے۔ مگر سارا بھابھی سے پوچھنے بغیر کوئی بات کیسے کر سکتا ہے۔" مگر رہا تھا سارا سے بات کر کے جواب دیں گے۔

"بڑے زن مرید ہیں نواز بھائی! ان جیسے دادو اور ڈروپک شوہر میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ تو بس۔ سارا کا بہت کشتل ہے۔ یہاں پر۔"

شہناز کے بچے میں حسرت تھی یا ملامت۔ درپردہ سارا علوی کی خوبیاں وہ اپنے شوہر کو سنارہی تھیں کہ ایک تیرے دو شکار ہو جائیں گے اور سارا علوی سے تو وہ ویسے بھی بہت جھلس ہوتی تھیں کیونکہ حسین و جمیل سارا علوی خود شہناز کو کوئی لفٹ نہیں کرواتی تھیں اور یہ بات شہناز کو تو پتی تھی۔

"اگر سارا نے انکار کر دیا تو...؟ انہیں سارا علوی کے غور کا بہت اچھی طرح انداز تھا۔

"کیوں۔ سارا کیوں انکار کرے گی؟ ہمارے سمیر میں ماشاء اللہ کیا کی ہے۔ یہ تو سمیر کی ضد ہے۔ ورنہ اس کے لیے میں کسی لیدی ڈانکر کا بھی انتخاب کرتا۔ ایک ہی پرویشن میں کام کرنے والے میاں بیوی

ایک دوسرے کے کام کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اور دونوں مل کر اپنا کلیک بنا سکتے ہیں۔ مگر سمیر نے میرب کے لیے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔"

رضانے بیوی کی بات پر برلمان کر انہیں سلام تھا۔ شہناز نے تائید میں سر ہلایا۔ چاہتی تو وہ بھی کسی شخص کے سوڈا کٹر ہو تاکہ بیٹے کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ مگر میرب کو میرب پسند تھی اور اس نے پہلے ہی اسی لیے اپنی اپنی اور لیا کو اپنی پسند سے آگے کر دیا تھا کہ وہ لوگ ادھر ادھر اپنی تلاش میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

"میرب کے پاس خوب صورتی کے سوا کیا ہے۔ محض بی اے پاس ہے وہ اور غروہاں سے بھی دو گنا ہے۔"

"چلو۔ ہمیں تو بیٹے کی خوشی عزیز ہے۔" رضانے ایک ہی جتنے میں ساری بحث سمیٹ دی تھی۔

"ہاں۔ بیٹے کی خوشی نے ہی تو مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ میں بتاتی سارا کو میرے بیٹے کو خوب صورت پر بھی کبھی لڑکیوں کی ہی نہیں ہے۔" شہناز کہتی سانس لے کر وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

وہ ٹال باپ کو دیکھ کر بڑی تیزی سے باہر نکلی تھی۔ "السلام علیکم یا ہا! وہ بیک لے کر اندر داخل ہوئے تو ماہین فوراً بھاگ کر سامنے آئی تھی کیونکہ نواز اکرم کے انتظار میں اس وقت لاؤنج میں ہی ٹھہر رہی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہے میری بیٹی؟" نواز اکرم کے بچے میں محسوس کیا جانے والا پیار تھا۔ انہوں نے شفقت سے اپنا بازو اس کے کندھے پر چمکایا۔

"فائن! بالکل اگلانگٹوں؟" "ہاں اگلا۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تو ماہین نے بھی فوراً کچن کا رخ کیا۔ اس نے بھی اب تک کھانا نہیں کھا تھا کیونکہ وہ رات کا کھانا نواز اکرم کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔

نواز اکرم نے میں داخل ہوئے تو سارا علوی اپنے جہاز سے اترنے پر اس کے بے حد خوب صورت بینڈ پر پیشی اپنا پسندیدہ ڈراما دیکھ رہی تھیں۔

"اگئے آپ؟" سر سری سانداز اور اس سے بھی سر سری لہجہ ایک نظر نواز اکرم نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔

"جی۔" وہ ان کے قریب بیٹھ کر مسکرائے۔

"ماہی سے کہیں۔ وہ کھانا دے دے گی۔" سارا علوی نے ایک ہی جتنے میں اپنے سارے حقوق و فرائض نبھادیے تھے۔ نواز نے دھک اور ماتحت سے اسے دیکھا۔

"وہ تو روزانہ ہی دیتی ہے۔ کاش ابھی آپ بھی یہ فرض ادا کر لیا کریں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ شکوہ پھیل گیا تھا اور سارا کے ہاتھ پر یک دم خٹکین ابھری تھیں۔

"بھئی۔ اب تو سکون لینے دو نواز اکرم! سارا نے بے زار لہجے میں جواب دیا تھا۔

"اب! تو نواز اکرم کے چہرے کی سیاسی مزید بڑھ گئی تھی۔ سارا علوی کو انہوں نے حقیقتاً پھولوں کی طرح بٹھا تھا اور پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔

"میں نے آپ کو کب بے سکون کیا ہے بیگم صاحبہ!"

"کیا بتانا چاہتے ہو؟" سارا نے چڑ کر بیوٹ دور پھینکا۔

"کچھ نہیں۔" وہ فوراً اپنی اہلی اختیار کر گئے تھے۔ اسے سارا کے غصے سے بہت خوف آتا تھا۔ شکاری کے جیسے حمل بعد بھی وہ اپنی حسین بیوی کے غصے سے خائف تھی۔

"میں نے پہلے بھی کچھ حتمیا ہے تمہیں۔" بے حد نرمی اور محبت سے انہوں نے سفید جھنڈا لہرایا تھا۔

"شہناز کو اسٹور پر جانے سے آپ نے روکا ہے؟" نواز اکرم نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔ کتنی حسرت تھی انہیں کہ کبھی تو ان کی حسین بیوی کے ہاتھ کے لہلاہوں اور وہ مسکرا کر محبت سے بات کرے۔ مگر

ساری دنیا میں خوش اخلاق کا خطاب جیتنے والی ان کے ساتھ بات کرتے وقت نہ چلے کیوں اتنی کڑوی کھلی بن جاتی تھیں۔

"اس نے فوج نہیں تھائی۔"

"میں بس کہہ رہا تھا کہ فیض صاحب نے کہا ہے کہ تم آئندہ اسٹور پر مت آتے کیوں کہ اس نے؟"

"کیوں کہ وہ عقل مند ہی سے ہماری بڑی کاپیہ فرق کرنے پر تھلا ہے۔" فیض صاحب بتا رہے تھے کہ ایک لیدی کو اپنے اسٹور سے ساتھ والے اسٹور پر لے گیا کہ آپ کی پسند کا جو تاپاں سے نہیں ملے گا۔

ساتھ والوں کے پاس زیادہ اچھی ورائٹی آتی ہے۔ بیگم صاحبہ خدا کے لیے آپ شہناز کو اسٹور پر نہ بھیجا کریں اور نہ ہی آفس۔ آرام سے گھر بیٹھ کر کھلیا کرے۔

"ہوں تاکہ تم اس مفت خور کا کھنڈہ دے دو۔"

"نہ طعن نہ تاپاں تو کب کا دے چکا ہوتا۔ آپ اب تک مجھے سمجھی نہیں ہیں۔" نواز اکرم کے غصے نے لہجے میں کیسی پیش کش کی کہ سارا علوی ہلک کر وہ لگی تھیں۔ انہوں نے اپنی ظہریں دوبارہ دہرائی پر معاویہ۔

کنے کو بلکہ لڑنے کو تو ابھی میدان جنگ تیار ہو سکتا تھا۔ مگر ان کا پسندیدہ ڈراما آ رہا تھا تو وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"ہا! یہ! یہی رہی آپ کی فوریٹ ڈش، کریپلے گوشت۔" ماہین نے ڈش ہا کے سامنے رکھی تو وہ چونکے۔

"ارے واہ! مزہ آگیا جیتی رہو۔" نواز اکرم نے بے حد خوش ہو کر اپنی پلیٹ میں سارے نکالا۔

"اپنی ماں اور میرب کو بھی بلا لو بیٹا!"

"ان دونوں نے پراکھا لیا ہے۔ کیونکہ دونوں کو یہی کرپلے پسند نہیں ہیں۔" ماہین نے کرسی گھمیت کر بیٹھے ہوئے اظہار دی۔

"او۔ اور ہم دونوں کو بہت پسند ہیں۔ ہیں نا!" نواز نے پیار سے بیٹی کو دیکھا۔

"ہاں! کیونکہ ہم دونوں ان دونوں جیسے نہیں ہیں۔" ماہین کے سامنے دھسے کرپلوں کی ساری

کڑواہٹ اس کے لہجے میں ٹھٹھکی رہی تھی۔
 ”کیا مطلب بیٹا! ایک آپ کی ماما دوسری بہن بہن سب ایک ہیں۔“

”کتنے کی حد تک سو رہا یہ تفریق تو میں نے اس دنیا میں جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے دیکھی ہے۔“

”ماہین تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟ کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے بیٹا! ان فاصلوں کو ختم کرو۔ اپنی ماما اور بہن کے ساتھ حل مل کر رہا کرو۔“

”بابا! وہ مجھے اسے ساتھ کھلنے کھلنے دے دیں تو تب ہے نا یہ فاصلے میرے پیدا کر دیں ہیں۔ ماما مجھ سے نفرت کرتی ہیں اور میرے ہوشیار بھی نہیں کرتی۔“

”کرتی کرتی کہتی ہے میں کتنی حسرتیں اور محرومیاں چھپی چھپی۔ نواز اکرم کے حلق سے نوالہ نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔“

”ایسے نہیں کہتے۔ دیکھو تمہاری ماما تو تم سے بہت محبت۔“

”بابا! میں بڑی ہو گئی ہوں، بچپن کے بسلاؤں سے باہر نکل آئی ہوں۔“ ماہین نے سنجیدگی سے باپ کو دیکھ کر جواب دیا تھا اور میرے اٹھ گئی تھی۔ نواز اکرم ساکت بیٹھے اسے جانتے دیکھ رہے تھے۔

”ثروت ٹھیک کہتی تھی۔ ماہین کے ساتھ سارا کا رویہ بے حد برا اور سوتیلی اولاد والا ہے۔ ایسا ہی پتلا رہا تو ماہین کی پوری پر سنائی بہاد ہو جائے گی۔ میں کیا کروں؟ سارا کو سمجھا نہیں سکتا ہوں اور ماہین اب خود سمجھنے لگی ہے۔“

”اوہ خدا۔“ نواز اکرم نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ جب بھی گھر میں ماہین اور میرب کا موازنہ کرتے تھے ایسے ہی از سرُرب ہو جاتے تھے۔ اوپر سے سارا کا رویہ وہ جتنا سوچنے انگلی اٹھتے جاتے تھے۔



”میری استانی“ سکول جانے کے لیے تیار ہے۔“ وہ اپنا بیگ اٹھا کر برآمدے میں آئی تو سامنے ہی چائپائی

براقبل کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھکی گئی تھی۔ وہ آج حسب معمول نہ صرف جاگا ہوا تھا بلکہ نمادھو کر صاف ستھرے حلیے میں بھی تھا۔

”ہاں کیوں؟“ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”آؤ، تمہیں بس اسٹاپ تک چھوڑ دوں۔“
 ”کیا چاہیے تمہیں؟“ اس نے غشی انداز سے اسے گھورا۔

”چھوڑ دو شک! رات کو تمہی جگہ کر رہی تھیں کہ غم سارا دن گھر میں پرے رہتے ہو اور میں بسوں کے کدے کھاتی ہوں، بس اسٹاپ پر گھنٹہ گھنٹہ ڈیل و خوار ہو کر گھر آئی ہوں تو میں نے سوچا صبح کتنی ہو۔ چلو اسٹاپ تک تو میں نہیں چھوڑ سکتا ہوں نا؟“ قبیل نے مکمل قرقر لگا کر ماملا پوچھا تھا۔

”بڑی مہربانی، سو جاؤ جا کر مجھ پر یہ احسان عظیم کرنے کے ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے دو ٹوک سے صاف صاف بات کی اور آگے قدم بڑھا دیا۔

”ارے سنو تو۔“ وہ فوراً اس کے سامنے آیا تھا۔ ”آں۔“ وہ تمہیں بے قول لگتی ہے نا۔ تھوڑے پیسے چاہیے تھے۔“ وہ بیل بھر میں اس کی خوشامد اور ہمدردی سمجھ گئی تھی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ واپسی پر بات ہوگی۔“ اس نے جلدی سے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ اس وقت اس کے ساتھ کوئی بھی جھگڑا اور ڈنڈ نہیں کر سکتی تھی۔

”ارے میری جان پانچ سو روپیہ نکالنے میں کون سی دیر لگتی ہے ابھی دے دو نا جان! اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف موڑا تھا۔ فخر نے غصے سے اسے گھورا۔

”تم استانی کھینا اور صحت بے شرم انسان ہو۔“
 ”بس نکل جائے گی تمہاری، جیکسی والا سولے گد چھ سو کا نقصان۔“ میرب نے جلدی سے پانچ سو نکل دے۔“

وہ پھلا اتنی آسانی سے نلنے والا کہاں تھا۔ فخر نے نفرت سے اسے گھورا اور پھر برس سے پانچ سو نکل کر

اس کے پچھلے ہاتھ پر پھینک دیے ایسے تو کبھی کسی بھکاری کو بھی اس نے ٹھیک نہیں دی تھی۔ مگر وہ بھکاری سے بھی بدتر اور گرا ہوا تھا۔ فخر کی جان جل گئی تھی۔ وہ باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔

”جانتی ہوں۔“ جانتی ہوں کیوں پیسے لیے ہیں اس نے نشہ جو اور قمارش بینی کے لیے میری حق حلال کی کمائی خرچ کرتا ہے بے شرم، بے غیرت۔“ دس منٹ کا راستہ چلتے کرتے۔ بیڑے کے گزرا تھا۔ اوپر سے کچا کچھ بھری بس۔

چٹپٹائی و صوب گری، جھٹکن، جھٹکن، جھٹکن میں بھی جن جولائی کی گری محسوس ہو رہی تھی۔ بشکل دھکے کھاتی وہ دو باؤں بس کے فرش پر جھانے میں کامیاب ہو سکی تھی گویا سے پانچ سو کے نکلنے کا دھکے منے کی آخری ناکہ بخوں میں وہ صحت ہاتھ سنبھال کر چلتی تھی۔ کیونکہ اسے چٹپٹائی اور مانگنے دونوں سے صحت خوف آتا تھا۔ مگر اقبال وہ اس آخری ناکہ بخوں میں اسے تھان بیٹھا تھا۔ وہ اقبال کو چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک بار اس نے کاشف سے کہا تھا۔

”یہ تو تمہارا ماما شہرہ روئی کرتا ہے۔ مگر طلاق یافتہ سے سوال کرتا ہے اور میں بس اس عمر میں سوال بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“
 تب کاشف اس سے ناراض ہو گیا تھا اور اب تک ناراض تھا۔



”اللاؤن میں صوفیہ پر بہت دیر سے کم صم فکر مند ٹھہر چکی ہوں۔“ میرب نے اس کو پریشان دیکھا تو کاشف کی کیونکہ سارا علوی بہت کم یوں فکر مند ہوتی تھیں۔

”لما کیا ہوا؟“ اس نے سارا علوی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے ساختہ چو نکلیں۔ ”ہوں گا نا کابا تھ ابھی تک کریٹل پر تھا۔“

”کس کا توں تھا لاما؟“ میرب کی نظر اب ان کے

ہاتھ پر لگی تھی۔

”مستر جلیو کا۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنے خوب صورت شہرہ رنگ بالوں پر پھیرا۔ ”تو۔“

”انہوں نے انکار کر دیا ہے۔“ ان کے لہجے میں افسوس اور مایوسی تھی۔
 ”ماہین کے رشتے سے۔“

”ہاں۔“ سارا علوی نے گمراہی سے لے کر بالوں میں انگلیاں چلاتا شروع کر دی تھیں۔ یہ ان کے اضطراب کی نشانی تھی۔

”یہ کون سا بی بات ہے لاما! لا پرواہی سے کہہ کر اس نے ریموٹ اٹھالیا۔

سارے اسے گھورا ”میں نے تمہیں منع کیا تھا نا۔ ان لوگوں کے سامنے تم مت آنا۔“
 ”تو کیا ہوا؟“ وہ جھنجھکی۔

”انہوں نے ماہین کے بجائے اب تمہارا رشتہ مانگ لیا ہے۔“
 ”کیا۔؟“ سارا علوی کی بات پر میرب کو گویا کرنا لگا تھا۔

”کیا کہا آپ نے میرا! اس سڑیل، گھونچو، لبو تزی شکل والے کھڑک کے لیے میرا رشتہ، کتنی خوش فہمی ہوئی ہے لوگوں کو اپنے بارے میں میرے سامنے آئے وہ لبو اور اس کی مٹی فٹ ہل جیسی ہاں، مڑ چکھا ہوں۔“ میرب کو تو احساسِ توبین سے آگ لگ گئی تھی۔

”تو مت آیا کرو نا سامنے۔ تمہیں دیکھ کر۔۔۔ سارا علوی نے بات اوجھڑی چھوڑ دی۔

”یہ جان لو مجھ کو لوگوں کے سامنے آتی ہے لاما۔! بڑا شوق ہے اسے لوگوں کو اپنا آپ دکھانے کا۔“ ماہین نہ جانے کب وہاں آئی تھی اور اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ میرب نے غصے سے اسے گھورا۔
 ”تم کھل ہو کیا؟“

”تم میری بہن نہیں ہو۔ دشمن ہو، میرے لیے آنے والے دشمنوں کو تھپانا چاہتی ہو۔“ ماہین کے

خفت زہریلے اور نفرت بھرے انداز پر میرب کو بھی طیش آگیا تھا۔

"مالی فٹ اپر نس چار رنگ کے رشتے آرہے ہیں تا تمہارے لیے جو میں تمہیالوں کی مائٹاٹ ماہن بی بی! مجھے تمہیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے۔" وہ تمہیلانے اور کمی پر زور دیتی ہوئی ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی تھی اور اس کا ہر لفظ مانی کو تیر کی طرح لگتا تھا۔

"تمہیں یہ تکلیف ہے کہ کہیں میری شادی پہلے نہ ہو جائے اور میں تم سے آگے نہ نکلی جاؤں۔" مائین کی آواز شدت جذبات سے پھٹ سی گئی تھی۔

"ماہن پلینز اسے منع کر لیں۔ اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔" میرب ماہن کی جانب مڑ کر جاتی۔

"ماہن! شرم کرو۔ چھوٹی بہن پر ایسا الزام لگاتے تمہیں شرم آتی چاہیے۔" سارا نے غصے سے اسے ڈانٹ دیا تو مائین جیسے تھک کر جوگی تھی۔

"اور یہ۔۔۔ یہ کیوں آتی ہے میرے رستے میں۔" یکدم بات گرتے گرتے اس کا کھار تودھ گیا تھا۔

"یہ بڑی نہ ہوتی تو منہ تو دیتی اس کا شکل نہ عقل الزام دو سول پر۔" میرب مزید بھڑکی تھی۔ سارا نے تنک آکر اپنا سر تھام لیا۔

"اف خدا یا!۔۔۔ اچپ ہو جاؤ تم بھی دلخ غراب کر دیا ہے میرا۔ کیسے لڑتی ہو تم دونوں!۔۔۔ سارا بے اختیار چلائی تھیں مائین روٹی ہوئی وہاں سے بھاگ لی تھی۔

"میرا بس چلے تو اس سانیکو سے جان چھڑاؤں۔" راہ چلتے کسی بندے سے ٹکرا پڑھا دوں۔ جان چھوٹے، مصیبت۔" سارا بیزار اور مایوسی سے بولتے ہوئے باہر نکلی گئی تھیں۔



وہ کالی کلفتی بھدی بد صورت، مسمیٰ سی بچی رونے جا رہی تھی۔

"ماہن میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی آج، آپ

مجھے ہمیشہ گھر چھوڑ کر جاتی ہیں اور میرب کو اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں۔" روتے ہوئے وہ مسلسل ضد کر رہی تھی۔ سارا نے باتیں پس کر اسے دیکھا۔

"تم نے سنا نہیں۔ میں نے کہا ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔" غصے سے اسے ڈانٹ کر انہوں نے سر نہ سفید بے حد خوب صورت، پھولے پھولے کالہ اور سنہری بالوں والی ٹیویا سی میرب کا ہاتھ تھام لیا۔ جس کی گھائی فرائک پر سنہری ستارے چمک رہے تھے اور نیٹ کی جھالیں تنگ رہی تھیں۔ وہ اس فرائک میں تنگی سی پری لگ رہی تھی۔

"میں جاؤں گی آپ کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے آپ مجھے کیوں لے کر نہیں جاتی ہیں۔" مائین نے دوبارہ ہاتھ تھام لیا تھا جسے سارا نے بری طرح جھٹکا تھا۔

"پتا ہے تو کیوں ضد کرتی ہو۔ تنگ کرتی ہو مجھے" دفع ہو جاؤ۔" سارا نے غصے سے اسے دھکا دیا تو وہ قلعین پر مڑ کر زور زور سے رونے لگی تھی اور اپنی بی ثروت نے اسے اپنی ہانسون میں سمیٹ لیا تھا۔

"خدا کا خوف کرو سارا! ایسا بے رحم سلوک تو کوئی سوتیلی ماں بھی اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں کرتی ہے۔ تمہاری متناہیہ تفریق کیسے کر لیتی ہے۔" ثروت نے اپنے غصہ کو دہاتے ہوئے ماسف بھرے انداز میں اسے دیکھ کر ڈکا تھا۔

"تو کیا کروں؟ اسے ساتھ لے جا کر لوگوں کی باتیں سنوں۔ اب کس کس کو بتاؤں کہ یہ اپنے باپ پر مکی ہے۔ اس کے دھیال میں سب ہی اسی جیسے ہیں۔

لوگوں کی اصول باتیں سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ رکھو اسے اپنے پاس۔" سارا نے غصے سے اسے جواب دیا پھر میرب کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی تھی ایک پل کے لیے مائین نے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑا کر ماں کے پیچھے جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ سرفہر بل رہ چھو پھوٹے گئے مکی رو رہی تھی تو سارا نے اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ لوگوں کے رویے اور لوہا کی نظریں پھینک گئی تھی۔ ثروت کا دل بھی تھک چکا تھا اس کی اپنی آنکھوں میں بھی جھلسلاہٹ چھنے لگی تھی۔

تھی۔ "آؤ۔۔۔ اپنے کمرے میں چلیں۔ ہم دونوں بھی شام کو آؤں کریم کھانے چلیں گے، آئیے۔" وہ اسے بلاتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔

"پچھو! ماہن اپنے ساتھ مجھے نہیں لے کر جاتی ہیں۔ مجھے پتا ہے میں میرب جیسی پیاری نہیں ہوں۔ اگر میں بھی میرب جیسی حسین ہوتی تو سب مجھے بھی پیار کرتے تاؤدہ اپنے آنسو صاف کرتی مکتی حسرت سے گھر رہی تھی۔ ثروت کا دل کانپ گیا۔

"سب تو اب بھی تم سے پیار کرتے ہیں جانو!" "جھوٹ میں کلاس میں پوزیشن لیتی ہوں۔ میرب کو کچھ بھی نہیں آتا وہ نالائق ہے۔ پھر بھی بچہ زرا اس سے پیار کرتی ہیں اور گھر میں آنے والے سب لوگ بھی۔" اسی لیے تو ماہن مجھے کمرے میں بھیج دیتی ہیں تاکہ انہیں میری وجہ سے کوئی شرمندگی نہ ہو۔

"نہیں مائین! میں تم سے پیار کرتی ہوں! بلیا تم سے بہت محبت کرتے ہیں جان!۔۔۔ تم ایسا نہیں کیوں کرتی ہو۔" اس نے بے اختیار اسے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ وہ اب سمجھ دار ہو رہی تھی۔ لوگوں کے کئے اور ماں کا انداز اور رویہ پہچاننے لگی تھی۔ اس کے اندر خود اعتمادی کی کمی ہو رہی تھی۔ وہ لوگوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ شرم کر اپنے کمرے میں چھپ جاتی تھی پھر کمرے سے نکلتی ہی نہیں تھی۔

ثروت سارا علوی کو یہ احساس دلا دلا کر تھک گئی تھی کہ وہ اپنے رویے پر غور کریں اور مائین کے ساتھ اپنا رویہ بدلیں۔ مگر وہ نواز اکرم سے نفرت کی سزا سے بچی دے رہی تھیں جس کا اس سارے قصے میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ سارا علوی کے خاندان میں خوب صورت بچی بہت زیادہ تھی۔ مگر دولت اتنی ہی کم تھی اور سارا علوی کو بچپن سے ہی غریب سے نفرت تھی۔

انہی کی فیملی میں لڑکیوں کی شادیاں خاندان میں ہی ہوتی تھیں اور اپنے کنون راجیل کو وہ بھی پسند کرتی تھیں۔ سب سے بعد انہارٹ کسی فلمی ہیرو سا خوب صورت لڑکے اس کا آئینہ میں ضرور تھا۔ ماس کے اوپر ہر حرام

انسان کے ساتھ زندگی گزارنا انتہائی دشوار تھا۔ وہ ہر وقت اسے کمانے اور روزگار ڈھونڈنے کے لیے کہتی رہتی تھی۔ مگر وہ تن آسان شخص نہ تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی کی بہت فکر تھی۔ اسی لیے کوئی بھی کام کرنے پر تیار نہ تھا۔ دفتری ملازمت شخص میٹرک پاس کو کہاں مل سکتی تھی۔ سارا علوی اس صورت حال سے بہت پریشان تھی۔ اس نے اپنے گھر میں بھی غریب دیکھی تھی اور اب آگے ساری عمر غریب میں گزارنا بہت خوفناک تھا۔ انہی دونوں اس کے لیے نواز اکرم کا رشتہ آیا۔ نواز اکرم کی ماں نے اسے ایک محفل میلاد میں دیکھا تھا اور جی جان سے اس پر فریفت ہو گئی تھی۔

نواز اکرم جیسے شخص کا رشتہ قبول کرنا اس کی توہین تھی۔ کوئی بھی گھر میں راضی نہ تھا۔ مگر وہ بھنڈ گئی کہ نواز اکرم سے ہی شادی کیوں کی۔ کیونکہ نواز اکرم کے پاس خوب صورتی نہیں تھی۔ دولت تو بہت زیادہ تھی تا اور سارا علوی اچھی طرح جانتی تھیں۔ ان کی خوب صورتی اس غریب افلاس اور بھوک میں دل کر مٹی ہو جائے گی اور وہ بھی اپنی ماں کی طرح بیت بھر کھانے کو ترستی رہیں گی، جس کی خوب صورتی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اب کہاں تھی وہ مہر النساء پانچ بچوں کے ساتھ غریب کا مقابلہ کرتے کرتے خوب صورتی تو نہ جانے کب کی غائب ہو گئی تھی۔ اب تو محض تھنڈر عمارت جیسے کہیں کہیں نقوش باقی تھے اور سارا علوی اچھی طرح جانتی تھی کہ راجیل سے شادی کا مطلب ایک اور مہر النساء بن جانا ہے۔

"میں نواز اکرم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" اس کے اس ایک جملے نے کسی تھر تھلی میادی تھی۔ وہ اپنی فیملی کی سب سے حسین لڑکی تھی اور نواز اکرم ان کی فیملی میں آنسو الا سب سے بد صورت دلدادہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے کسی ایک فصاحت خوف اور ڈر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نواز اکرم کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ محبت کے بغیر رہ لوگی؟"

سخت زہریلے اور نفرت بھرے انداز پر میرب کو بھی طیش آگیا تھا۔
 "مائی فٹ اپر نس چار رنگ کے رشتے آ رہے ہیں نا تمہارے لیے جو میں ہتھیالوں گی ماہذاث ماہین لی بی بی! مجھے ہتھیانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے۔" وہ ہتھیانے اور کمی پر زور دیتی ہوئی ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی تھی اور اس کا ہر لفظ مائی کو تیرکی طرح لگا تھا۔

"تمہیں یہ تکلیف ہے کہ کہیں میری شادی پہلے نہ ہو جائے اور میں تم سے آگے نہ نکل جاؤں۔" ماہین کی آواز شدت جذبات سے پھٹ سی گئی تھی۔
 "ماما پلیر اے منع کر لیں۔ اس کا مدعا الٹ گیا ہے۔" میرب ماہی کی جانب مڑ کر چلائی۔
 "ماہین! شرم کرو۔ جھوٹی بن پر ایسا الزام لگاتے جس میں شرم آتی چاہیے۔" سارا نے غصے سے اسے ڈانٹ دیا تو ماہین جیسے تھک کر چوکی تھی۔

"اور یہ۔ یہ کیوں آتی ہے میرے راستے میں۔" یکدم بات کرتے کرتے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔
 "یہ بڑی نہ ہوتی تو نہ تو زور دیتی اس کا مشکل نہ عقل الزام دے سول پر۔" میرب مزید بھڑکی تھی۔ سارا نے تنگ آکر اپنا سر تھام لیا۔

"اف خدا یا! سچ ہو جاؤ تم بھی مدعا خراب کر دیا ہے میرا۔ جیسے لڑتی ہو تم دونوں اف۔" سارا بے اختیار چلائی تھیں ماہین روئی ہوئی وہاں سے بھاگ لی تھی۔

"میرا بس چلے تو اس سانیکو سے جان چھڑاؤں۔" راہ چلتے کسی بندے سے نکاح پڑھاؤ دوں۔ جان چھوٹے، معصیت۔" سارا بیزار سی اور مایوسی سے بولتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔

وہ کاپلی کٹلی بھدی بد صورت، موٹی سی بچی روئے جاری تھی۔
 "ماما میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی آج، آپ

مجھے ہمیشہ گھر چھوڑ کر جاتی ہیں اور میرب کو اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں۔" روتے ہوئے وہ مسلسل ضد کر رہی تھی۔ سارا نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔
 "تم نے سنا نہیں۔ میں نے کہا ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔" غصے سے اسے ڈانٹ کر انہوں نے سرخو سفیدے حد خوب صورت پھولے پھولے گالوں اور سنہری بالوں والی کڑیا سی میرب کا ہاتھ تھام لیا۔ جس کی گلابی فراک پر سنہری ستارے چمک رہے تھے اور نیٹ کی بھاری ٹنگ رہی تھیں۔ وہ اس فراک میں غصی سی پری لگ رہی تھی۔

"میں جاؤں گی آپ کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے آپ مجھے کیوں لے کر نہیں جاتی ہیں۔" ماہین نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ جسے سارا نے بری طرح جھکاتھا۔
 "پتا ہے تو کیوں ضد کرتی ہو۔ تنگ کرتی ہو مجھے، دفع ہو جاؤ۔" سارا نے غصے سے اسے دھکا دیا تو وہ قاتلین پر گر کر زور زور سے رونے لگی تھی اور اسی ہل ثروت نے اسے اپنی ہانپوں میں سیٹھ لیا تھا۔

"خدا کا خوف کرو سارا! ایسا بے رحم سلوک تو نہیں سوتلی ماں بھی اپنی بچی کے ساتھ نہیں کرتی ہے تمہاری متناہ تفریق کیسے کر سکتی ہے۔" ثروت نے اپنے غصہ کو دھاتے ہوئے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھ کر ٹوکا تھا۔

"تو کیا کروں؟ اسے ساتھ لے جا کر لوگوں کی باتیں سنوں۔ اب کس کس کو بتاؤں کہ یہ اپنے باپ پر گئی ہے۔ اس کے دو خیال میں سب ہی اسی جیسے ہیں۔ لوگوں کی فضول باتیں سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ رکھو اسے اپنے پاس۔" سارا نے غصے سے اسے جواب دیا پھر میرب کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی تھی ایک پل کے لیے ماہین نے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑا کر ماں کے پیچھے جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر دوسری پل وہ پھوپھو کے گلے کی رو رہی تھی تو سارا بچی اپنی ہاں سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ لوگوں کے رویے اور او دن کی نظریں پچھان گئی تھی۔ ثروت کا دل مضمی میں آگیا اس کی اپنی آنکھوں میں بھی جھلملاہٹ چھنے لگی

تھی۔
 "آؤ۔ اپنے کمرے میں چلیں۔ ہم دونوں بھی شام کو آؤں کریم کھانے چلیں گے، اکیلے۔" وہ اسے بھلاتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔
 "پچھو! ماما اپنے ساتھ مجھے نہیں لے کر جاتی ہیں۔ مجھے پتا ہے، میں میرب جیسی پیاری نہیں ہوں۔ اگر میں بھی میرب جیسی حسین ہوتی تو سب مجھے بھی یاد کرتے، یاد دہانے آنسو صاف کرتی لختی حسرت سے گھر رہی تھی۔ ثروت کا دل کانپ گیا۔

"سب تو اب بھی تم سے پیار کرتے ہیں جانو!" "جھوٹ میں کلاس میں پوزیشن لیتی ہوں۔ میرب کو کچھ بھی نہیں آتا وہ تالاف ہے۔ پھر بھی نیچر اس سے پیار کرتی ہیں اور گھر میں آنے والے سب لوگ بھی۔ اسی لیے تو ماما مجھے کمرے میں بھیج دیتی ہیں تاکہ انہیں میری وجہ سے کوئی شرمندگی نہ ہو۔"

"نہیں مائی! نہیں۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں، پاپا تم سے بہت محبت کرتے ہیں جان! ہم ایسا میل کیوں کرتی ہو۔" اس نے بے اختیار اسے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ وہ اب سمجھ دار ہو رہی تھی۔ لوگوں کے سبب اور ماں کا انداز اور رویہ پہچاننے لگی تھی۔ اس کے اندر خود اعتمادی کی کمی کی ہو رہی تھی۔ وہ لوگوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ شرم کر اپنے کمرے میں پھپھ جاتی تھی تو پھر کمرے سے نکلتی ہی نہیں تھی۔

ثروت سارا اعلوی کو یہ احساس دلا دلا کر تھک گئی تھی کہ وہ اپنے رویے پر غور کریں اور ماہین کے ساتھ اپنا رویہ بدل سکیں۔ مگر وہ نواز اکرم سے نفرت کی سزا اسے پہنچا رہی تھی جس کا اس سارے قصے میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ سارا اعلوی کے خاندان میں خوب صورت بچی بہت زیادہ تھی۔ مگر دولت اتنی ہی کم تھی اور سارا اعلوی کو بچپن سے ہی غریب سے نفرت تھی۔

ان کی فیملی میں لوگوں کی شاہیاں خاندان میں ہی ہوتی تھیں اور اپنے کزن راجیل کو وہ بھی پسند کرتی تھیں۔ سب سے حد اسماٹ کسی فلمی ہیرو سا خوب صورت راجیل اس کا میڈل ضرور تھا۔ مگر اس کے اندر بد حرام

انسان کے ساتھ زندگی گزارنا اتنا ہی دشوار تھا۔ وہ ہر وقت اسے کلمے اور روزگار ڈھونڈنے کے لیے کستی رہتی تھی۔ مگر وہ تن آسان شخص نہ تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی کی بہت فکر تھی۔ اسی لیے کوئی بھی کام کرنے پر تیار نہ تھا۔ دفتری ملازمت محض میٹرک پاس کو کمال مل سکتی تھی، سارا اعلوی اس صورت حال سے بہت پریشان تھی۔ اس نے اپنے گھر میں بھی غریب دیکھی تھی اور اب آگے ساری عمر غریب میں گزارنا بہت خوفناک تھا۔ انہی دنوں اس کے لیے نواز اکرم کا رشتہ آیا۔ نواز اکرم کی ماں نے اسے ایک محفل میلاد میں دیکھا تھا اور جی جان سے اس پر قربان ہو گئی تھی۔

نواز اکرم جیسے شخص کا رشتہ قبول کرنا اس کی توہین تھی۔ کوئی بھی گھر میں راضی نہ تھا۔ مگر وہ بضد تھی کہ نواز اکرم سے ہی شادی کریں گی۔ کیونکہ نواز اکرم کے پاس خوب صورتی نہیں تھی۔ دولت تو بہت زیادہ تھی نا اور سارا اعلوی اچھی طرح جانتی تھیں۔ ان کی خوب صورتی اس غریب افلاس اور بھوک میں دل کر مٹی ہو جائے گی اور وہ بھی اپنی ماں کی طرح بیٹ بھر کھانے کو ترستی رہیں گی، جس کی خوب صورتی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اب کہاں تھی وہ مہر النساء پانچ بچوں کے ساتھ غریب کا مقابلہ کرتے کرتے خوب صورتی تو نہ جانے کب کی غائب ہو گئی تھی۔ اب تو محض کھنڈر عمارت جیسے کہیں کہیں نقوش باقی تھے اور سارا اعلوی اچھی طرح جانتی تھی کہ راجیل سے شادی کا مطلب ایک اور مہر النساء بن جانا ہے۔

"میں نواز اکرم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" اس کے اس ایک جملے نے کسی تھر تھلی بچادی تھی۔ وہ اپنی فیملی کی سب سے حسین لڑکی تھی اور نواز اکرم ان کی فیملی میں آنے والا سب سے بد صورت داماد تھا۔ اس کے باوجود اس نے کسی ایک نصیحت خوف اور ڈر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نواز اکرم کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ محبت کے بغیر وہ لوگی؟"

راجیل کو سارے انکار اور اپنی توہین نے جھلسایا تھا۔
 "وہ لوگ کیسے کیا کرتے ہیں؟" "فالتے، نفرت"
 پریشانیاں اور بس۔

"اور دولت کیا کرتی ہے؟" راجیل نے طنز کیا تھا۔
 وہ بولے سے ہنسی۔

"سب کچھ عیش آرام، سکھ جین، خوشی، سب کچھ
 دیتی ہے دولت سمیت کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے میرا مگر
 دولت کے بغیر نہیں۔" اس نے وہ ٹوک اپنا نقطہ نظر
 اس پر واضح کر دیا تھا۔

تو نواز اکرم کی والدہ حسین ترین بولا کہ بہت خوش
 تھیں خاندان بھر کی وہ پہلی حسین ترین بونہی۔ نواز
 اکرم اپنی خوش قسمتی پر حیرت زدہ تھا۔ اس کی تولاری
 نکس آئی تھی۔ وہ خود کیا تھا اور بیوی کیا تھی۔ اپنی
 قسمت پر نازاں، بہت عرصے تک تو اسے یہ بھی
 احساس نہیں ہوا تھا کہ سارا کاروبار اس کے ساتھ کیا
 توہین آمیز اور سزاوارتہ ہے۔ وہ تو اس کی ہر بات کو اس
 کی ادا سمجھتا تھا اور حسن والوں کی ادا میں اور ناز خیز
 اٹھتا اپنی خوش نصیبی۔

ماہین کی پیدائش پر جہاں نواز اکرم اور سارے گھر
 والے خوش تھے۔ سارا علوی اتنی ہی ناخوش تھی۔
 ماہین بالکل اپنے وہ خیال پر مبنی تھی۔ باپ جیسی پیچھو
 اور ولایت جیسی۔



وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سر
 جھکائے ہوئے ایک ہاتھ میں کلپوں سے بھرا ہوا پولیٹھی
 بیگ۔ دوسرے میں برس کا پینٹل تیز دھوپ سے
 بچنے کو چادر کا لپیٹتے پر آگے تک سر کیا ہوا تھا گاڑی
 کا تیز دھڑکن اس کے قریب بجا تھا وہ چونکی بے ساختہ سر
 اٹھا کر دیکھا۔

کاشٹ فرنٹ ڈور کھولے بیٹھا تھا وہ بے ساختہ
 مسکرائی۔ گاڑی میں بیٹھ کر بہت محبت اور پیار سے
 اسے دیکھا۔ پاسی میں سیراب ہونے لگی تھی۔ کاشٹ
 نے گاڑی آگے بڑھائی۔

"دفتر سے آ رہا ہے۔" اس کی نظر اس کے چہرے
 سے نہیں ہٹ رہی تھی۔

"ہاں۔"

"تو گھر کیوں نہیں آتا؟" کتنی حسرت اور خواہش
 تھی اس کے لیے میں کاشی نے پل کی پل نظر میں
 زانوہ اس کی جانب بدلتا تھا۔

"گھر میں وہ جو ہوتا ہے۔" اس کے لیے میں نفرت
 ہی نفرت تھی کہ اب وہ اقبال کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔
 فخر نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"وہ...؟" فخرہ کرائی۔ "وہ تیرا بھی تو کچھ لگتا ہے
 نا؟"

"وہ فراٹھا، دھوکے باز، بد معاش میرا کچھ نہیں لگتا
 ہاں تمہارا شوہر ہے۔" کاشی نے فوراً اسے جواب دیا تھا۔
 اور اس کا یہ طعنہ فخرہ کے دل میں پیوست ہو گیا تھا
 اس کے چہرے پر دکھ اور اذیت پھیل گئی تھی۔

"اور اسے میرا شوہر کس نے بنایا تھا۔ تمہارے بھول
 گئے۔"

"چھوڑنے کے لیے بھی تو کہا تھا نا؟" وہ لب لہجی
 اپنی فطرتی نہیں مانتا تھا۔ ماں کو الزام دیتے ہوئے کہنا
 ظالم اور بے حس ہو جاتا تھا۔

"شادی کھیل نہیں ہوتی۔ میں نے خود اسے لے
 نہیں تمہارے لیے صرف اور صرف تمہارے گھر پر
 اقبال سے شادی کی تھی کاشٹ میں جانتی تھی۔ وہ اپنے

آوی نہیں ہے مگر تم نے تب میری بات نہیں سمجھی
 اور اب جسے تم نے اپنا باپ سمجھا تھا وہ اب محض میرا
 شوہر ہو گیا ہے۔ عزت کے لیے سب سہہ گئی ہوں
 کاشٹ؟"

گلوگیر لہجے میں اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ وہ
 خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ فخرہ نے پیار سے
 اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں یاد نہیں آتی تھیں؟"
 "آتی ہے۔" اس کی نظریں سامنے تھیں۔ مگر وہ
 بیچ بیکر سا تھا۔

"پھر کیوں مجھے نہ آتا ہے؟" فخرہ رو پڑی تھی۔

"خود بھی تو تیرا ہوں۔" وہ لاکھ بے حس لاہوا
 بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھر کی محبت اور تڑپ کے
 سامنے اس کی ہر کوشش رست کی دیوار ثابت ہوتی
 تھی۔

"مجھے سزاوے رہا ہے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔
 "خود کو بے رہا ہوں۔" گاڑی کی رفتار یکدم بہت
 تیز ہو گئی تھی۔ فخرہ کی نظر ایک پل کو بھی اس کے

چہرے سے نہیں ہٹتی تھی۔
 "آجیابا کر کاشی! میری آنکھیں دروازے پر ہی رہی
 رہتی ہیں۔"

جہاں جوں گھر قریب آ رہا تھا۔ فخرہ کی مدح جیسے
 کوئی کھینچتا جا رہا تھا۔
 "اتنی جلدی ہے تجھے مجھ سے دور جانے کی۔" وہ
 جانتی تھی اس تیز رفتاری کا سبب اور دوسرے ہی پل

اسے ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس نے ڈش پر ڈھیر
 پاتھ رکھ کر بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔ گاڑی کا بریک زوردار
 آواز کے ساتھ چرچا اٹھتا تھا۔

"گھر آیا ہے۔" اس نے کلپوں والا بیگ سنبھالا۔
 کاشٹ کروٹ مڑنے والی تھی جب گھر کو دیکھ رہا تھا۔
 فخرہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کاشی! میری جان میرا بچہ آجیابا کر وہاں سے ملنے
 جب تک زندہ ہوں مل لیا کرو۔"

اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے تھے۔ مگر پھر
 اپنی آنکھوں کے کنارے گئے ہو گئے تھے۔ دندھے
 لگے کے ساتھ اس کے جواب کو پینٹل ٹوک کر انتظار
 کیا تھا اس نے مگر وہ جنون گم سم دروازے کی جانب
 دیکھے جا رہا تھا۔ فخرہ اپنا مسلمان سیٹ کر باہر نکل آئی
 اور اس پل گھر کا دروازہ کھول کر اقبال بھی باہر آیا تھا۔

اس نے چونک کر اقبال کو دیکھا اور پھر کاشٹ کو جو
 پناہ تھری سے گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا۔ فخرہ کھٹکے
 گئے قدم اٹھاتی گھر کے اندر آئی تھی۔ کاپیاں میز
 پر رکھ کر اندری ٹیبل کی کرسی چھینٹ کر اس پر بیٹھ
 گئی تھی۔ گھر کے گہرے سانس سے ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنا
 کمرٹ کی پشت سے ہٹا لیا تھا۔ اسے لگا، طویل

مسافت طے کر کے بھی منزل بہت دور ہے۔ اس آبلہ
 پائی نے اسے بری طرح تھکاؤ لایا تھا۔

"آتی تھی کل کیوں بنا رہی ہے تم نے استانی! آج
 تو بیٹے کے ساتھ گاڑی میں چڑھ کر آئی ہو۔ پھر بھی
 خوش نہیں ہو۔" اقبال نے کمرے میں داخل ہوتے
 ہی اسے دیکھ کر طنز کیا تھا۔

"تمہارے ساتھ خوش رہا جاسکتا ہے؟" اس نے
 جمل کر غصے سے جواب دیا تھا اقبال نے سر پر ہاتھ مارا۔
 "مر گئے مسئلہ یہ ہے کہ تم سارا دن بچوں کے
 ساتھ بیک کر کے اور انہیں ڈانٹ مار کر خود بھی
 چڑچڑی ہو گئی ہو یا پھر تم نے مجھے بھی اپنا شاگرد سمجھ
 رکھا ہے استانی! آج؟" وہ اپنی گھنی بڑی بڑی مونچھوں کو
 بل دیتا ہوا فخرہ کو بے حد برا لگا تھا۔

"تم خود کو ان معصوم اور نیک بچوں کے ساتھ ملا
 رہے ہو۔" اس نے نفرت سے اسے گھورا۔ "میری
 حق حلال کی مکملی بازاری عورتوں پر لٹاتے ہو۔"
 "تمہاری مکملی۔ کیا مطلب؟" وہ حیرت سے ٹھٹھکا
 تھا۔

"مجھے بتا چل گیا ہے۔ کمپنی کے پیسے رکھے تھے میں
 نے جو بوتلے کیا تھا۔"

"اسکول میں بچوں کو کچ بولو کا سبق پڑھانے والی
 استانی مجھ سے جھوٹ بول رہی تھی کہ میرے پاس
 پیسے نہیں ہیں۔ انفس بیچ بیچ۔ قوم کے نو نماؤں کو کیا
 سکھار رہی ہو تم استانی؟"

"بہت گھٹیا ہو تم۔" مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اتنے بچ
 ہو۔" ثروت کو اس کی بات سن کر بے حد غصہ آیا تھا۔
 وہ اکثر ہی اس کی ٹیچنگ کو طنز اور ملامت کا نشانہ بناتا
 تھا۔

"اب تو پتا چل گیا نا! آئندہ محتاط رہنا۔" وہ قہقہہ
 لگا کر بیٹھے ہوئے اسے جلاتا مسراتا اپنی مونچھوں کو بل
 دیتا باہر نکل گیا تھا اور مارے غصے اور بے بسی کے فخرہ
 کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس نے آنکھیں بند
 کر لیں۔ سر میں درد شدید تر ہونا جا رہا تھا وہ اس
 وقت کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ادیں تھیں

کہ سیلابی ریلے کی مانند اندی چلی آ رہی تھیں۔

”ارے یہ گاڑی کہاں سے لی تم نے؟“
برآمدے کے صحن میں کاشف دیوٹ کنٹرول گاڑی
بھاگ رہا تھا، اسکول سے آئی تو دیکھ کر حیرانی سے پوچھنے
لگی۔

”اقبال انکل نے گفت دیا ہے۔“ کاشی کی دیرینہ
خواہش پوری ہوئی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ مگر
فاخرہ کے ساتھ پریشانی بھر آئی تھیں۔

”کیوں لیا تم نے ان سے گفت؟ میں نے تمہیں
منع کیا تھا میری اجازت کے بغیر کسی سے بھی کچھ نہیں
لیتا۔“ اس نے غصے سے اسے ڈانٹا۔

”وہ تو میرے انکل ہیں بابا کے دوست مجھے بہت پیار
بھی کرتے ہیں۔“

”اوہ وہ تو جی! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ یہ اتنا مرگ
گفت! ان سے کیوں لیا تم نے بڑے ہو گئے ہو تم سمجھا
کو۔“ اچھا نہیں لگتا، وہ نہیں کے یہ کتنا بھوکا بچہ ہے
جھٹ سے گاڑی لے لی۔

فاخرہ نے زنج ہو کر اسے پاؤں سے پکڑ کر قریب بٹھا
لیا تھا۔ مگر اس کے سمجھانے کا کوئی برابر فرق نہیں پڑا
تھا۔ اس کی ساری توجہ فرش پر دھری ہوئی گاڑی پر
تھی۔

”جھٹ سے نہیں لی۔ وہ دفعہ منع کیا تھا انہیں۔ مگر
انہوں نے میری بات ہی نہیں مانی۔ زبردستی دے دی۔
پھر میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ میری ماما مجھے مارے گی
تب وہ کہنے لگے کہ تمہاری ماما تمہیں کچھ نہیں کہے
گی۔ کیونکہ میں تمہارے بابا کا ہیوسٹ فرزند تھا اور
تمہارے بابا بھی مجھ سے گفت لے لیتے تھے۔“

کاشی نے تفصیل بتائی تو وہ ایک پل کو خاموش سی ہو
گئی تھی۔ آج کل اقبال کی کاشی سے دوستی اور محبت
کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

”اسندہ مجھ سے اجازت لے بغیر تم ان سے کچھ
نہیں لو گے، سمجھ گئے پڑا بابا۔“ اس نے نرم لہجے میں

اسے پیار سے سمجھایا۔

”ہی۔۔۔“ اچھے اقبال انکل بہت اچھے لگتے ہیں۔ مگر
وہ میرے ابو کی جانی تو لگتا اچھا ہے۔“

”کاشف! وہ حیرت سے اس کی بات کاٹ کر کہنے
”کس نے کہا تم سے یہ؟“ اسے اپنے بدن پر
چھوٹا سی ریگٹی محسوس ہوئی تھیں۔

”کاشی نے بھی نہیں۔ میں خود سے کہہ رہا ہوں۔“
تو سالہ بچے کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر وہ سارے
رہ گئی تھی۔

”وہ تمہارے ابو۔۔۔“ اس نے بمشکل یہ جملہ بولا تھا
”نہیں سن سکتے ہیں۔۔۔ اسندہ یہ بات نہ سوچنا اور نہ ہی
بولنا سمجھتے تم اتنی طرف سے تو اس نے بے حد تکی سے
انکار کر کے کاشی کو سمجھا دیا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی
کہ اس ننھے سے جلغہ کی برین واشنگ کس طرح کی ہو
رہی ہے۔ کاشف تو بچہ تھا۔ پیار محبت اچھے تھانے
کھانے پینے کی چیزیں وہ اسے پوری طرح سے قریب
ہو چکا تھا۔

”اقبال صاحب! آپ میرے بچے کو پکڑ رہے
ہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی آپ اس کے لیے آئے ہیں۔
گفت نہیں لائیں گے۔“ یہ سلسلہ حد سے بڑھ رہا تھا
تب مجبوراً اس نے اقبال سے دوہدو بات کی اور کاشی
سے ڈانٹا تھا۔

”ارے فاخرہ جی۔! آپ ایسے ہی پریشان پوری
ہیں۔ میں تو بچے کو اس احساس غم سے لگنا چاہتا ہوں۔
جس میں وہ باپ کی وفات کے بعد سے ڈوبا ہوا ہے۔
آپ اسے مجھ سے ملنے سے منع کرتی ہیں۔ یہ غصے
اس پر وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ آپ کیجیے
جانتی ہیں۔ اگر میں نے اسے نہ سنبھالا ہو تا تو وہ باپ کی
یاد میں رو رو کر پاگل ہو جاتا۔ آپ تو صبح اسکول جاتی
ہیں۔ وہ پھر کو آتی ہیں۔ وہ سارا دن میرے پاس ہی
رہتا ہے۔“ اقبال کے انکشاف پر وہ حق دیتی رہ گئی
تھی۔ کاشی کے اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ جبکہ
اس اسکول میں ٹیچروں کی چھٹیاں نہیں ہوتی تھیں۔
ریاض کی فٹنہ کی وجہ سے بھی وہ کئی ماہ چھٹیاں

نہیں۔ اسی لیے اب مزید چھٹی کا مطلب کئی چھٹی تھا۔
”اقبال کے پاس کیوں جا رہے ہو۔ میں نے تمہیں گھر
میں رہنے کو کہا تھا نا۔“ اس نے غصے سے کاشی کو گھور کر
پوچھا تھا۔

”کیا کیوں رہتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس لیے اقبال
انکل مجھے اپنے گھر لے جاتے ہیں۔“ کاشی نہ ڈر تھا نہ
ی شرمندہ ہوا تھا۔ بڑے دھڑلے سے جواب دیا تھا۔
”خیر، کاہل ڈوب گیا“ اقبال نے بڑی ہمدردی اور چالاکی
سے کاشف کو اپنی منگنی میں کر لیا تھا۔

”تم اسندہ اس کے پاس نہیں جاؤ گے۔ سنا تم
نے۔“ کاشی اس کا بازو پکڑ کر اس نے زور زور سے
باتیں بولنے تنبیہ کی۔

”تو پھر اسے اپنے گھر آنے دیں نا! کاشی کی ضد پر
اسے فہم آیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اچھا آدمی
نہیں ہے۔ تم اسندہ اس سے نہیں ملو گے۔“

”میں نا۔۔۔ ضرور ملوں گا۔“ اچھا آدمی ہے۔ مجھے ابو
سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے اور مجھے وہ سب کچھ دیتا ہے
کہ آپ نے بھی کبھی لے کر نہیں دیا۔“ وہ ضد اور ہٹ
دھرم سے کہہ کر وہاں سے ناراض ہو کھٹا گیا تھا۔ فاخرہ
نے بے سارفتہ قہقہہ دھری کر سی کا سہارا لیا تھا۔

”کیا کہوں اسکول بھی لے کر نہیں جاسکتی ہوں۔
گس کے پاس چھوٹوں۔ اس کے لیے یہ مسئلہ سب
سے بڑا اور خطرناک بن گیا تھا۔ کاشی جس حد تک
اقبال کے زور اثر تھا۔ اس کے بعد فاخرہ کا سمجھنا ڈانٹنا
”اگر میں سب بے کار تھا۔ وہ بچہ تھا۔ وہ اقبال کو جانتا
تھا کہ وہ کیا ہے۔ اور یہ ہی فاخرہ اسے یہ سمجھا سکتی
تھی۔

”ریاض کی زندگی میں بھی وہ اقبال کو پسند نہیں کرتی
تھی اور نہ ہی اسے اقبال اور ریاض کی دوستی پسند تھی۔
بڑا عجیبو سی تھی کہ اقبال اس کا بچپن کا ہم چلی اور
بڑے ہمارے تھے مگر غلط محبت کی وجہ سے اچھی شہرت
نہیں رکھتا تھا۔ کئی بار وہ جو کھیلے پکڑا گیا تھا۔ وہ اقبال
کے گھر سے گارڈن میں سے بھی بلانا پسند نہیں کرتی

تھی۔

”نہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے ریاض
کے دوستوں کے بعد انہوں نے پلٹ کر رمن اور بھانجے
کو نہیں پوچھا تھا کہ وہ کس حال میں کہاں ہیں فاخرہ
تو کڑی کڑی اپنا کماتی ہے۔ یہی بات سب کے لیے کافی
تھی۔ باقی اسے کسی کے جذباتی سہارے کی ضرورت
ہے یا انفرادی سہارے کی۔ کوئی نہیں سوچتا تھا۔

”تو کیا مجھے کاشی کے لیے“ کئی راتوں کی سوچ بچار

تھی۔ کیا اس کا اپنا بیٹا اس کا دیوانہ ہو رہا تھا۔
ریاض کی ناگہانی آجائیکہ وفات کے وقت اقبال نے
خود سے آگے بڑھ کر تمام انتظامات سنبھال لیے تھے
ان کی ہڈیوں میں جب فاخرہ بیوی کے غم میں جلا ہوش
و حواس کھوئے ہوئے تھی۔ اقبال کاشی کے قریب آیا
تھا اور جب فاخرہ کو علم ہوا تو اپنی سرسے لڑ رہا تھا۔

”کاشی! خدا کے لیے تم سمجھ جاؤ۔ تم بچے ہو۔
تمہیں نہیں پتا اقبال اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ وطن
رات اسے سمجھائی تھی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم وہ بہت اچھا ہے۔ مجھے بیٹا کہتا
ہے۔ بہت پیار کرتا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ میں
تمہیں ڈاکٹر بناؤں گا۔ میں تمہیں بڑھاؤں گا۔ تمہارا
خرچہ اٹھاؤں گا۔ اسے آگ لگ گئی تھی۔

”تمہارے خرچے اٹھانے کو میں ہوں بلکہ کس چیز
کی کمی ہے تمہیں؟“

”ابو کی۔۔۔“ اس نے کتے مزے سے کہا تھا کہ کتے
ہی پل فاخرہ پلک کھینچے بغیر سالت اسے دیکھتی رہی
تھی۔

”کیا واقعی؟ واقعی اسے باپ کی کمی محسوس ہوتی
ہے؟“ تب پہلی بار اس نے سوچا تھا۔

”میں اتنی جلدی شادی کیسے کر لوں۔ دنیا کیا کہے گی؟
مجھے باپ بھی میری زندگی کا کسکی فاخرہ۔ کیا ریاض کے مرنے کا
انتظار کر رہی تھی۔“ کوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا
تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ بات کیسا طوفان
کھڑا کرے گی۔ ریاض تو اکیلا تھا۔ والدین حیات نہ
تھے نہ کوئی دوسرا رشتہ بھائی تھا۔ مگر اس کے اپنے بڑے
بھائی۔۔۔

”انہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے ریاض
کے دوستوں کے بعد انہوں نے پلٹ کر رمن اور بھانجے
کو نہیں پوچھا تھا کہ وہ کس حال میں کہاں ہیں فاخرہ
تو کڑی کڑی اپنا کماتی ہے۔ یہی بات سب کے لیے کافی
تھی۔ باقی اسے کسی کے جذباتی سہارے کی ضرورت
ہے یا انفرادی سہارے کی۔ کوئی نہیں سوچتا تھا۔

”تو کیا مجھے کاشی کے لیے“ کئی راتوں کی سوچ بچار

تھی۔

”نہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے ریاض
کے دوستوں کے بعد انہوں نے پلٹ کر رمن اور بھانجے
کو نہیں پوچھا تھا کہ وہ کس حال میں کہاں ہیں فاخرہ
تو کڑی کڑی اپنا کماتی ہے۔ یہی بات سب کے لیے کافی
تھی۔ باقی اسے کسی کے جذباتی سہارے کی ضرورت
ہے یا انفرادی سہارے کی۔ کوئی نہیں سوچتا تھا۔

”تو کیا مجھے کاشی کے لیے“ کئی راتوں کی سوچ بچار

کے بعد وہ اس نکتے تک پہنچی تھی اور اسے کاشی کی ایک ہی رت تھی۔ "قابل انگل۔"

"میں کاشی کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ میں اسے باپ سے بھی بڑھ کر یادوں کا اسے دیکھا لکھا کر اچھا انسان بناؤں گا اور آپ کو بھی فخر دینی اچھے سے سمجھی کوئی شکایت نہیں ہوگی یہ میرا وعدہ ہے۔"

اور وہ اس شخص کے وعدے پر اعتبار کر بیٹھی۔ جس نے بھی وعدہ وفا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

سارا اور میرپ لان چیزز پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر مابین پوہوں کو پانی دے رہی تھی۔

"وہ چشمہ تو میرپ... میرپ کی طعنے نہیں پورے لان میں کوئی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر پوہوں کو پانی دینا مابین بے ساختہ چوکی تھی۔"

"تم ان میرپ! اچھا خاصا اینٹ بندہ ہے وہ واکنز ہے۔" سارا نے سرزدش کی توبہ چوکی کی۔

"اما آپ کے دل میں کیا چل رہا ہے؟" اس نے تجسس سے آنکھیں پوری کھول کر مایا کو دیکھا تھا۔

"میرپ نہیں، تمہارے پیار کے دل میں رضا بھائی نے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"

"اوہ نوٹائیں۔ یہ ساری دنیا میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟" میرپ کا بے حد فخر بھر الجھ اور ایسا مغرور انداز تھا کہ مابین نے مڑ کر بہت دیر تک اسے دیکھا تھا اس کے لیے رشتے آتے تھے تو وہ ہنسنے لگتی تھی، "خو کرتی، میں نے نکاحی انکار کر دیتی تھی اور مابین اس کے لیے تو کوئی رشتہ آتا ہی نہیں تھا اور اگر آتا بھی تھا تو چوائس کا حق اسے حاصل نہیں تھا۔ کتنی حسرت تھی اسے کہ کبھی وہ بھی کسی کو انکار کرے انہیں جو اس کے منہ پر اسے برا بھلا نہ صورت کہہ کر دل آزادی کر کے جاتے تھے اور وہ تب بھی انہیں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔"

"کیوں، شادی نہیں کرنی تم نے؟" سارا نے

استفسار کیا تھا۔

"کرتی ہے۔ مگر میرپ سے نہیں۔" اس نے ہلکے مزے سے جواب دیا تھا۔

"کیوں۔" واکنز نے وہ سارا کے نزدیک اس کی تعلیمی قابلیت خاصی اہم تھی۔ اسی لیے بار بار انہیں

"واکنز کی کاسٹریٹیکٹ اپنے ماتھے پر چمکانے لگتی تھی۔ بالکل پسند نہیں ہے جو آپ دے ہیں رضا انگل کو۔"

"تف تم نہ جانے کیا چاہتی ہو۔ اپنی چوائس ہی کم از کم بتاؤ۔"

"تمہارے ماما اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" میرپ کے انداز میں لاپرواہی تھی۔ اس نے جوس کا گلاس ٹیبل پر رکھا اور اپنا موبائل نکال لیا تھا۔ سارا نے غلطی سے اسے گھورا۔

"ایک کارشتہ نہ آنے کی وجہ سے ہم پریشان ہیں اور دوسری کے زیادہ آنے کی وجہ سے غمگین کر رہی۔"

سارا غوی ایسے ہی بے رحمی سے تجسس کرتی تھی کہ سامنے والے کا دل کٹ کر رہ جائے اور انہیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ابھی مابین کو لگا اس کے دل میں کسی نے پن چھو دی ہے۔ میرپ زور زور سے ہنس رہی تھی۔ مابین کا ہاتھ سارے ہوا کیا تھا۔ پانی کی موٹی دھار مسلسل ایک ہی پوہے پر گر رہی تھی۔

"اما بازار چلیں نا سب۔" وہ جوس کی ہنسی کو اب دیکھ کر سارا پر زور دینے لگی تھی کہ وہ بہت بار یاد کرنے کے باوجود سارا شہزاد کی وجہ سے بازار جانے سے گریز کر رہی تھیں۔

شہزاد ابھی تک نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں مار مار رہا ہو گا، صبح سے نکلا ہوا ہے۔ شام بڑھ چکی ہے۔ اپنے اپنے حوصلوں میں واپس آگئے ہیں۔ شہزاد بہت فکر مند ہیں اور افسوس سے کہہ رہی تھیں۔

مابین کو بھی یک دم احساس ہوا تھا کہ شہزاد ابھی آج صبح سے غائب ہیں۔

"اما آپ ان کے لیے پریشان ہیں اور وہ لوگ تو

مفت مشورے بانٹ رہے ہوں گے۔" میرپ نے مذاق اڑایا تھا۔

"ہائے میرا بھولا بھائی۔ گھر آنا بھی بھول جاتا ہے۔"

"آجائیں گے ماما جب مفت مشورے سننے والا کوئی نہیں لے گا تا تو گھر ہی آئیں گے۔ ہم کب تک انتظار کریں گے، مجھے کل کے فکشن کے لیے جوتا لینا ہے۔ پکڑنا نہیں۔"

"تمہیں اپنے جوتے کی فکر ہے۔ ماموں کی نہیں۔" سارا نے حلقی سے اسے گھورا۔

"بچے نہیں ہیں وہ دوسروں کو پاگل کرنا خوب جانتے ہیں وہ۔" اس نے آگے شکر ہے۔ "میکداس کی ٹھیکٹ سے اندر داخل ہوتے ماموں پر بڑی غلطی اور اس نے با آواز بلند شہزاد کیا تھا۔ سارا بے ساختہ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔"

"السلام علیکم آیا۔" شہزاد ماموں حسب معمول بہت فریخیں اڑا رہا تھا۔ اس نے لگ رہے تھے۔

"کہاں تھے تم صبح؟" سارا نے اسے گھورا۔

"میں... وہ وہ پہلے تو اوھر چلا گیا تھا۔ پھر اوھر آ گیا۔ اور پھر اوھر اور پھر اوھر پھر گھر آیا۔" وہ بڑے مزے سے کہہ کر کسی پریشہ کر آیا کا چھوڑا ہوا تھکا گلاس جوس اٹھا کر پینے لگے تھے۔ مابین کو پریشانہ ہنسی آئی تھی۔

"میں سن میں۔ اوھر سے اوھر، اوھر سے اوھر میں شام کر دی جناب نے۔" میرپ نے گھور کر ماموں کو دیکھا تھا۔

"شام ہو گئی ہے ماموں۔"

"شام گھونٹی میں تو کہہ رہے تھے کہ صبح ہو گئی ہے۔"

"ہاں کہہ رہے تھے۔ مگر وہ دوسرے ماموں کے لیے تو وہی والوں کو یہاں کہ ایسا تو تباہ نمونہ ہمارے گھر میں بھی موجود ہے تو یقیناً شام ہو گئی ماموں کے لیے کپ کو یک کر لیں۔" میرپ کو کوئی موقع دے ماموں کو اٹھا کر پانی کا شہزاد نے یکدم منہ پھیر کر آیا کو دیکھا

مفت مشورے بانٹ رہے ہوں گے۔" میرپ نے مذاق اڑایا تھا۔

"تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ تم تنازعات مکمل گزار کے آئے ہو۔ لال سے کیا وعدہ کیا رہی ہوں۔ بہت شرمندہ کرواتے ہو تم مجھے شہزاد! سارا نے انہیں اچھی طرح گھورتے ہوئے ڈانٹا تھا۔

"لب اٹھ بھی جائیں ماما! ماموں بھی آگئے ہیں۔"

"کہاں جا رہے ہو آپ؟" شہزاد فوراً الرٹ ہوا تھا۔

"میں بھی نہیں۔ اب آپ ساتھ مت لٹک جانا۔"

"میں کیوں لٹک کے جاؤں گا؟ میٹ پر بیٹھ جاؤں گا؟" انہوں نے فوراً وضاحت دی۔ مابین نے شکر اکر انہیں دیکھا۔ اپنے نام کے ایک تھے وہ۔

"شہزاد! میں بازار جا رہی ہوں۔ تم اب گھر ہی رہو گے۔" سارا نے غلطی سے ڈانٹا تھا۔ "تم نے کھانا کھایا؟"

"نہیں آپا اہم سے بھوکا پیاسا ہوں صبح کا کھانا دے دو۔" ان کے چہرے پر بے حد عاجزی اور مسکینی جھلک رہی تھی۔ سارا نے گھبراہٹ سے لیا۔ یہی تو انہیں بھی خوف تھا کہ وہ بھوکا ہو گا۔

"ماما! میں نے بھی کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ مجھے بھی بازار جانا ہے۔" مابین نے قل بند کیا اور باپ سمیٹ کر اپنا دامن جھاڑتی اس کے قریب آگئی تھی۔

"ہاں ہاں آیا! لے جاؤ گے جاؤ۔ اس بے چاری کو بھی بازار لے جایا کرو۔"

"شہزاد! سارا نے غصے سے انہیں گھورا پھر مابین کو دیکھا۔

"ہم آج راجہ صاحب کی طرف بھی جائیں گے۔ تم کل ڈرائیور کے ساتھ بازار چلی جانا۔" مابین کے چہرے پر یکدم مایوسی پھیلی تھی۔

"ارے کیا! راجہ صاحب کی طرف تو یہ بھی جاسکتی ہے نا! بلکہ اسے لے کر جایا کریں تاکہ اس کے اندر اعتماد آئے اور ہو سکتا ہے وہاں سے اس کا رشتہ بھی

آجائے۔

"اف اللہ! سارا علوی نے سر تمام لیا تھا۔" یہ تمہارے مفت مشورے تمہیں برباد کر دیں گے شہزاد! جاؤ جا کر کھانا کھاؤ۔" سارا علوی کا دل چاہا ایک چھترے جڑیں اور شہزاد بھی بہن کا غصہ دیکھ کر دیکھ گئے تھے۔

"ہوں رشتہ آجائے۔ اسے ساتھ لے کر جاؤں گی تو آئے والے بھی نہیں آئیں گے۔" انہوں نے باہن کو طنز سے دیکھا اور پھر میرب کو دیکھا۔

"چلو اور شہزاد اکٹرا کھول کر سن لو۔ اب باہر مت نکلتا۔ ورنہ اسٹور میں ہند کر دیں گی تجھے ساری ماموں کو کھانا دے دو۔" انہوں نے چلتے چلتے ساری ہدایات دیں تھیں اور پھر میرب کے ہمراہ لان سے نکل گئی تھیں۔

"ماہی! تم بد روی ہو یا شہزاد نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی نظریں ماں اور بہن پر تھیں اور آنکھوں میں جھلملاتے آنسو سارا علوی اسے بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھیں۔ باہن کو ساتھ لے کر جانا انہیں اپنی توہین لگتی تھی۔ وہ ہر جگہ بازار فریڈز کی طرف لفٹکش میں میل پاریش میں سب جگہ میرب کے ساتھ جالی تھیں۔

"ماہی! نہ رو۔ تم بہت اچھی ہو میں تمہارے ساتھ چلوں گا بازار۔" انہوں نے پارے سے بچوں کی طرح ہنس لیا تھا۔ ماہی کے رے آنسو یکدم گالوں پر پھیل گئے تھے۔ ماموں بچپن سے ہی اس کی حمایت میں اپنی آپا سے ڈانٹ کھاتے آ رہے تھے۔

"میربے پاس بیٹے ہیں۔ آپا سے چھپا کر رکھے ہیں۔" جمہیں سوٹ لے کر دیوں گے بس آپ چپ کرو۔ شاپاش "چپ کرو۔" وہ بالکل چھوٹی بچی کی طرح اسے پارے خاموش کر رہے تھے باہن نے آنسو پونچھے۔ موسلا دھار بارش میں یکدم دھوپ چمکی گئی۔

"مجھے کھانا دے دانا پھر تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے آئیں، ٹھیک رہیں گے کراہیں گے۔" وہ ان کا بازو تھام کر اندر آگئی تھی۔ اس نے غصہ سے کھانا گرم کر لیا۔ کھانے کے دوران اسے اجپاس ہوا تھا کہ وہ تپتے بھوکے تھے۔ پونجی قاسم اور احمد پھرتے ہوئے گھر سے باہر وقت گزارنے کے دوران انہیں کھانے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ خود سے مارا ہوا "مت تنگ ٹائپ انسان تھے اسی لیے لوگ ان کی باتوں کا برا بھی نہیں مانتے تھے اور جانتے تھے کہ ہر تک شکایت بھی پہنچاتے تھے۔

"بتا ہے کیا ہوا۔ ابھی جب میں آ رہا تھا تو راستے میں خالہ جان مل گئیں۔"

انہوں نے کھانے کے دوران ہی بات شروع کر دی تھی انہیں اپنے کارٹے سنانے کا بہت شوق تھا اور ان کے کارٹے سوائے باہن کے کوئی اور سنا بھی کب تھا۔ میرب تو بالکل خاموش تھی۔ وہ اپنے بھی اس کے پاس "اتنا فالتو" وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ ماموں کے فضول قصے اور بے وقوف باتیں سنیں۔ اپنی ایک کدو سنا نہیں سکتے تھے کہ اپنی ذہن پرست جھانپ رہی تھی۔ دونوں سارے قصے بھول جاتے تھے۔ البتہ باہن ہنسی توجہ دیکھی سے سنتی اور مزے لیتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس ایک یہی تو خوش ہونے، ہنسنے کا موقع ہوتا تھا۔ جو شہزاد ماموں کی آمد سے بھی بچی یا اکثر ملتا تھا۔

"کون سی گون سی خالہ جان ماموں!"

"ارے وہی۔ جن کی رنگ برنگی کو بھی ہے۔ گیت گلا تو پورا سن گلیں دروازے پر فون آدھی سن رہی ہیں۔"

"اچھا اچھا پھر کیا ہوا۔"

"وہ خالہ جان مجھے راستے میں ملی تھیں۔ میں نے کہا خالہ جان کہاں جا رہی ہیں۔ یوں میں ہونے بیٹھا ہے۔ ملک پیک لانے کو میں نے کہا اتنی گرمی میں کیوں جا رہی ہیں۔ جواب دے دیتیں۔ یوں میں کیے جواب دیں "خواتون! میں جھگڑا ہو جاتا ہے مجھے بد مزے آتا ان پر کہ اس کی ہوا انہیں اپنی دھوپ گرمی میں گزار کر دیتی ہے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ

طلاق دوا کر جان چھڑائیں۔ ورنہ وہ آپ کو ملازمہ سمجھ رہے گی۔ اب تم بتاؤ اس میں قصہ والی کیا بات تھی جھانپا راض ہو گئیں لیکن۔ کم بخت دس سال شادی کو ہو گئے ہیں۔ چار بچوں کی ماں ہے۔ طلاق دے دو۔ دفع ہو جاؤ! اپنے مفت مشورے اپنے پاس لے کر جھانپا کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ میں نے تو ان کا فائدہ سوچا تھا اننا مجھے کون سے ڈانٹتے لگیں۔"

شہزاد ماموں بڑی معصومیت اور بھولپن سے اسے بتا رہے تھے۔ ہنس ہنس کر باہن کی آنکھوں سے پانی نکل آیا تھا۔

"تو مت دوا کر سن نا توگوں کو مفت مشورے۔" اس نے آنکھیں صاف کیں۔

"لو تم بھی مجھے ہی منع کر رہی ہو۔ واہ بھی واہ۔" ماموں نے خاصا برانا تھا باہن نے بمشکل ہنسی روکی۔ "بہن! رہا کرو۔ تمہاری بہن بہت اچھی ہے۔" ماموں نے غصے سے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ ان کے لیے پانی لانے چلی گئی تھی۔ مگر وہ اسی کے پارے میں سو پتے جا رہے تھے۔

"کیا کو احساس ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ سنی زبانی کرتی ہیں۔"

انہوں نے بڑے دکھ سے سوچا تھا۔ سارا کی نظر میں بدحوہ پاگل بے وقوف تھے۔ ماموں کے معاملے میں ان کی سوچ بہت پختہ تھی۔ بچپن سے ہی وہ باہن کے لیے آپا سے لڑتے تھے۔ آپا کی زیادتیوں پر احتجاج کرتے تھے۔ روٹی ہوئی باہن کو بھلاتے تھے۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ اسی کے قریب تھے اور اس سے محبت بھی بہت کرتے تھے۔



"ماہی! اچھے دس روپے دیں۔" وہ یکدم دروازہ کھل کر اندر آیا تھا۔ بیڑہ فاختہ کے قریب بیٹھا اقبال بیٹا تیزی سے پیچھے ہٹا تھا۔

"لوگے مجھے بد مزہ انٹا کے اندر رکھا آ رہا ہے۔" ماموں تیز نہیں ہے۔ آئندہ بغیر اجازت ہمارے

کمرے میں مت آنا۔" اقبال نے غصے سے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور کر دیکھا اور ڈانٹ دیا تھا۔ کاشی یکدم سہم کر کے ساتھ آگیا تھا۔ فاختہ کا دل جیسے کسی نے بد روی سے دیا دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں بچہ ہے۔ ایسے کیوں ڈانٹ رہے ہو۔ میں سمجھا دوں گی۔"

"اچھی طرح سمجھاؤ نا اب یہ صرف تمہارا کمرہ نہیں ہے میرا بھی ہے۔"

اقبال کشت بے چارے میں اسے کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ فاختہ نے سہمے ہوئے کاشی کو یکدم سمجھ کر اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اس نے تو بھی اپنے بچے کو اس سختی سے نہیں ڈانٹا تھا۔ بے ساختہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ماہی! اکیلے مجھے ڈانٹتے ہیں۔" کاشف نے شکایت کی تھی۔

"کب۔۔۔ اور کب ڈانٹا تھا تمہیں؟" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کل۔ کہہ رہے تھے لوگے مجھے دفع ہو جائی رہی نظروں کے سامنے سے۔" کاشی نے ناراضی سے کہا تو وہ بری طرح چونکی۔

"تم کیوں گئے تھے اس کے پاس۔"

"بس ایسے ہی۔ میں تو پارے گیا تھا مگر اکیلے مجھے ڈانٹ کر اسے کمرے سے نکل دیا۔ ماہی! اکیلے ایسے کیوں ہو گئے ہیں جیسے تو ایسے نہیں تھے بہت پیار کرتے تھے اب کیوں نہیں کرتے؟ وہ مصوم لہجہ میں کیسے سوال پوچھ رہا ہے۔ جن کے جواب فاختہ کے پاس تھے ہی نہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے اقبال سے بعد میں پوچھا تھا۔

"کیا بد مزیزی کی ہے اس نے تمہارے ساتھ لڑو کرتا ہے۔ وہ۔ تم نے خود ہی تو اسے اپنے ساتھ اتار فری کر لیا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح تمہارے ساتھ کھینچا چاہتا ہے۔ تم سے فری ہوتا ہے تو تم ہنسنے کرتے ہو۔ اتنی جلدی تم میرے بچے سے ٹک گئے ہو اقبال! فاختہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے باؤں ہوتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں اور بچوں کے لئے
- یکساں منیہ
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 سی سی 42 سی سی 100 سی سی کے بوتلیں دستیاب ہیں۔
 کے مرزا بہت مشکل ہیں لہذا یہ قدرتی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں
 دیکھی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں ہوتا۔ اگر آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں تو ایک
 بوتلی کی قیمت صرف 100 روپے ہے دوسرے شہروں کے لئے بھی آرڈرنگ
 کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہر جگہ سے منگوائیں اور جلد سے منگوائیں۔
 حساب سے لگائیں۔

- 2 بوتلیوں کے لئے = 250 روپے
- 3 بوتلیوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیجنگ چارج شامل ہیں۔

منی آفر بھجوتے کے لئے ہمارا پتہ:

پتہ: بی بی، 53 اورنگزیب مارکیٹ، پیکٹ فورڈ، اسلام آباد۔
 بعضی خبر دینے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان چیکوں
 سے حاصل کریں۔
 پتہ: بی بی، 53 اورنگزیب مارکیٹ، پیکٹ فورڈ، اسلام آباد۔
 پتہ: عمران خان، 37 اورنگزیب مارکیٹ،
 فون نمبر: 32735021

”کہہ رہا تھا۔ میرے جوتے بالٹ کر رہ گئے۔ میں نے کہا
 کہ میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ تو پھر دسے امارت کاوشی
 جاتے تھے۔ دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ قاخروہ
 کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اسے سینے سے لگا کر وہ خود بھی رو
 رہی۔“

”خاتم“ بے رحم ٹھٹھا اتماری جرات کیسے ہوئی
 میرے بچے پر ہاتھ اٹھانے کی۔ ”مارے غمے اور طیش
 کے اس کی گواہ بچٹ گئی تھی۔“

”ایسا۔ ایسا۔“ اقبال نے اس کے کچھ پکارتے وجود کو
 دیکھ کر زور سے قہقہہ لگایا۔

”بچے کی بد تمیزی دیکھی ہے۔ کیسے بڑھ بڑھ کر
 باتیں کرنا ہے۔ سوتیلے کا فرق ڈال دیا ہے تم نے
 اس کے دل میں۔ اب یہ مجھے کچھ نہیں سمجھتا۔ کبھی
 گھر سے نکلنے کو کہتا ہے۔ تو کبھی گالیاں دیتا ہے۔ میں
 اس کا باپ لگتا ہوں قاخروہ! اسے سمجھاؤ عقل تمیز
 سکھادو۔ میں خود اسے عقل تمیز سکھاؤں گا۔“ اقبال
 نے کسی لحاظ اور گلی لپٹی کے بغیر اسے سنائی تھیں اور
 دھمکی بھی دی تھی۔ قاخروہ نے سم کر کاشی کو اپنے
 ہاتھوں میں سمیٹ لیا تھا۔

”ای! یہ گھر ہمارا ہے نا۔ ہم انکل کو کہیں نہیں
 نکالتے۔“ کاشی بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔ اس
 نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”نہیں نکال سکتے کاشی! اب نہیں نکال سکتے تمہیں
 نہیں پتا تم نے پہلے میری بات نہیں مانی۔ میں کتنی
 گناہ اقبال اچھا آدمی نہیں ہے۔ تم اسے حرمت لاؤ۔“

”خاتم نے اسی کی بات نہیں مانی اور اب دیکھو لو وہ
 نہیں مانتا۔“ اقبال نے کہا اور مجھے بھی۔ وہ اب اس گھر کا
 مالک ہے۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا اور تم میری
 بات دھیان سے سنو کاشی! ”کیدم اس نے آنسو
 پونچھ کر کاشی کو کندھوں سے تھام لیا۔

”دیکھو اب“ اب ہمیں اس سے نہیں لڑنا۔ اگر
 کیا سے کیا تو وہ ہمیں مارے گا۔ تم تم اس کے
 ساتھ بالکل بات نہیں کرو گے خاموشی سے اپنا نام
 لگاؤ۔ میں تمہیں یوں مار کھاتے نہیں دیکھ سکتی

زندگیوں میں شامل ہے اور جب تک۔“
 بے ساختہ لب بکھل گئی۔

”تو انہیں زندگی سے نکال دیں۔“
 ”کاشف۔“ اس نے دل گرا سے دیکھا۔

”آئندہ۔ آئندہ یہ بات مت کہنا۔“ وہ خوشی
 کی اسے سمجھانے لگی تھی۔

”کیوں۔“
 ”وہ۔ یہ اچھی بات نہیں بیٹا! وہ تمہارے

ابو بن گئے ہیں۔ اور ابو کو اپنی زندگی سے نہیں
 نکالتے۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بچے کو

کیسے سمجھائے کہ یہ پسندیدہ کھلونا حاصل کرنے کی منہ
 نہیں تھی کہ اسے حاصل کیا اور تو ذکر بھی تک ڈال۔

تو زندگی بھر کا سمجھو تھا جو اس نے شخص اپنے بچے کی
 خوشی کے لیے کیا تھا۔ مگر وہ بھی خوش نہیں تھا۔ قاخروہ

کے لیے ہر نیا دن پہلے سے زیادہ مشکل ہو جاتا تھا۔ اقبال
 اقبال جو پہلے صرف قاخروہ کی غیر موجودگی میں کاشی کو

ڈانٹ لیا کرتا تھا اب کھلم کھلا قاخروہ کے سامنے اس
 جھڑک دیتا تھا جب منع کرتی تھی تو اسے بھی لگاؤں کا

الزام دیتا۔ وہ بری طرح پھینک گئی تھی۔ ایک طرف سے
 بیٹا اور دوسری طرف شوہر اور دونوں اس سے ناخوش

تھے۔ اقبال الزام لگاتا تھا کہ وہ بیٹے کی حمایت کرتا
 ہے۔ اسے شہر دیتی ہے کہ وہ اس سے بد تمیزی کرے

اور دوسری جانب کاشی کہتا تھا کہ ”تم انکل سے بات
 مت کرو۔ ناراض ہو جاؤ اسے گھر سے نکالو۔“ جو اس

کے لیے ناممکن بات تھی۔
 اور اس روز تو حد ہی ہو گئی تھی۔ اس کو اس کے آگے

تو کاشی زور زور سے رو رہا تھا۔ اس نے وجہ پوچھی تو
 ”انکل نے مارا ہے۔“ اس کا دل ریزہ گیا۔

”کہاں۔ دکھاؤ۔“ اس نے زبردستی اس کا ہاتھ
 اس کے گل سے ہٹایا۔ اس کا گھر گل پر پانچوں انگلیوں

کے نشان ثبت تھے۔
 ”یہ یہ کیا! کہیں بار اس نے؟“ مارے غمے کے

”لاڈلہ پار کا مطلب بگاڑنا نہیں ہوتا۔ سر پر چڑھنے
 کی کوشش کرنا ہے۔“ اقبال کا انداز اور لہجہ بالکل

بدلا ہوا تھا۔ قاخروہ کے اندر کھنٹی بجی تھی۔ اقبال جیسے
 شخص سے اسے بہت زیادہ اچھالی کی بہت زیادہ امید تو

نہیں تھی۔ مگر پھر بھی اتنی جلدی وہ اپنی اصلیت دکھا
 دے گا۔ یہ بھی حیران کن تھا۔

”کاشی! تم تم آئندہ اقبال انکل سے ایسے فری
 مت ہونا۔“ اس کا دل خون کے آنسوؤں سے لگا تھا۔

”کیوں پہلے تو مجھے بہت مبارک دے تھے۔“
 ”پہلے کی بات اور تھی۔ میں جان گئی ہوں اس کی

چال۔ مگر تم نے تمہاری ضد نے مجھے بھی اس عذاب
 میں مبتلا کر دیا ہے۔“ کاشی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ منہ ہی منہ میں بوڑھا رہی تھی اور بہت پریشان تھی
 اور آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کاشف

کی بات مان کر اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ کتنا غلط تھا۔
 ”تم انکل جاؤ میرے گھر۔“ تم اچھے انسان نہیں

ہو۔ تم اندھے ہو۔ جھوٹے ہو۔ مجھے ڈنکے ہو مارے
 ہو۔“ اب تو ان دونوں کا لڑائی جھگڑا ہر دوسرے دن

ہونے لگا تھا۔
 ”کو اس بند کر چنگی سے مسلہ دوں گا تجھے۔ بدلتا

مجھے گھر سے نکالنے والا اسے میں تیری ماں کو نہیں
 چھوڑوں گا تو خود اسے چھوڑ دے گا۔ سمجھا۔“ اقبال

نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کا چہرہ سختی سے پکڑ کر
 خطرناک انداز میں اسے دھمکی دی تھی۔

”ای! انکل کہتا ہے کہ میں تمہیں گھر سے نکال دوں
 گا۔“ رات کو جب اقبال گھر نہیں تھا اور وہ اسے سلا

رہی تھی تو کاشف نے اسے بتایا۔
 ”کیوں۔ تمہاری اس سے لڑائی ہوئی تھی کیا؟“

وہ بری طرح چوکی۔
 ”نہیں مگر مجھے گھورنا رہتا ہے ہر وقت میں نے

کامات گھوڑو تو ناراض ہو گیا۔ ای! وہ اچھے انکل نہیں
 ہیں۔ انہیں گھر سے نکال دیں۔“ اس کی ضد پر قاخروہ

ہوں۔ "خانہ روزی تھی۔
"امی! کاشی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے
آنسو صاف کیے۔

"تمہیں پرہنا ہے۔ بہت سارے ہٹا ہے۔ تم پرہ کر
مضبوط اور بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ نا تو پھر میں بھی
تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ہم علیحدہ گھر میں رہیں گے۔
مگر ابھی ابھی میرا نوکری کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم
دونوں کو زندہ رہنے کے لیے اس نوکری کی ضرورت
ہے۔ اقبال کچھ نہیں کرتا۔ وہ تو ہمیں ایک روٹی تک
نہیں دے گا۔ اس لیے بیٹا پلیر میری بات سمجھ جاؤ۔
مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں اقبال تمہیں کوئی نقصان نہ
پہنچا دے۔ میں اسکول سے تو پچھلی نہیں کر سکتی ہوں نا!
تم بس اس سے چھڑا مت کیا کرو۔ وہ جو کہتا ہے۔ کہتا
رہے۔ تم مت بولا کرو۔" اوکے؟

خانہ نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ سرتو ہلا رہا تھا۔ نہ
جانے سمجھا تھا یا نہیں۔ مگر خانہ کو اب ہر وقت اسی کی
فکر لگی رہتی تھی اسکول میں بھی وحیان گھر میں ہی انکا
رہنا تھا۔ کیونکہ اقبال سارا دن خود گھر میں گزارتا تھا۔
وہ سارے زبانی نکالی کے کاروبار ہوا ہو گئے تھے جن کی
تفصیل اس نے شادی سے پہلے بتائی تھی۔ خانہ کو وہ
بھی اسی بات کا تھا کہ پہلے صرف وہ اپنا بیٹا پال رہی تھی
اور اب اسے اقبال کا بھی تمام خرچ اٹھانا پڑا تھا۔ وہ
جوتے کا عادی تھا۔ نشہ بھی کرتا تھا۔ یہ اذیت ناک
انکشاف اسے شادی کے بعد معلوم ہوا تھا۔

"میں جاب چھوڑ دوں گی۔" ایک ہفتے کی چھٹی ختم
ہو گئی تھی اس نے اقبال کو سنایا۔ اقبال یوں اچھلا تھا
جیسے کرنٹ لگا ہو۔

"جاب چھوڑ دو گی۔ مگر کیوں؟"

"میں گھر پر توجہ دینا چاہتی ہوں اقبال! آپ کی
خدمت کرنا۔"
"ٹھہرو، ٹھہرو! اگر واقعی تم میری خدمت کرنا چاہتی
ہو تو نوکری مت چھوڑنا۔ ہرگز مت چھوڑنا۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
"بھئی اگر تم نے جاب چھوڑ دی تو ہم صاحب کے
کمال سے۔ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟"
"گھر کا خرچ اچھا۔ آپ کا کاروبار!"

"ارے میرے کاروبار کی آپ میں مت زبرد
بولی روزی ہے۔ جس دن اچھا برس ہو گیا۔ اچھے
میسے مل گئے اور جس دن دھندا نہیں لگا۔ کوئی خبر
نہیں تمہاری لگی بندھی تھی۔"

اور اسی دن خانہ... کو یہ بات کھل گئی تھی کہ اقبال
کے سارے دعوے محض زبانی تھے۔ وہ کس سے
تصدیق کرواتی۔ کسے کہتی اس شادی کی وجہ سے پہلی
ناراض ہو گیا تھا۔ اسی لیے اپنے ساتھ ہونے والے
اس دعوے کو مبرا اور حوصلے سے سہہ گئی تھی۔ محض
کاشف کے لیے جس کے ساتھ اقبال کا سلوک بہت
برا ہوا تھا۔ اور وہ اس کی گھر موہو گئی تھی۔ کوشش
کرتی تھی کہ ان دونوں کا تار تار نہ ہونے دے۔
"مگر پھر بھی۔ پھر بھی میری ساری کوششوں کے
باوجود میرا بیٹا مجھے چھوڑ گیا۔" اس نے دکھ سے سہا
اور اپنا سر جھکے پر کر لیا۔

ابھی اسکول سے آتے ہوئے وہ بس شاہ بازار
پیدل گھر آرہی تھی تو گھر کے سامنے سے ایک ٹیکسی
روانہ ہوئی تھی۔ جس میں اقبال کے ساتھ کوئی اور
عورت بھی تھی۔

"یہ کون ہے اور میرے گھر میں..." اس کے قدم
یکدم زمین میں بیوست ہوئے تھے۔ بھری دھڑکن
تھے سونے تھے اس کا دل رو رہا تھا۔ اپنے ہی گھر جانے
کا تصور کس قدر لذت ناک تھا۔ ایک کراہت کا
احساس سر تپا اسے جھلایا تھا۔

"تو قوت اب یہاں تک آگئی ہے۔ میرا گھر اس
مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔" وہ رگڑتی ٹیکسی
میں بیٹھی ملاؤن، "میں سنواری وہ چھٹک چھلوسی عورت
اس کے ذہن میں آرہی تھی اقبال اس کے ساتھ گئے

بہن ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خانہ کے ساتھ بات
کرتے ہوئے تو اس کے ہاتھ کے بل نہیں جاتے تھے
اور اسے کرائے کی عورت کتنی طاقتور تھی۔
"تج میں اس سے بات کروں گی۔ ضرور کروں گی۔"

یہ سلسلہ پہلی ہی ٹوک جاتے تو بہتر ہے۔ ورنہ...
اس نے کپکپا کر جھرجھری لی۔ "ورنہ میرا گھر طاقت کا
دھرم بن جائے گا اور مجھے اپنا گھر بچانا ہے۔"

اس کے اندر اس سوچ نے ایک نئی طاقت بھری
تھی۔ وہ کچھ مطمئن سی اٹھ کر کاشف کے لیے کھانا
پانے چل دی۔



"اوہ سوری میں نے آپ کو مبارک باد دینی تھی
میرا گھر بھول گئی۔ اب کچھ سی میری ایک فرزند کی ہر تھ
اسے تھی تو!"

میرب بات کرتے کرتے لاؤنج کے صوفے پر آ
پڑی تھی۔ دوسرے صوفے پر مایا بین بیٹھی ہوئی تھی۔
"یکدم ارٹ ہوئی۔"

"کمال ہے" آپ کو ہماری اتنی بڑی خوشی بھول گئی
اور ہم ہیں کہ آپ کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی یاد
رکھتے ہیں میرب جی!"

میرب کے حسرت زدہ لمحے میں شکایت کرنے پر
میرب نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔ وہ برسے برسے
منہ بتاتی اس سے بات کر رہی تھی اور مایا بین بغور اسے
دیکھ رہی تھی۔

"میرب جی! سارا سارا گناہ لکھنا ہے۔ ڈاکٹر ہے
اور میرب پھر بھی خیرے سے بات کر رہی ہے۔ خیرے
دیکھا رہی ہے۔ اگر میرب مجھ سے بات کرنا تو... بس نے
سب سامنے اپنا ہونٹ کاٹا۔

"جی میں نہیں ضرور کوشش کروں گی۔ تاہم ملاؤ
ضرور آؤں گی۔"
"تاہم ملاؤ نہیں میرب جی! پلیر آپ نے کتاب ہے۔"

آپ کی وجہ سے تو میں یہ پانی ارنج کر رہا ہوں۔ پلیر!
آپ کے آنے سے میری پانی کی رونق ڈبل ہو جائے
گی۔" میرب نے دائیں آنکھ ہاتھ ہونے لپک کر آن
کر دیا تھا اور مسکرا کر مایا بین کو دیکھا تھا۔

"جی جی میرب! میں کہہ رہی ہوں نا! میں آنے
کی پوری کوشش کروں گی۔"

"میرب پلیر!" اب وہ بے چارہ باقاعدہ منت
ساجنت پر اتر آیا تھا۔

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں میرب! اچھا چلیں، سوچتی
ہوں کچھ آؤں گے۔"

"میرب! ۱۳ سپیکر سے میری مضطرب آواز آئی
تھی۔ مگر میرب نے مباہل آف کر دیا تھا۔

"توبہ۔ یہ چشمہ تو جان ہی نہیں چھوڑنا"
میرب جی میرب جی پلیر! میرب نے میرب کی عقل
آدھی تو وہ بھی مسکرائی۔

"تم جلی جانا مایا میری جگہ... اب اس نے اس
کی طرف رخ موڑا تھا۔ مایا بین نے ٹھکی سے اسے
دیکھا۔

"کیوں میں کیوں جاؤں، مجھے تو اس نے انوائٹ
نہیں کیا۔"

"تو۔ یا د میری جگہ چلی جانا۔ مگر پلیر یہ پریل
سوٹ دوبارہ مت پہننا! بالکل ٹینگن لگ رہی ہو تم
، تمہیں کتنا سمجھائی ہوں لائٹ بھر پڑا کرو۔ مگر تمہیں
تو گرا سبز مگر اپنا 'سرخ' لاؤنج کو دیکھو یہ پریل کمر پینڈ
ہے۔ بھئی اپنے رنگ کو دیکھو جب تم یہ سوٹ خرید
رہی تھیں نا! مجھے بتا چل گیا تھا کہ یہ تم پر سوٹ
نہیں کرے گا۔" میرب کو یونہی چلے چلتے کھو گئیں
مارنے کی عادت تھی۔ مایا بین کو غصہ آ گیا۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

پارسیا

1۔ موٹی بھینس نے اوجھا کلو گھی کا پورا پیکٹ سالن میں اندر لے لیا۔
2۔ پیدا کی تھیں پھر بڑی بھاڑ سے ہی گھر صاف کیا، حالانکہ چھوٹی بھاڑ سانسے بیڑیوں کے نیچے پڑی تھی۔
3۔ اور ہاں، موٹی بھینس کے بڑے چھو کرے نے گولڈن کناروں والے ڈنر سیٹ کی ایک پلیٹ بھی توڑ دی۔
شکر ہے مجھے یاد آگیا، نہیں تو اس کی رپورٹ درجانی تھی۔
کا کا چلو نے سکون بھری سانس خارج کرتے ہوئے کالی کو بڑی احتیاط سے بند کیا اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے تھے۔ بند آنکھوں کے پیچھے وہ تصور ہی تصور میں دونوں بھابیوں کو اہل جان کی عدالت میں گھلےسیا تاہو ادیکھ رہے تھے اور ہوشوں پر خود بہ خود ہی گہری مسکراہٹ آتی جا رہی تھی۔
تب ہی انہیں اپنے کمرے میں کسی اور نفس کی مہجونی کا احساس ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے ماتھے پر ہست ساری تیوریاں ڈالنا وہ ہرگز نہیں بھولے تھے۔

”کیا تکلیف ہے چھو کرے! کیوں میرے سر پر کھڑا ہے؟“ ماں نے بیچھا بوا گا میری خبیث نگرانی کرنے، اب منہ سے پھوٹ بھی دے گا کہ لگاؤں ایک چھپڑ۔“
دروڑے میں کھڑے ہست ڈرے ہوئے اشعر کو انہوں نے حسب عادت خوب لٹاڑا تھا۔
”کچھ نہیں چاچو! وہ میں تو۔۔۔“
”جلدی بتانا کیا لڑکیوں کی طرح میں میں کرتے لگے۔“
وہ سر ہلنے سے ٹیک لگا کر اور بھی اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔
”ای جی کہہ رہی ہیں کہ اگر کھانا کھائیں پھر چھوڑا ہو جائے گا۔“ اشعر نے جلدی جلدی اپنا جملہ پورا کیا تھا۔
”اے جاو، بڑا آیا ای جی کا ٹیک پتر میں کیا تو کر ہوں تمہاری ماں کا جو وہ حکم دے رہی ہے، آؤ اور کھانا کھاؤ گمہ دو جا کر خوب میرا دل چاہے گا کھالوں کا“ بھی بھوک نہیں ہے۔“
وہ دوبارہ بڑے آرام سے کراٹ لے کر لیٹ گئے تھے۔
ٹھیک آدھے گھنٹے بعد جب واقعی میں بھوک نے انہیں بے حد ستایا تو آخر اٹھنا ہی پڑا۔
”اچھا ہے تاہ سارا جنجال پورہ اب تک کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں دیک گیا ہو گا۔ اب میں سکون سے تو چھالوں گا۔“
وہ خود کو شاباش دیتے ہوئے یکن میں داخل ہوئے



تھے صرف ستر ایکٹن، جہاں پر جزو علی دھلائی قریب سے رکھی ہوئی تھی۔ اسیں واقعی۔ اچھا لگا تھا۔
”یہ موٹی بھینس بھی باصفائی غصہ کی کرتی ہے،“ بان بڑے گا۔“ وہ دل ہی دل میں اپنی بڑی بھابی کی توفیق کرنے لگے تھے۔
ایک کونے میں رکھے آٹے کے کنستریٹ پلیٹ کے اندر ہی سالن پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیا گیا تھا۔ گرما گرم دہلی اور سالن میں پوری پانچ بوئیاں، وہ ایک لمحے میں ڈھیروں ڈھیر خوش ہو گئے تھے۔
”اچھا، آج تو قحط کی موٹی بھینس، ورنہ اگر سالن میں ایک بول بھی۔۔۔ کم ہوئی تو مال کے سامنے میں تو تیرا کس اچھا خا خا خا کر دیتا۔“
وہ تصور کے گھوڑے پر بیٹھ چکے تھے۔ سوا ب اترنا لگ تھا۔
یوں تو اہل جان کے تین بیٹے تھے اور تین ہی بیٹیاں۔ لڑکیوں کو تو انہوں نے بس ستر ہوئیں، انہوں نے سال ہی اپنے گھروں کا کیا تھا۔ ہائی نیچے بیٹے تو لکھن سے بھی بڑے دو تو جانے کتنے سالوں سے

محض پردہ کی ہو کر رہ گئے تھے۔
”بھینس کے ابا جی جب اللہ کو یاد ہے، ہوتے تو گھر میں بھلا کیا تھا بچوں کا نوکر اور غریبوں کا مرگ، میں نے بھی ہست نہیں باری۔ سلائی مشین کی ہتھی کو جو پکڑا تو بس پھر نہ دن دیکھا اور نہ ہی رات، کسی نہ کسی طرح خلیل احمد اور خلیل احمد کو باہر کے ملک بھجوا دیا، پھر ان کی کمائیاں بھی فضول نہیں آؤا میں، تینوں بیٹیوں کو جیڑے کرک دے کر بھجوا دیا، گھر بنایا، اور پھر بیٹے بھی پیاسے گندھ کے فضل سے۔ بس جی اپنی تو ساری دھوون میں ہی لڑ رہی۔“ اہل جان کی یہ یونیورسل اسٹوری ہر اس بندے کو بھی ازہر ہو چکی تھی، جو انہیں اپنی پوری زندگی میں خواہ ایک بار بھی ملا ہو۔
میں نے آپ کو بتایا نا، اہل جان کے تین بیٹے ہیں، جی ہاں، بیٹا احمد کا ذکر تو ہوا ہی تا، یہ موصوف ہیں اصل میں، کا کا چاچو کیا جی جب گزروے تو ان کی عمر محض پانچ بیٹے تھی۔ اہل جان نے اس کا کہ کو جو خوب زور سے اپنے سینے سے لگایا تو پھر آج تک نہیں چھوڑا۔
”کا کا کہاں ہے؟ اس کا دھیان رکھو، کا کے نے

دودھ لی لیا تاکہ کے نے کھانا کھایا تاکہ کے پکڑے اور جانے لیا کچھ۔

قصہ مختصر یہ کہ بس کاکے اور لال جان کا معاملہ تو جن اور تو تے والا ہی تھا۔ جن موصوف تو پھر بھی اس تو تے کو اپنے نظموں سے بہت دور کسی ہوائی عمل یا طلسمی غار میں بہت سنبھال کر رکھ چھوڑتے تھے۔ لال جان کو تو کاکے سے لمحہ بھر کی جدائی بھی منظور نہ تھی۔ خلیل احمد اور خلیل احمد نے کئی بار کاکے کو اپنے پاس بلا کر کہیں کام پر لگوانے کا عندیہ دیا تھا۔ مگر اس کے رد عمل میں لال جان کو پڑنے والے باہر تیب نشی اور دل کے دورے اتنے شدید اور طویل ہوتے تھے کہ جیل احمد کا پاسپورٹ تک بننے کی بھی نوبت نہیں آسکتی تھی۔

دونوں بھائیوں کی شادیاں بچے اور پھر گھر کے سو جھیلے جن سے تنہا واقعی اکیلی عورتوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ آخر کار سب کو ہی لال کی دور اندیشی کا قائل ہونا واجب واقعی کاکے نے آگے بڑھ کر پورے گھر کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں بہت کامیابی سے لے لیا تھا۔

بچتے، بچتیاں انہیں کاکا چاچو کہنے لگے اور پھر یہی ان کا نام پڑ گیا۔ بھائیوں کی ڈھیروں ڈھیر کمائیوں کی حشل کاکا چاچو کا ذاتی بینک اکاؤنٹ تھی۔ اس میں سے ہر مہینے گھر کا خرچہ نکالتا، دونوں بھائیوں کا حصہ دیتا، حتیٰ کہ خاندان میں خوشی غمی کے مواقع پر لین دین بھی کاکا چاچو ہی کے نازک کندھوں کا بوجھ تھا۔ جسے وہ بخوش اٹھائے پھرتے تھے۔

مگر یہ کمائی اتنی بھی سادہ نہیں تھی۔ بھائیوں کی کمائی پر اصل پیش تو خود کاکا چاچو ہی کرتے تھے۔ بھائیوں کو وہ ہر مہینے انتہائی کم میے دے کر خریدا کرتے تھے۔ گھر کی ضرورت کی ہر چیز وہ خودی لاتے مگر انتہائی ناپ تول کر اور افراد خانہ کو ہر صورت اسی میں گزارہ کرنا ہوتا تھا۔ بھائیوں نے چند ایک بار اس سراسر بے انصافی پر احتجاج کی کوشش ضروری کی تھی۔

مگر لال جان اور کاکا چاچو کے دے دے گئے عورتوں کی کمر حق پر پھونکنے خلیل احمد اور خلیل احمد کو نوکریاں مل کر کھانڈ۔

مگر اس سے بھی بڑا کمال یہ تھا کہ گھر میں بظاہر سارا کنٹرول لال جان کے ہاتھوں میں نظر آتا تھا۔ کاکا چاچو کا کام تو محض چوکیداری جیسا تھا۔ وہ سارا دن مال تاک کر افراد خانہ کی غلطیوں کو نوٹ کرتے شاہد تھے۔ رپورٹ مال جان کے حضور پیش ہوتی۔ اور پھر تقریباً ہر رات ہی ان کی "مدالت خصوصی" میں کسی بیوی بچے کی پیشی لانا ہوتی۔

"بیوی! آج تم نے کپڑے دھوئے وقت بھر لال سارا لیلی اور صابن ضائع کر دیا۔ مانا کہ تم جس گھر آئی ہو وہاں ایسی ہی فضول خرچیوں کا رواج ہو گا۔ مگر اب یہ میرا گھر ہے۔ رہتا ہے تو میری مرضی سے رہو۔ ورنہ خلیل احمد کے آنے سے بھی پہلے تمہیں ضیاع پکڑ کر باہر نکال دلاں گی آئی سمجھ۔" لال جان کپڑے تیار دل سے مخاطب ہوتی تھیں۔

بی لالی کئی تھی سو اس کی سعادت مندی تو لازمی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اکثر ہی زیرِ عتاب ہوتی تھی۔ اگر لال جان کو کہیں جانا پڑتا تو کاکا چاچو کچھ زیادتی پھیل جاتے۔ ان کے پیچھے گزرتے ہرے کی رپورٹ وہ جی جی گاٹی میں نوٹ کر کے رکھتے تھے اور پھر پوری "ایمان داری" سے لال تک پہنچاتے تھے۔ اب اگر اس میں وہ شوقی تحریر کے لیے اپنی طرف سے کچھ برضا بھی دیتے تو کیا بڑا اقبال رومیں رہا۔

بھائیوں کو یہ پکڑے دھوئے ہیں۔ میرے یہ دیکھو ابھی تک کئی کال ٹویپے لگا ہوا ہے آسٹن پر۔ کاکا چاچو نے اپنی بی بی کیس ان کے سامنے حتیٰ تھی۔

"میں بھی کیا کرتی، صلیب ہی ختم ہو گیا تھا۔" چھوٹے بیوی کی واضح بد تمیزی کو بمشکل نظر انداز کر کے وہ جھلائی تھیں۔

"اب سب سمجھتا ہوں میں۔ باقی سب کے کپڑے تو مل جاتے ہیں تم سے، میری باری پر صلیب ختم ہو جائے گی۔ آئیے دو لال کو سب سے تباہی لگا۔" وہ بچوں کی طرح انگلی اٹھا اٹھا کر انہیں ڈراوے دے رہے تھے۔

"مہوشہ بڑا آیا، لال کا ڈالا، کمائی ہمارے شوہروں کی اور پیش کرے یہ بیویا نکمہ۔" کاکا چاچو کے جاتے ہی بھائی نے ہاتھ میں پکڑے آٹا اٹھا کر چارپائی پر دے مارے تھے۔

"کیا ہوا بھائی، کیوں رزق پر غصہ نکالتی ہیں۔" چھوٹی بھائی نے فوراً "بی بی ڈر کر اس آٹو کو اٹھایا تھا جیسے اسے کوئی چوٹ لگ گئی ہو۔

"ہاں یہ روز روز کی۔" وال "سبزیاں تمہیں رزق لگتی ہیں ناں، کیسا ہوتا ہے رزق؟ مگر تم بھی کیا کرو شکلیں بی بی، تم نے کہاں دیکھی ہے میرے جیسے جیسی رہاں تک۔" بچے میں سوال دن سات طرح کے ناشتے پڑتے ہیں۔ اور باقی دو وقت میں "وال سبزی کے ساتھ گوشت کی دیش لازمی ہے۔" بچے میں بھی روز کچھ نہ کچھ خاص، کبھی کبھار کبھی ریڑی، کبھی آئس کریم اور کبھی۔

بیوی بھائی واقعی خیالوں میں کھو گئی تھیں۔ نیم نہیں رکھ چھوڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی اپنی ہونے والی بے عزتی سے قطعاً "لاروا" بیوی دلچسپی سے ان کے امیر کے خیال میں رہی تھیں۔

"تمہیں تو اپنی اپنی قیمت ہے ناں بھائی، آچھ لوگ کیسے میں پیش کرتے ہیں تو کچھ سسرال میں۔" وہ بڑے آرام سے لیٹے تین کالی سیانی بات کہہ کر پھر گھر سے اٹھ چھلنے لگی تھیں۔ بیوی بھائی کا فوری طور پر تکیا دل چاہا کہ وہی آٹا اٹھاں اور تڑتڑ کر کے بھول بھائی کے سر پر گولیوں کی طرح دے ماریں مگر یہ بھی کمال آسان تھا۔

دنیا بھر سے منتخب حکایتی ادب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com



بہار دیوتا کے پیچاری

سحر زادی

کاروان

سامع

اسٹیپی مورقی

فریڈی رات

آخری بازی

آخری بازی

آخری بازی

کا کاجا چو نے ڈھیر ساری برقیوم خود پر چھڑکتے ہوئے آئینے میں اپنے عکس پر بہت کمری توصیفی نظر ڈالی تھی۔ فیصل آباد کی مشہور کاشن کا آسانی رنگ کا کمرہ ڈھارا سوٹ، سروں کی منگنی والی چل چلائی میں وہی کی خاص گھڑی، گھٹے میں گولڈ کی موٹی چین بہت منگنی بار سے کروالی گئی شیوہ والی بہت اچھے لگ رہے تھے۔

اسی بات کی تصدیق کے لیے وہ بڑے کو فرسے باہر صحن میں نکل آئے تھے جہاں دونوں بھائیوں اور بچے موجود تھے۔ جب کچھ دیر تک وہاں کھڑے رہنے کے باوجود کسی نے بھی ان کو بلانا تو ایک طرف ایک خاص نظر تک ڈالنا کوارا نہیں کیا تو وہ بھی منہ ہار آگے بڑھ گئے تھے۔ آج اہل رحیم یار خان سے واپس آرہی تھیں اور وہ انہیں لینے ریلوے اسٹیشن جا رہے تھے۔ ”اچھا اب بس بھی کرنا اتنی زیادہ بھی تھکوت نہیں ہوئی تھی۔“ اہل جہان نے اپنی ٹانگیں ان سے چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا ہے اہل! آٹھ ڈیڑھ اور دہانے سے ہاں بیچ مجھے تو برا اچھا لگتا ہے تیری خدمت کر کے۔“ وہ پھر سے شروع ہو گئے۔

”رہنے دے“ اوجھ میرے پاس لیٹ جا، بڑی ضروری بات کرنی ہے مجھ سے۔“ وہ کچھ بیزاری بولی تھیں۔

”ارے ہاں اہل آباد آیا میں نے بھی بہت ساری ضروری باتیں کرنی ہیں مجھ سے۔ تیرے پیچھے یہ دونوں بھائیوں تو بالکل ہی بد لحاظ ہو جاتی ہیں سیدھی گھٹے میں نے تو کالی میں لکھا ہوا ہے ہر روز کا حال۔ سب سے زیادہ شکایتیں تو اس موٹی ٹیبلٹس کی ہیں۔ سین ڈرل۔“ وہ کالی صول کر پڑھنے ہی لگے تھے۔ جب اہل نے اسے بند کر دیا۔

”توئی یاد رکھا ہے مجھے۔ اب شادی کر لے، گھر بسالے، مگر تو کب سنتا ہے۔ بڑا ارمان تھا مجھے اپنی بیٹی لانے کا سوچا تھا کچھ بھاء کا بوجھ بھی لگا ہو گا اور میری بھی قدر کرے گی۔ برقیوم وہی نا، چل اس بار تو وہ

ساتویں کو بھی بیاہ کر فارغ ہوئے۔ اور تیری بھی چھٹی چھٹی۔ وہاں شادی میں پتا ہے لوگوں نے توئی باتیں سنائیں مجھے کسی بہن بوڑھا جو بھائی کا خیال کیا ہو۔ کسی ایک جھجکی کوئی ہو جائے لیکن۔ آخر میں میں جتن کی ماں ہو۔“

اہل بیٹھ کی طرح جذباتی ہو چلی تھیں اور کاجا چو آگے لگے تھے۔

”کیا مصیبت ہے اہل! اتنے دن بعد آئی ہے اور یہ وہی فضول باتیں۔“ وہ منہ ہار کر بولے تھے۔ ان کا منہ دیکھ کر اہل بھی چپ سی ہو گئیں۔

”اچھا یہ پتا عمر کوئی جری لے کر دی یا نہیں۔؟“ انہوں نے واقعی بات بدل دی تھی۔

”نہیں اہل۔“ وہ سر ہجھاتے ہوئے بولے۔

”پر کیوں؟ میں تجھے پیسے دے کر بھی تھی تار۔“ انہوں نے جرح کی تھی۔

”وہ مجھے نے جو تے لئے تھے اپنے لیے میں بولے لیے تو پھر پیسے ہی ختم ہو گئے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا۔

”تو نے اس معصوم بچے کو ساڑھے چار سو کی جرح نہیں لے کر دی اور خود یہ یا نہیں سو کی جرحین۔“ کچھ شرم کر جھیل احمد اب وہ بڑی والی جوت ہار

پچھنے کی توقع ہی ہوا تھا۔ ”وہ ماتے پر ہاتھ مار کر بول تھیں۔“

”تال اسے کیا تکلیف ہے اہل! اپنے بھائیوں کی کھائی سے کھانا ہوں۔ کوئی اس سے بگم کر نہیں کھاتا۔“ کاجا چو کو تو یہی لگ گئی تھی۔

”تیرے بھائی ان کے شوہر اور ان کے بچوں کے باپ ہیں عمیر ایٹا! اور ان کی خون پینے کی کالی پوس سے زیادہ حق ان کو گول کھانی ہے سیدھی تو ان کی موٹی ہے کہ انہوں نے ہمیں یہ سب سونپ دیا ہے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں بھی خود کو بدل لینا چاہیے۔“

جوان جہان ہو مجھ بوڑھی جان کا کیا بھروسہ کرنا۔ ”نہ تو خیر ہے“ نے بلایا تو بھلا کیا منہ دکھاؤں گی وہاں۔“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھیں۔

”کیا ہو گیا اہل! بڑی نیک ہو گئی ہو۔ اتنی تھکی باتیں کرنے لگی ہو۔ ابھی تو تم اچھی خاصی ہو۔ اچھا چلو دل چھوٹا نہ کرو۔ پتہ ہے اس بار ہم دونوں میں بیٹا ج کرنے جائیں گے۔ بس اسے مینے ہی در خواستیں لکھیں گی۔ میں کل ہی حلیل بھائی کو فون کر کے کہتا ہوں اس بار اور بھی زیادہ پیسے بھیجیں اور میں ڈرا گھر کا خرچہ بھی اور کم کرنا ہوں بڑے فضول خرچ ہو گئے ہیں سارے کم بخت اور ج کے فوراً ہی بعد تو جہاں چاہے شادی کر دینا میری ہمت سے اس بار تو ذرا سارا بھی دل تال نہیں کر رہا لگ۔“

ایک ہی سانس میں انہوں نے سارا اپنا تال سنا کر اہل جان کی طرف دو طلب نظروں سے دیکھا تھا جن کے چہرے پر ابھی بھی اچھی خاصی بیزاری کا لکڑا تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گئی تھیں۔

”میرا خیال ہے اہل! تو واقعی بہت تھک گئی ہے۔“ اہل سوچا۔ میں جتنی بند کر دیتا ہوں۔ اپنی توقع کے مطابق رد عمل نہ پکار کاجا چو کا موڈ بھی خراب ہی

اگلی صبح بہت مختلف تھی اور خلاف توقع بھی۔ رات کو اچھی خاصی سوئی اہل جان صبح اٹھ ہی نہ پائی تھیں۔ اس جہان سے اس جہان کا سفر انہوں نے اپنی خاموشی سے کیا تھا کہ ساتھ کی چار پائی پر سوئے پڑے کاجا چو تک کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی۔ اور اپنی اس بے

تنبہی پر انہیں بڑی شدید حیرت تھی شاید صدے سے بھی زیادہ۔

بڑی آواز تو بس مال کو دفن نہ ہی آئیں اور لیٹ گئیں۔ ان کی اپنی جہان جو رہنے لگی ہوئی تھی۔ اور اکثر نے

”نہ ان گل میں ہی ڈھیلووی کی باتیں خورے رکھی تھی۔“ بھلی آواز بولی جھڑت کو آکر لکھیں۔

اور پھولی آیا تو خیر پورے بندہ دن رہی تھیں۔ دونوں بھائیوں میں بھی صرف غلیل احمد ہی آسکے تھے

وہ کچھ ہندوں کے لیے۔

سب ہی مصروف تھے ماسوائے کاجا چو کے جن کی آنکھیں اس دن کے بعد خشک ہی نہ ہوئی تھیں

ان کی صلا یا بجوری تھی یا نہیں جانا تھا سوہ فرست

سے بیٹھے اپنی ماں کا سوگ منا رہے تھے سارے بہن بھائیوں نے انہیں سینے سے لگا کر غم خواری تو کی تھی مگر شاید یہ ناگہانی تھی۔ خیر اب وہ بے چارے کام دھندوں میں جا رہے تھے۔ بیٹھے تھے سو واپس اسی دنیاواری میں پلٹ گئے۔

کاجا چو نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو پورے کمرے میں اچھی خاصی روشنی نظر آتی تھی۔ آج انہیں واقعی بہت دیر ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بوسے لٹے

وہ کہہ رہے تھے کہ جہاں صحن میں وہی بچوں کا شور اور بھلی بھلوں کی آوازیں تھیں۔ سانس ہی ایک طرف برابر میں سے نہیں سے کمرے تھے جو غلیل احمد

جانے پہلے نہوا کر گئے تھے۔

”تو نہیں جانتا جیل! بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔“ انہیں زیادہ کمریوں کی ضرورت ہے۔“

کاجا چو کے منع کرنے پر انہوں نے بہت سکون سے کہا تھا۔ وہ تو بڑی بھابی کو ساتھ لے جا کر یہ تک میں

ان کا ذاتی اکاؤنٹ تک کھلائے تھے۔

پورے خانے میں وہ بے رحمی اور گندگی تھی جس سے کاجا چو کو شدید نفرت تھی۔ مگر وہ یہ سب کچھ کر

بیس چپ ہی رہے تھے۔ تو ڈیڑھ دیر بعد اشعرانی نے

پچن میں آیا تو حیران رہ گیا۔ بیٹھ کر سی میز پر بیٹھ کر

بہت اچھے برتنوں میں کھانا کھانے والے کاجا چو جب

چاہ سرجھکائے نیچے فرش پر ہی بیٹھے تھے۔ ان کی کوہ

میں ایک اسٹیل کی بیٹھ میں دفن رکھی تھی جسے وہ پانی

کے گلاس میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔

اشعرانہ کھانے پر تھما کر پھر بھی وہ اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ

سکا۔

”کیا ہوا کاجا چو! ایسے سوکھی روٹی کیوں کھا رہے ہیں۔“ فرخ میں مرثی کا سانس رکھا ہے ناں، وہ لے

لیں۔“ وہ پوری ہمدردی سے کہہ رہا تھا۔

”نہیں نے امیرے لیے بس اتنا کھانا ہی بہت ہے“

میری ماں جو عمر گئی ہے۔“

اتنا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے اشعر

سوچتا ہی رہ گیا پتہ نہیں کیوں۔“

☆

علاج

دلہن کے ہاتھوں پہ مندی کیوں نہیں ہے ای؟
 کسی بچی نے دلہن کو پراشتیاق نظروں سے دیکھتے
 ہوئے اچانک اپنی ماں سے معصوم سا سوال کیا تھا اور
 جہاں اس کے سوال پہ اس بچی کی ماں ہنسی نہی وہیں
 خود دلہن کی نظریں اپنے ہاتھوں پہ آکر ٹھہری تھیں۔
 شفاف گلابی، تھیلیاں مندی کے سرخ رنگ اور نقش
 و نگار سے عاری تھیں، ویران اور بے رونق۔
 ”ہمیں ماں ای! دلہن کے ہاتھوں پہ مندی کیوں
 نہیں لگی؟“ بچی نے ماں سے اصرار کیا۔
 اس عورت سے کوئی جواب نہ سن رہا تو اس نے بچی
 کو سرزنش کرتے ہوئے ڈانٹ دیا تھا لیکن اس کے منع
 کرنے سے کیا ہو سکتا تھا جو کچھ بھی ہوا تھا وہ ساری دنیا

جان گئی تھی۔ کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔
 ”ناتمہ! تم ایسا کرو تو من کو اس کے بیڈ روم میں
 چھوڑ آؤ، تھک گئی ہوگی۔“ عارفہ بیگم نے اپنی دیوہیلی
 کی بیٹی کو اشارہ کیا تھا وہ سمجھ گئی تھی اسی لیے فوراً
 صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”آئیے بھابھی! آپ کو لوہر بیڈ روم میں چھوڑ
 آؤں۔“ ناتمہ نے اس کا بازو تھامتے ہوئے سارا اہلیہ
 وہ بھی اس ماحول سے جلد از جلد لٹکانا چاہتی تھی
 اسی لیے بغیر کسی جیل و جنت کے اس کے ساتھ اٹھ
 کر کھڑی ہو گئی۔
 ”گماں جارہے ہیں آپ لوگ؟“ وہ اچانک
 ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا

مکہ خانہ



تھا نامہ کے ساتھ ساتھ دلہن کے قدم بھی ختم تھے۔
تھے۔ سامنے ہی وہ دو اور ناگہان تھا۔

”دلہن رخصتی کے بعد کہاں جاتی ہے؟“ نامہ نے اپنے کیا زانو بھائی کو شرارت سے دیکھا۔

”خام دلہنیں تو رخصتی کے بعد اپنے شوہر کے بیڑم میں ہی جاتی ہیں لیکن اگر خاص ہو اور جی وار ہو تو کہیں بھی جاسکتی ہے۔“ وہ دلہن کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے لشکروں پہ زور دے کر بولا تھا۔
دلہن نے یکدم کرنٹ کھاکے اس کی طرف دیکھا تھا۔
اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اور وہ انتہائی بے نیازی سے آنکھیں پھیر گیا تھا۔

”جائے۔“ وہ اپنی اسی بے نیازی سے کستائیاں پھیر رہا تھا۔

نامہ دلہن کو لے کر لوہے آگئی تھی اور ان کو لوہے آتے دیکھ کر بھائی کزنز بھی یکدم کھیلوں کی طرح اکٹھی ہوئی تھیں۔

”موسیٰ نہیں بولتی؟“ کسی کزن نے کیسے پوچھا۔

نامہ نے جواب نہیں دیا تھا کیا بتائی کہ دلہن نے خود ہی موسیٰ بنوانے سے انکار کر دیا تھا۔

پھر آگے بڑھ کے بیڑم کا دروازہ کھول دیا تھا تاہم پھولوں کی مہک اک جھونکے کی طرح ہر آگئی تھی اور دلہن کا دل ان پھولوں کی خوشبو سے جھنجھٹا اٹھا تھا وہ ٹھنک گئی تھی اندر کسی کے اربانی تھے تھے اور ان اربانوں پہ وہ قدم رکھنے جا رہی تھی۔ گویا روندنے جا رہی تھی۔

اس کے قدم من من پھر کے ہو گئے وہ دلہن کے اندر قدم نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن جب کسی کی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا تو پھر یہ دلہن کیا معنی رکھتی تھی؟
لوگیاں اسے بیڑم بٹھا کر خوش کیاں کرتی ہوئی باہر چلی گئی تھیں اور وہ کسی کے تباہ شدہ اربانوں کے بلے تلے آگئی جہاں وہ گئی تھی۔ پھولوں سے سجائے انگاروں کا ڈھیر محسوس ہونے لگا اور وہ ان انگاروں پہ بیٹھی اپنی روح

سمیت راکھ ہونے لگی تھی۔
نگاہوں سے نکلنے والے شعلے بھانپنا بھانپنا ہے تھے
دل جیسے تپتے تپتے رہ رہ رہ گیا تھا۔

رات اچھی خاصی گرمی ہو چکی تھی جب اسے اپنے بیڑم میں جانے کا خیال آیا تھا اور گہری میں ناگہان دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے دوست حسرت کو رخصت کرنے کے بعد وہ اندر آیا تھا۔ گھر کی تمام فیسی لائٹس آف ہو چکی تھیں ہر طرف صدم ملبہ ملبہ اندھیرا چھایا ہوا تھا وہ سیز حیاں ملے کر آیا اور اپنے بیڑم میں آیا۔ بیڑم کا دروازہ لاک کر کے پلٹا تو ٹھنک گیا تھا دلہن کے ساتھ ساتھ کمرے کا حلیہ بھی بگڑا ہوا تھا انتہائی خوبصورتی نفاست اور ترتیب سے سجے ہوئے پھولوں کی چادر نیچے فٹکلیں پہ ڈھیر تھی۔
سائڈ لیبلز پہ رکھے گلدان پھولوں سمیت لوٹ کر بکھرے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ساری چیزیں اونٹھی پڑی تھیں۔

دلہن کا پاناہیہ آدھا صوفے پہ گرہا ہوا تھا اور آدھا صوفے سے نیچے لٹک رہا تھا۔ سیدیل میں تھے پیرس کہیں تھا اور زیور بھی اور دھو کر کھرا نظر آ رہا تھا۔

وہ ایک ایک قدم بڑھتا آگے آ رہا تھا جب پاؤں کے نیچے کوئی چیز مرا کے رہ گئی تھی اس نے چونک کر قدم پیچھے ہٹا کر دیکھا وہ دلہن کا صوفے کا گلوبند تھا جو اپنی ناقدی پہ رو رہا تھا اس نے نیچے جھک کر وہ گلوبند اٹھا لیا لیکن اس کے بھاری قدموں کی وجہ سے اس کے کئی موٹی ٹوٹ گئے تھے اس نے ٹوٹے ہوئے صوفے اور گلوبند صوفے کے سامنے رکھی کرشل ٹیبل پہ اٹھا کر رکھ دیا تھا۔

وہ خود بیڑم اونٹھی لیٹ چر رہے تھے رکھے ہوئے تھی، موسوز بخت کا پسندیدہ سلور مگر کا لنگ پٹا ہوا تھا لیکن لیٹے کاویٹھ صوفے پہ بھول رہا تھا وہ کمرے میں بکھری بیڑوں سے قدم بچا بچا کے رکھتا ہوا بیڑم کے

قرب آیا تھا۔
”رہے۔“ اس کی بھاری آواز با آسانی اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔

”رہے؟“ اس نے دوبارہ آواز دی لیکن وہ اس سے من نہ ہوئی اور جیسے ہی وہ تھوڑا اور قریب ہوا اس کی نظر دلہن کی کمرے جا گرائی تھی۔ لیٹے کے اوپر پستی دلی کا پچھلا کھا خاصا کمر تھا وہ دھیر دھیر رنگ رنگ گویا نہ کر رہی تھی۔ وہ بمشکل اپنی نظر چرانے میں کامیاب ہوا تھا۔

”میلو اسو گئی ہو؟“ اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا پاناہیہ اٹھا اور وہ اس کے لمس سے یکدم کرنٹ کھاکے اٹھ بیٹھی۔

”ڈونٹ لیج می مسٹر موز بخت!“ اس نے انگلی اٹھا کر اسے غضب نکی سے وارنگ دی۔

”کیوں؟ کیا تم میری بیوی نہیں ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”نہیں ہوں میں تمہاری بیوی نہیں ہوں سبھی تم؟“ وہ یکدم چلا اٹھی۔

”تو پھر یہاں میرے بیڑم میں کیا کر رہی ہو؟“ وہ انتہائی مطمئنان سے پوچھ رہا تھا۔

”میرا بخت رہی ہوں اپنے کیے کی سزا۔“ وہ چپا چپا کر بولی، موسوز بخت سر تپا اسے دیکھ کر دیا تھا روٹی روٹی سرخ آنکھیں، منامنا سانیک آپ گندھوں پہ بکھرے شوڈر کٹ سکی پیل اور بغیر دوپٹے کے اجاگر ہوئی رہائیاں، نظر بہت نہیں رہی تھی۔

”تمہارے لیے سزا ہے لیکن میرے لیے تو اللہ کی عطا کردہ ایک خاص نعمت ہو تم؟“ اس نے گنہگار لہجے میں کہتے ہوئے اس کے رخسار کو سلایا وہ اس کے انڈاز پہ اور بھڑک اٹھی تھی۔

”گاما ہے تاکہ مجھے ہاتھ مت لگائے۔“ ہاتھ پیچھے ہٹاؤ۔“ اس نے سخت پتھر لے لہجے میں کہا تھا موسوز بخت کے ہاتھ اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے جسم پہ کچھ ورک

رہے ہوں۔
”اتنا صبر نہیں ہے مجھ میں کہ میں آج کی رات پیچھے ہٹ جاؤں بلکہ جو کل کی رات گزارا تھی وہ بھی خدا جانتا ہے۔“ اس نے گنہگار بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے اسے اور زور سے بھیج دیا تھا۔

”نہیں کہہ رہی ہوں مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔“ وہ پھنکار کر کہتی ہوئی اس پہ بھٹ پڑی وہ اسے اپنے ہاتھوں سے نوپے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اپنے ہاتھوں کے لیے اس کے ہاتھ روک رہا تھا لیکن جیسے ہی رنچ کے ہاتھوں نے اس کی گردن پہ خراش ڈالی وہ اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر سکا تھا اور یکدم اس کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔

”چٹا!“ وہ اس کے بھاری ہاتھ سے تھپڑ کھا کر کھڑے قدم سے پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔

”ہیں صبر ہو گیا تمہارا یہ تماشہ؟“ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اپنی حد میں رہنا سیکھو۔“ وہ پکی باریوں سے اسے دھانکے بولا۔

”تم مجھے حد بتا رہے ہو؟ حد تمہارے پار کی ہے۔“ وہ چہرے پہ بڑے والے تھپڑ کی تکلیف بھول کر پھر سیدھی بولی تھی۔

”مجھے حد پار کرنے کا رستہ تم نے دکھایا تھا۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”میں نے تو ایک شرارت کی تھی۔“ وہ روہا نی ہو گئی۔

”لیکن میں نے تو کوئی شرارت نہیں کی۔ میں کل بھی سنجیدہ تھا میں آج بھی سنجیدہ ہوں، تم کسی بھی کورٹ میں چلی جاؤ میرا قصور کہیں بھی ثابت نہیں ہوگا۔“ وہ آگ اک لفظ چپا کر بول رہا تھا۔

”تم اتنے بھی بے قصور نہیں ہو۔“ وہ چیخی۔

”میں اتنا قصور وار بھی نہیں ہوں۔“ اس نے کدھے اچکائے۔

”تم بچتاؤ گے اپنے فیصلے۔“
”فی الحال کچھ بتانے کا وقت تو تمہارا ہے۔“ وہ پھر

"سید مہوز بخت! تم نے خسارے کا سودا کیا ہے۔"
"ہو نہ! اتنیس کیا پتا کہ سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی حاصل ہوا ہے تمہاری صورت میں۔" وہ اس کے سر پرے کو مسکرائی نظروں سے جانتے ہوئے بولا۔
"خوش قسمتی ہے تمہاری۔" وہ نفرت سے بول۔
"یہ تو بعد کی بات ہے پتا کہ کون خوش قسم ہے اور کون غلط قسم؟ پہلے تمہارا کہ چھین کر دیکھو یا لائٹ آف کر دوں؟" اس کے لیے اور نظروں کا مفہوم وہ انجان ہونے کے باوجود سمجھ گئی تھی اور سمجھنے کے بعد اس کے جسم میں سستی دوڑ گئی تھی اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

"تم تمنا کیا چاہتے ہو؟" وہ حقارت آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"جو تم سمجھ چکی ہو۔"

وہ معنی خیزی سے کہتا ہوا اس کی سمت بڑھا لیکن وہ بدک کے چبھے ہٹ گئی تھی۔ "میں ہنگامہ مجاہدوں کی اگر تم نے مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی تو۔" اس نے خود غصی دی۔

"سسر ریح مہوز! یہ آپ کی بھول ہے کہ میں آپ کی دھمکیوں میں اگر آپ کو چھوڑ دوں گا اور اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں گا میں ایسے لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوں میں اپنی ضد پوری کرنا جانتا ہوں اور بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ سیدھی طرح سے پیش آئیں ورنہ مجھے لٹاؤ پیش آنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ یہ تو آپ نے آج دیکھ ہی لیا ہو گا؟" وہ اسے گلانی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ چکا تھا۔

ایک موٹی طاقت سے مقابلہ کرنا اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ اس کی ساری جدوجہد ناکام ہو گئی تو وہ بے بسی سے تڑپ تڑپ کر رونے لگی تھی مہوز بخت پہ اس کے آنسوؤں اور سسکیوں کا بھی کوئی اثر نہیں تھا۔ اب چاہے وہ تڑپتی یا ہلکتی اسے کوئی پروا نہیں تھی بقول اس کے اس نے اپنا حق وصول کیا تھا۔

باہر دروازے پر دیوار دستک ہو چکی تھی لیکن بے حس بی ہوشی رہی اور کوئی جواب نہیں دیا تھا مہوز بخت میں منٹ کے وقفے کے بعد دوبارہ دستک ہوئی تھی اس بار دستک متواتر ہونے لگی تھی تب ہی دروازے پر ہونے والی ٹھک ٹھک سے بے سندھ سید مہوز بخت کی نیند کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے چونک کر آگے پیچھے دیکھا وہ دونوں بالوں صوفے پر چھلے ٹھٹھوں کے گرد بازو لیے لب چھینچے بیٹھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

"مہوز بیٹا اور وہ کھولو۔" باہر سے عارفہ بیگم کی پریشان سی آواز سنائی دی تھی اور وہ یکدم اٹھ بیٹھا تھا۔ بیڈ کے دوسرے کونے پر بھی اپنی شرت اٹھا کر بیٹھ ہوئے وہ کمرے میں کھڑی بیٹوں سے پتا ہوا دروازے تک آیا اور بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔

"اندرا نک نام۔" اس نے بیڈ کی طرف کہا۔
"کیا بات ہے سب خیریت تو ہے ناں۔ میں کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں۔" اس نے اتنی تاخیر سے دروازہ کھولنے پریشانی ہو رہی تھی۔
"جی سب خیریت ہے میں سو رہا تھا۔ اس لیے نہ نہیں چلا۔" اس نے ان کی پریشانی کو گئی چلائی۔
"وہ۔۔۔ ریح کیسی ہے؟" عارفہ بیگم نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

"اندرا اگر دیکھ لیجیے۔ کیسی ہے۔" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔
"کیوں کیا ہوا؟" وہ باہر سے ہی اندر کا حال دیکھ چکی تھیں۔

"کیا ہوتا ہے بھلا؟ آپ کسی ملازمہ کو بھیج دیں۔" اگر کمرے کی صفائی کروائے۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"اور ناشا؟"
"خیر۔ ناشا میں مجھے آگاہی کر دیں گے۔"

"اور لیں؟"

"اس کا ناشا آپ اور بھیج دیں۔"

"وہ اسی ناشا کرے گی؟"

"فی الحال اسی بھی کر لے تو بہت ہے۔" وہ گہری سانس خاتج کرتے ہوئے بولا اور عارفہ بیگم پٹ سمجھ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے میں ملازمہ کو بھیجتی ہوں۔" وہ کہہ کر پٹ گئی تھیں اور وہ اندر آگیا۔

"اتنی سستی ہوئی کیوں بیٹھی ہو بھوک کی وجہ سے؟"

نیند کی وجہ سے یا تھکن کی وجہ سے؟ وہ اس کے برابر صوفے پر آ بیٹھا تھا لیکن اس نے پھر بھی سر اٹھا کر مہوز بخت کی سمت نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے سوال پر کوئی رسالہ دیا۔

"گوئے یا راند بولو تمہاری مرضی تین کا دن تمہارا ہے۔"

وہ معنی خیزی سے کہتا اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ سے چھیڑتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلا گیا ملازمہ کمرے میں آکر صفائی کرنے لگی تھی اور اندر ہی اندر حیران ہو رہی تھی کہ صاحب کے کمرے کا کیا جڑ ہو گیا ہے۔ کوئی بھی چیز سلامت نہیں تھی وہ ٹوٹے کاچ کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر کمرے میں ڈال دی تھی۔

"بیگم صاحبہ! آپ بیڈ پر بیٹھ جائیں میں صوفہ بھی صاف کر دیتی ہوں۔" صوفے پر پھولوں کی پتیوں بکھری ہوئی تھیں وہ ان ہی کو سینٹا چاہتی تھی لیکن اس کا پارہ بال ہو گیا تھا۔

"کوئی ہو جاؤ یہاں سے کوئی صفائی نہیں کرنی نہیں آگ لگا کر جلا دوں گی سب کچھ۔" وہ ملازمہ یہ چلانے لگی اسے میں وہ بھی واش روم سے شاور کے آکر نکل گیا تھا۔

"تم جاؤ یہ کام بعد میں کر لیتا۔" اس نے ملازمہ کو نرمی سے جانے کا کہا۔

"جی صاحبہ؟" وہ سر اٹھا کر چلی گئی البتہ وہ باقی ملازمہ کمرے کو کئی حد تک قابل قبول حالت میں

لا چکی تھی۔
"پاگل ہو گئی ہو؟"
"ہاں۔ میں ہو گئی ہوں پاگل، مجھے تم نے پاگل کیا ہے۔" وہ کٹ کھلے کو روڑی۔
"میں صرف دو دن میں ہی؟" وہ اسے چلانے کے لیے بولا۔

اور وہ بے بسی کے اس مقام پر آگئی تھی کہ بار بار آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور بار بار رونے کو بل چاہ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی۔
"تم نے مجھے میرے انہوں سے دور کر دیا ہے مہوز بخت! تم نے مجھے سب کی نظروں میں گرا دیا ہے تم نے مجھے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔" وہ روتے ہوئے پتلیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔
"مجھے اپنی طرف مائل تم نے کیا تھا کیوں مجھے اپنی جھٹک دکھائی؟ کیوں راف کیا تھا مجھے؟" وہ اسے دونوں کندھوں سے تھام کر تنہا ہوتے ہوئے بولا۔

وہ معنی خیزی سے کہتا اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ سے چھیڑتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلا گیا ملازمہ کمرے میں آکر صفائی کرنے لگی تھی اور اندر ہی اندر حیران ہو رہی تھی کہ صاحب کے کمرے کا کیا جڑ ہو گیا ہے۔ کوئی بھی چیز سلامت نہیں تھی وہ ٹوٹے کاچ کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر کمرے میں ڈال دی تھی۔

"بیگم صاحبہ! آپ بیڈ پر بیٹھ جائیں میں صوفہ بھی صاف کر دیتی ہوں۔" صوفے پر پھولوں کی پتیوں بکھری ہوئی تھیں وہ ان ہی کو سینٹا چاہتی تھی لیکن اس کا پارہ بال ہو گیا تھا۔

"کوئی ہو جاؤ یہاں سے کوئی صفائی نہیں کرنی نہیں آگ لگا کر جلا دوں گی سب کچھ۔" وہ ملازمہ یہ چلانے لگی اسے میں وہ بھی واش روم سے شاور کے آکر نکل گیا تھا۔

"تم جاؤ یہ کام بعد میں کر لیتا۔" اس نے ملازمہ کو نرمی سے جانے کا کہا۔

"جی صاحبہ؟" وہ سر اٹھا کر چلی گئی البتہ وہ باقی ملازمہ کمرے کو کئی حد تک قابل قبول حالت میں

لا چکی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو؟"

"ہاں۔ میں ہو گئی ہوں پاگل، مجھے تم نے پاگل کیا ہے۔" وہ کٹ کھلے کو روڑی۔

"میں صرف دو دن میں ہی؟" وہ اسے چلانے کے لیے بولا۔

اور وہ بے بسی کے اس مقام پر آگئی تھی کہ بار بار آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور بار بار رونے کو بل چاہ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی۔

"تم نے مجھے میرے انہوں سے دور کر دیا ہے مہوز بخت! تم نے مجھے سب کی نظروں میں گرا دیا ہے تم نے مجھے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔" وہ روتے ہوئے پتلیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"مجھے اپنی طرف مائل تم نے کیا تھا کیوں مجھے اپنی جھٹک دکھائی؟ کیوں راف کیا تھا مجھے؟" وہ اسے دونوں کندھوں سے تھام کر تنہا ہوتے ہوئے بولا۔

وہ معنی خیزی سے کہتا اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ سے چھیڑتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلا گیا ملازمہ کمرے میں آکر صفائی کرنے لگی تھی اور اندر ہی اندر حیران ہو رہی تھی کہ صاحب کے کمرے کا کیا جڑ ہو گیا ہے۔ کوئی بھی چیز سلامت نہیں تھی وہ ٹوٹے کاچ کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر کمرے میں ڈال دی تھی۔

"بیگم صاحبہ! آپ بیڈ پر بیٹھ جائیں میں صوفہ بھی صاف کر دیتی ہوں۔" صوفے پر پھولوں کی پتیوں بکھری ہوئی تھیں وہ ان ہی کو سینٹا چاہتی تھی لیکن اس کا پارہ بال ہو گیا تھا۔

"کوئی ہو جاؤ یہاں سے کوئی صفائی نہیں کرنی نہیں آگ لگا کر جلا دوں گی سب کچھ۔" وہ ملازمہ یہ چلانے لگی اسے میں وہ بھی واش روم سے شاور کے آکر نکل گیا تھا۔

"تم جاؤ یہ کام بعد میں کر لیتا۔" اس نے ملازمہ کو نرمی سے جانے کا کہا۔

"جی صاحبہ؟" وہ سر اٹھا کر چلی گئی البتہ وہ باقی ملازمہ کمرے کو کئی حد تک قابل قبول حالت میں

لا چکی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



بساطِ دل
آمنہ ریاض

قیمت --- 500/- روپے

کتابخانہ و اجرت: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32732021

"مجھے کیا بات تھا کہ تم اپنی کمزور نیت کے موہتماری کوئی زبان ہی نہیں۔"

"مروکی نیت کمزور نہیں ہوتی اسے عورت کمزور بناتی ہے تمہاری طرح جھلک دکھا کر ادا دکھا کر۔" وہ دانت چرس کر بولا۔

"تم نے اگر اس رات وہ سب نہ کیا ہوتا تو اس وقت تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی اور سیدہ صوفیہ جنت کی پیوی بننے پہ نظر کر رہی ہوتی۔" اس نے اس کے کندھوں کو چھو کاوے کر کہا۔

"جو کیا ہے۔ اسے چپ چاپ بھگتو اور اپنی غلطی کا الزام میرے سرمے ڈالو تمہارے اس واویلے سے اب کچھ نہیں ہوگا غلطی کر کے بھی غلطی کو نہ مانا ایک اور غلطی ہے تمہاری تو وہ اسے اک بھگتے سے چھوڑ کر چمکے ہٹ کر۔"

"میں اگر اپنی غلطی بھگتوں گی تو تمہیں بھی اپنی غلطی کی سزا بھگتنی ہوگی۔" وہ ہند تو اسے چیختی۔

"میں تمہاری سزاؤں کے لیے تیار ہوں جی جان سے۔" وہ ڈر تک خیمیل کے سامنے کھڑا کیلے پاؤں کو تولیے سے دھو رہی تھی بولا اور وہ انتہائی نفرت سے رخ موڑ گئی تھی ملازمہ اس کا ہاتھ لے کر آئی لیکن اس نے ہاتھ بھی واپس بھیج دیا تھا۔



وہ پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل اپنی مام کا نمبر ڈرائی کر رہی تھی لیکن ان کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا اور اس کے لیے زیادہ برائی کی بات یہ تھی کہ اس کی مام کے ساتھ ساتھ ڈیڈ کا سیل بھی سوچ آف تھا۔ تنگ آ کر اس نے لینڈ لائن نمبر ڈال کر مل کیا۔

"ہیلو۔" کل ریسیو کرنے والی اس کے گھر کی ملازمہ رضیہ تھی۔

"رضیہ! میں بات کر رہی ہوں رضیہ! مام سے کو میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے لب و لہجے میں بے قراری نمایاں تھی۔

"مروکی بی بی جی! بڑی نیکم صاحبہ نے کہا ہے کہ وہ

آپ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔" ملازمہ نے اس کی بے قراری پر پانی پھیر دیا۔

"لیکن رضیہ! تم ان سے کہو کہ میں صرف ایک بار۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ سری طرف سے کھٹاک سے فون بند کر دیا گیا تھا اور یہ فون اس کی مام نے بند کیا تھا۔ وہ اتنی دور بیٹھ کر بھی جان کی کسی مام کے رقبے میں کوئی چمک نہ دیکھ کر جمال کی تھل پٹھنی رہ گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" عارفہ نیکم راہداری سے گزر رہی تھیں جب ان کی نظر لابی میں بیٹھی اپنی ہوکی بہت اچھی تھی وہ سر جھکا کے ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔

"نہایت تو ہے۔" اسی کا فون آیا تھا کیا؟ انہوں نے اسے فون کے قریب بیٹھ کر دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو پھر خود کی ہے؟"

"کس کو؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھیں۔

"پتے مام کو؟" وہ بھی مختصر سے جواب دے رہی تھی۔

"چھا! بات ہوئی ان سے؟ کیا کہتے ہیں؟" عارفہ نیکم کو سن کر خوش ہوئی۔

"کہتے ہیں کہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے بھی دھڑکار دیا ہے مجھے۔" وہ سرو و سپاٹ لہجے میں بولی تھی عارفہ نیکم کی خوشی مہر زدگی۔

"ارے نہیں بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ تمہارے مام باپ ہیں۔ تم سے ناراض نہیں رہ سکتے یہ سب بس وقتی غصہ ہے جب غصہ اتر گیا تو انہیں سب سے پہلے تمہارا ہی خیال آئے گا۔" انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"ڈیڈ کا غصہ وقتی غصہ ہو سکتا ہے لیکن مام کا نہیں۔" وہ لڑتے بھائی سے کم نہیں ہیں جو ٹھان لیتی ہیں ان سے پیچھے ہٹنا کوارا نہیں کرتیں۔"

"لیکن بیٹا! تمہارے لیے ان کے دل میں نرم گوشہ بیٹھ رہے گا۔"

"ہونہ! اگر میرے لیے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ ہو تو وہ کل میری زندگی کے فیصلے یوں چپ رہ کر ماموں کا ساتھ نہ دیتیں۔" وہ اپنی مام سے بدملن ہونے لگی تھی اس کے خیال میں اس کی مام کو تو کم از کم اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔

"لیکن بیٹا! بات اصول کی اور چچائی کی تھی تمہاری مام! اس بھائی کا ساتھ نہ دیتیں تو وہ جھوٹے بڑ چاہتے۔ عارفہ نیکم نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ایسی کون سی قیامت اپنی تھی۔ جہاں نوبت اصول اور چچائی تک چلی گئی تھی۔ اک ذرا سی بات کو سب نے ایٹو بنا کر رکھ دیا اور میرے اسی مذاق کو میرے گھر کا طوق بنا دیا۔" وہ اب دوسروں سے بدملن ہو رہی تھی۔

"میں بیٹا! یہ سب اللہ کی رضا تھی یہ قسمت تھی تمہاری اللہ کی رضا میں راضی ہونا سیکھو۔"

انہوں نے اس کی سانس نہیں بلکہ مام بن کے اسے سمجھانے اور تسلی دینے کی کوشش کی۔

"اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ کسی سے غلطی ہو جائے تو اسے کھڑے کھڑے سنگسار کر دیا اسے فوراً اس کی غلطی کی سزا دے۔" اللہ تعالیٰ نے معافی کا اور درگزر کا حکم بھی دیا ہے یہ بات کیوں بھول گئے تھے میری مام کے بھائی صوفی ایسا صاحب؟

وہ لہجہ چبا کر بولی تھی اور عارفہ نیکم چپ ہو گئیں بات تو اس کی بھی درست تھی سو کیا کہیں؟ اس معاملے میں تو ہر کوئی ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوا تھا۔

"اور اچھا تو آپ اور آپ کے بیٹے نے بھی نہیں کیا میں اس کی حرکت کبھی معاف نہیں کروں گی اس نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے مجھے کسی کو نہ دکھانے کے قہل نہیں چھوڑا، نفرت ہو گئی ہے مجھ اپنے آپ سے اور اپنی سب سے بھی۔"

وہ تپتی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"نندہ کمرے میں بیویشن تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" انہوں نے اسپتالی اور نرمی سے اظہار غمی۔

"نرج شام تمہاری شادی کی رپیشن ہے نا؟"

انہوں نے اسے جیسے یاد دلایا۔

"میں نہیں چاہوں گی اور نہ ہی میں تیار ہو رہی ہوں۔" اس نے فوراً انکار دیا اور لابی سے نکل رہی تھی جب عارفہ نیکم نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"نہیں بیٹا! ایسا مت کرو۔" ایک غلطی تم سے پہلے ہوئی اور ایک غلطی تم پر کر رہی ہو۔ سمجھو دار اور عقل مند وہی ہوتا ہے جو ایک ہی بار غلطی کرے اور پھر سدھر جائے۔ تم اپنی پہلی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کرو اور مزید غلطیوں کرنے سے پرہیز کرو۔"

عارفہ نیکم نے اسے کچھ اس طرح سے سمجھایا کہ وہ ٹھنک گئی تھی۔

"کل پڑاؤں لوگوں نے ہاتھیں کیوں سوال کیے؟ سرگوشیاں کیوں لیکن جیسے ہی کسی کل کاؤن تزر گیا کیا تم اب پھر چاہو گی کہ لوگ ہاتھیں کریں سوال دہرائیں اور تمہاری غیر موجودگی پر سرگوشیاں کریں؟"

وہ اسے ایک سوالیہ نشان دے کر چلی گئی تھیں اور وہ کتنی ہی دیر جن قدموں پہ کھڑی تھی ان قدموں سے ہل نہیں سکی تھی اور جب قدم ہلے تو ان کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا جہاں بیویشن اسے تیار کرنے کے لیے انتظار میں بیٹھی تھی۔

رہج خاموشی سے آرڈر تک خیمیل کے سامنے بیٹھ گئی اس کے کمرے میں اور لڑکیاں بھی موجود تھیں لیکن وہ ان سب سے انجمن تھی سوائے ناندہ اور نشا کے۔ کل شام رخصتی کے بعد سب سے پہلے ان ہی کا تعارف ہوا تھا کہ وہ سیدہ صوفیہ جنت کی بیچاؤ بیٹھیں ہیں۔ اسی لیے ہر کام میں پیش پیش نظر آ رہی ہیں۔

اس وقت بھی ناندہ اپنی نگرانی میں دلن تیار کروا رہی تھی اور بیویشن اس کی ہدایات پہ عمل

کر رہی تھی جبکہ وہ خود چپ چاپ ریلوٹ کی طرح بیٹھی وہیشن کا حقہ مشتاقی ہوتی تھی۔

”یہ اس لنگے کی بیچنگ چوڑی ہے۔“ نامہ نے الماری سے چوڑی نکال کر ڈرنک ٹیبل پر رکھی۔ اور جب وہ تیار ہو کر لنگوں کے ساتھ نیچے اتری تو عارفہ بیگم کے قدم ختم گئے تھے اور وہاں موجود کئی لوگوں کی آنکھیں خیر ہو گئی تھیں۔ سٹی ٹینڈز کے لنگے میں اس کی دو حیا رنگت اور چمک دار جلد سب کی آنکھوں کو خیر و کر رہی تھی اور اس پہ اس کے کچلے مین نقش اس کی خوبصورتی کو آتش دربار ہے تھے۔

”مام اور تھی دیر ہے۔ ڈیڈ ویا فون کر چکے ہیں؟“ موز بخت بے دھیانی میں اندر داخل ہوا تھا لیکن اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا اس کے قدم بھی ٹھک گئے تھے۔

”چلو دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے اسے جو کیا تھا لیکن میرٹ بل پہنچنے تک اس کی نظریں وقفے وقفے سے اس کی سمت اٹھتی رہی تھیں یہی تو اس کی خوبصورتی تھی تو جس کی ایک جھلک نے ہی اسے ہی پاگل بنا دیا تھا اور اس کے پاگل پن کے نتیجے میں آج وہ اس کے ہمراہ تھی۔



”بھابھی کے گھر والے نہیں آئے؟“ وینر سے کوڈو رنگ کا گلاس تھامتے ہوئے حسان نے موز بخت سے سوال کیا تھا۔

”نہیں۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔

”کیوں؟“

”تمرا چھی طرح جانتے ہو۔“

”لیکن پارہا بھابی کے مام ڈیڈ کو تو ان کا خیال کرنا چاہیے۔“ انکوئی بیٹی سے اس طرح تعشق تو دلہا حیرت کی بات ہے۔“ حسان کو رنج کی تمنائی اور اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اتنے زیادہ لوگوں میں انجان اور اکیلی تھی۔

نے لاہور والی کا مظاہرہ کیا۔

”تصور اور تو تم بھی ہو مزا صرف بھابی کو کیل مل رہی ہے۔ تمہاری وجہ سے ان کے سارے رشتے چھوٹ گئے اور تم ٹھانڈے سے بیٹھ کر انجوائے کر رہے ہو۔“ حسان نے خفگی سے کہا۔

”لوئے بار ابس بس۔ اپنے لوٹے اور ش اپنے تک ہی رکھو اگر اس نے من لیا تو یہاں اتنے سارے لوگوں میں بھی بیٹھنے چاہے رکھ دے گی۔ وہ تو پہلی کوئی اپنا ہم تو ڈھونڈ رہی ہے۔“ موز بخت نے اسے یہ دھم دینی نہیں رنج کو مسکراتی ہوئی نظریں دیکھا تھا اس کی کزن دوسن کے ساتھ تصویریں بنوا رہی تھیں۔

”صوفی الیاس صاحب سے پھر کوئی رابطہ ہوا تم لوگوں کا؟“

”نہیں پارہا لیکن میں کوشش کروں گا کہ سب ٹھیک ہو جائے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہوں ہونا بھی چاہیے۔“ حسان نے اس کی بل میں ہل مائی۔

”ممنون! یہاں کیا کر رہے ہو؟“ بیٹن نے سہجہ سے ہمارا پوچھ رہے ہیں۔“ سید فیوز بخت ان کے قریب آتے ہوئے خفگی سے بولے۔

”صوفی الیاس صاحب نہیں آئے؟“ سٹی ممانوں نے بطور خاص پوچھا تھا۔

”ابھی تک تو نہیں پہنچے، تھوڑی دیر تک آجائیں گے۔“ سید فیوز بخت کو چھوڑا۔ سنا کر پارہا تھا حسان اک نظر موز کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب نہ پا رہے تھے۔



شادی کا ہنگامہ سڑ ہوا تو ہر طرف خاموشی اور سناٹے چھا گئے تھے۔ موز بخت اپنے پیارے ساتھ برنس اور آئس میں مصروف ہو گیا تھا اور وہ اپنے بیٹن کی ہو کر رہی تھی دو تین بار عارفہ بیگم نے اسے باہر نکلنے کا گھونٹے پھرنے کا مشورہ دیا لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکل دیتی تھی جو خلتا تھا۔

چین اس کے دل میں ہوتی تھی کہ اسے دن رات چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ لینے لیتے تھپ کر اچھ بیٹھی تھی اور بیٹھی ہوئی تو یکدم کھڑی ہو جاتی تھی۔ سکون کی خیر اور اطمینان کے لمحے اس کی دوسریں سے نکل چکے تھے۔

اسے اپنے غمیر۔ ایک بوجھ رکھا محسوس ہوتا تھا جسے وہ ہٹائیں پارہی تھی اور اس بوجھ کے ہاتھوں مجبور وہ آج پھر فون سیٹ کے قریب پہنچتی تھی لیکن فون ڈیڈ تھا۔

”تلف! اسے بھی آج ہی ڈیڈ ہوتا تھا؟“ وہ ریسیور کیبل پر تکی کر رہی تھی۔

پورا دن اس نے گھر میں چکراتے ہوئے گزار دیا تھا۔ عارفہ بیگم نہیں کام سے گئی ہوئی تھیں۔ شام پانچ بجے موز بخت کی واپسی ہوئی تو وہ اسے لان میں بیٹھی نظر آئی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس کی طرف چلا آیا۔

”السلام علیکم!“ وہ سلام کرتے ہوئے اس کے ہاتھ والی کرسی پہنچنے کے بیچہ گیا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

”ابو! سلامتی ہی بھیج دو اب ایسی بھی کیا ناراضی کہ بندہ سلام کا جواب بھی نہ دے گا اس نے گاڑی کی چابی درمیانی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تم آپ سلامتی میں بیجوں؟“ وہ ذہر خند لہجے میں بول۔

”تمہارا شو ہر ہوں تم سلامتی نہیں بھیجی تو اور کون بھیجے گا؟“

”میرا شو ہر تمہارے جیسا تھا اور کہیں ہوگا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ وہ نفرت بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

”اور جس نے سوچا تھا میں اس کا شو ہری نہیں بناؤ۔“ وہ شرارت سے ہنسا تھا۔ رنج کے چہرے پہ اک ٹھیکہ ساسا لہ لہا گیا تھا۔ اس کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا اور اس کے اثرات دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہونے ہوئے تھیں۔

”اینا موبائل دو مجھے۔“ اس نے موز بخت کی

طرف ہاتھ بڑھایا۔

”کیوں خیریت؟“ وہ اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں فون کرنا چاہتی ہوں، فاطمہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں، سنا تم نے؟“ وہ یکدم غصے سے بھڑکتے ہوئے نیچ اٹھی وہ انتہائی فرسٹریشن کا شکار ہو چکی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں نے آج صوفی الیاس صاحب کو کال کی تھی انہوں نے دو منٹ میں سلام دعا کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ میں نے دوبارہ کال کی تو کہنے لگے کہ وہ دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔“ وہ کافی گھبرے ہوئے انداز میں بتا رہا تھا۔

”لیکن میں ان سے نہیں فاطمہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولی تو موز بخت نے جب سے اپنا سیل نکال کر اس کی طرف بڑھایا تھا اور وہ سیل لے کر وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے صوفی الیاس صاحب کے کمرے کا ممبر رائل کیا تھا۔

ان کے گھر میں موبائل فون کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بس لینڈ لائن فون کا سیٹ تھا ان کے گھر کے فون کا زرو بھی بیش لاک رہتا تھا کال جاسکتی تھی لیکن انہیں سختی تھی کیونکہ بقول ان کے ان کا گھر بیٹوں والا گھر تھا اور بیٹوں والے گھر میں ایسی احتیاط ضروری تھی۔ یہ ان کے نظریات تھے!

”السلام علیکم! سوری طرف خدیجہ مملانی کی آواز سنائی دیتی تھی۔“

”وعلیکم السلام مملانی جان! میں۔ میں رنج بات کر رہی ہوں۔“ وہ۔ میں فاطمہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا لہجہ بے رعب سا ہو گیا۔

دوسری طرف سے ایک لفظ کے بغیر فون کاٹ دیا گیا تھا۔ اور وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ جب اس کی نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ آکر ٹھہری تھی اور اعصاب تن گئے تھے۔ یہی ہے وہ منحوس جس نے میری قسمت کو

بد قسمتی میں بدل دیا۔" اس نے غصے سے کہتے ہوئے موبائل اپنی پوری قوت سے دیا وہ دے مارا تھا وہ اندر آیا تو اس کا موبائل کئی حصوں میں ٹکڑا ہوا نظر آیا تھا۔



"تم اگر یہ سوچ رہی ہو کہ سب کچھ اتنی جلدی ٹھیک ہو سکتا ہے تو یہ ناممکن ہے۔" وہ کافی صبر سے ہوئے لمحے میں بولا تھا۔ وہ اس کی سمت پشت کے آنکھوں پہ پانڈو رکھے سوئے کی کوشش کر رہی تھی یا اٹھ نک کر رہی تھی لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

"زخمِ دل پہ لگے یا جسم پہ" اسے بھرنے میں تھوڑا ٹانگ لگتا ہے، تم بھی اس زخم کو تھوڑا ٹانگ دو پھر ممکن ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے۔"

وہ ہم لیب کی روشنی میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھا اس کی پشت پہ نظریں پڑا کر بول رہا تھا۔

"ابھی تمہاری معافی یا شرمندگی بھی کوئی اثر نہیں دکھائے گی اس لیے اپنے آپ کو سنبالو اور حوصلے سے کام لو صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرو وقت اگر کئی چیزوں میں شدت لاتا ہے تو کئی چیزوں میں کمی بھی لاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے مام ڈیڈ کے غصے میں کمی ضرور ہوگی۔" وہ اسے حوصلہ دے رہا تھا، انتہائی نرم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں۔

"میری بیوی بننا تمہاری قسمت میں لکھا تھا ورنہ یہی سوچ لو کہ شادی کے روز تک میں تمہیں نہیں جانتا تھا۔ تمہارا نام نہیں جانتا تھا بلکہ میں تو فیس ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا پھر بھی ہم ایک دوسرے کے ہم سفر بن گئے شاید اسی چیز کا نام قسمت ہوتا ہے اور اسی کو لوگ نصیب کہتے ہیں۔" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے مخاطب ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیاں اس کے بالوں میں چھڑائی تھیں۔ وہ پھر بھی

بے حس و حرکت رہی رہی البتہ اندر ہی اندر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔
"تم واقعی ٹھیک کہتی ہو میں بھی قصور وار ہوں لیکن دیر آتش مجبور ہوں میری بچپن سے عادت ہے کہ مجھے جو چیز پسند آجائے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا ورنہ ہی اپنی ضد سے پیچھے ہٹ سکتا ہوں اور تمہارے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔"

وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے بولا۔
"چیزوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔ تم نے صرف اپنے متعلق سوچا۔ میرے جذبات کا نہ سوچتے ایک لمحہ کے لیے اس لڑکی کے بارے میں ہی سوچ لیتے تو ہاں میں نے بھی سمجھ لیتی۔ اب شادی نہ ہونے پر لوگ کتنی باتیں بنائیں گے۔"

"مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے لیکن میں تمہیں اپنا نام چکا تھا اب چھوڑ نہیں سکتا تھا۔"

موز بخت اس کے اچھے بھروسے اور لاپرواہی سے نظر اٹھایا تھا۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ اس کے ہوشیا حسن سے دامن چٹائے اور نظریں اسے ہونے چھوڑا تھا شادی کے روز سے لے کر اب تک اسے چھوڑ کر نہیں تھا۔ آج پھر اس کی لاپرواہی اسے بے ایمان کر رہی ہو۔

"جالی تو تم چھینک رہی ہو بندہ کسی اور طرف دیکھنے کے قائل ہی نہیں رہتا۔"

وہ اس کے سر پہ کو گہری اور ذوق معنی نظروں سے دیکھ کر بولا تھا۔ رینج اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنا حلیہ دیکھ کر سنبھل گئی تھی اور فوراً "وہ بے کی تلاش میں دیکھا تھا۔"

"اب کیا فائدہ؟" وہ مسکرایا۔

وہ گستاخی پہ تلوہ تھا اس نے بچنے کی کوشش کی لیکن بچ نہ سکی اس کے شکم میں پھر پھڑکے رہ گئی اور وہ گستاخی کا ارتکاب کر بیٹھا تھا اس کی بات کا مفہیم گھوم پھرے کہ وہ یہ آیا تھا جہاں وہ لانا جاتا تھا وہ آج پھر اس کو قلابہ کر چکا تھا اور وہ سارے جشن کر کے اس کے اختیار سے نکلنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی

حرفت مضبوط تھی۔



صبح ناشتے کی ٹیبل پر اس کا چہرہ میلے یوز کی طرح سو جا ہوا تھا۔ آج رات بھی وہ خوب روٹی کھئی تھی جب ہی اس کی آنکھیں سرخ اور پونے بھاری ہو رہے تھے۔ اس نے ایک دو بار اسے کن آہیوں سے دیکھا تھا اور پھر اپنے ناشتے میں مصروف ہو گیا وہ جانتا تھا کہ اس کی نظر پرانی قوت پ جائے گی۔

"آج کل ریجہ بیٹی کی کیا مصروفیات ہیں گھر میں؟" سید فیروز بخت نے اس کی خاموشی نوٹ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا وہ چائے میں جھج بلاتے ہوئے چوکی۔

"میرا دل خوش کرنا۔" وہ سرگوشی میں بولا اس نے قہار نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کا نام ریجہ نہیں رینج ہے رینج کا مطلب ہے ہمارے علی کا لفظ ہے۔" عارفہ بیگم نے شوہر کی مضامین میں اضافہ کیا۔

"ماشاء اللہ۔ بہت پیارا نام ہے میں تو اتنے دنوں سے یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید ریجہ نام ہے اور سب پیار سے رینج کہتے ہیں۔" وہ دھڑکی سے کہتے ہوئے بیٹھے۔
"میں۔ اس کا نام ہی رینج ہے۔ رینج احمد۔" عارفہ بیگم نے پورا نام بتایا۔

"رینج احمد نہیں رینج موز کو۔" وہ فیس کر بولے۔
"میرے نام کے ساتھ رینج احمد ہی سوٹ کرتا ہے۔" وہ غصے سے گویا ہوئی تھی۔ وہ دونوں یہاں بیوی بیٹے بیٹے جب ہو گئے تھے اور موز بخت نے ٹھیک کر لے دیکھا تھا۔

"لیکن بیٹا! ہم تو ایک اصول کی بات کر رہے ہیں شادی کے بعد ہر لڑکی کے نام کے ساتھ۔"
"یاد دینا کے سارے اصول صرف مجھ پہ ہی لاگو ہوتے ہیں؟" وہ غصے سے دبے لہجے میں بولی۔
"رینج ایہ تم کس لیے میں بات کر رہی ہو؟"
موز اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اس کے تیر و بدل

کھٹے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اس کا ہر دینہ برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنے ماں باپ سے اونچی آواز میں بات کرنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔
"اس کو اسے بیٹا! وہ صرف بات ہی تو کر رہی ہے۔" سید فیروز بخت نے لاپرواہی سے سر جھٹک کر موز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بات کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ڈیڈ ایہ شاید سب کو اپنے جیسا ہی سمجھتی ہے مان سیریس۔" موز کو اس کے سب لہجے پر کافی غصہ آیا تھا۔
وہ موز بخت کو نفرت سے دیکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور وہ دونوں اسے سمجھانے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔

"وہ جن حالات سے گزری ہے اس کا آپ سیٹ ہوتا جائز ہے۔" انہوں نے رسل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ اس کی سائیڈ لے رہے ہیں حالانکہ غلطی اسی کی ہے وہ اگر آپ سیٹ ہے تو وہ سہول کو کیوں آپ سیٹ کر رہی ہے۔"

"یار یار اسے اس کی غلطی کا احساس دل کر تاجر مت کرو اس طرح تو وہ پاگل ہو جائے گی، نفسیاتی مریض بن جائے گی۔ اس سے سختی کر تم اپنے لیے مشکل پیدا کرو گے۔"

انہوں نے جن صاف اور واضح لفظوں میں اسے سمجھایا تھا موز کتنے ہی لمحے ان کی بات پہ چپ بیٹھا رہ گیا۔

"جائزہ بریشان ہوگی۔" انہوں نے اسے بیڈ روم میں جانے کا کہا۔

"سوری۔ میں غصے سے لیٹ ہو رہا ہوں یہ چونچلے پھر کسی وقت ہو جائیں گے۔"

وہ گود میں رکھنا کچن کچن کر کھڑا ہوا اور برف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا چند سیکنڈ بعد اس کی گاڑی اشارت ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔



وہ دواش دوم سے شلوار لے کر باہر نکلی تو اس کی نظر بند پہ رکتے چھوٹے سے ڈبے پر پڑ گئی اور اس کے قدم بے ساختہ بند کی سمت اٹھے تھے اس نے توجہ بند پہ ڈال کر ڈبہ اٹھالیا۔ یہ مہاشل سیٹ تھا تو بند بیک اور باہر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ "مسٹر ریج موز" اس نے ملازمہ کو آواز دی۔

"جی بیکم صاحبہ؟"

"یہ کس نے بھیجا ہے؟"

"جی چھوٹے صاحب نے بھیجا ہے ان کے ہنس سے ڈرا پور آیا تھا دینے کے لیے آپ ہمارے تھیں اس لیے میں نے بند پہ رکھ دیا۔"

چھوٹے دونوں سے ان کے درمیان بات چیت بند تھی۔ وہ تو پہلے بھی اس سے بات نہیں کرتی تھی لیکن اب وہ بھی بات کا سلسلہ ختم کیے ہوئے تھا اس لیے گزشتہ دو روز سے بند دوم میں خاصی خاموشی کا عالم ہوا تھا۔ راوی جین ہی جین لکھ رہا تھا لیکن وہ اس کی اس عنایت کو چپ چاپ قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے قدم باہر کی سمت اٹھنے لگے تھے۔ وہ پہلے پاؤں سمیت مہاشل کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑے نیچے آگئی تھی اور فون سیٹ کے پاس رکھی ڈائریکٹری اٹھا کر اس کے آفس کا نمبر دیکھا اور ڈال کر لیا تھا۔

"ہیلو۔" اس کی مصروف سی آواز سنائی دی اور ریج احمد کے دل پہ جیسے کوئی آراجل گیا تھا۔ یہی کبیر آواز وہ فون پہ ایک بار پہلے بھی سن چکی تھی۔

"ہیلو۔" وہ ریسیور کی دوسری طرف خاموشی پا کر ٹھنکا۔

"میں ریج احمد بات کر رہی ہوں۔" وہ خود میں ہمت جمع کرتے ہوئے بولی تھی۔

"اوہ ایس سمجھا فاطمہ الیاس بات کر رہی ہیں۔؟"

وہ چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"فاطمہ الیاس تم جیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔" وہ حقارت سے بولی۔

"ریج احمد تو مجھ جیوں سے بات کرنا پسند کرتا ہے؟" موز بخت نے برکت جواب دے کر بل میں

حساب بے باقی کر دیا تھا۔ ریج کے تن بدن کو آگسٹہ ہو گئی تھی۔

"مجھے یہ بتائیں تھا کہ تم اتنے مٹھیا انسان ہو اگر پتہ ہو تو کبھی تم سے بات نہ کرتی۔"

"لیکن مجھے تم سے بات کرتے ہوئے تھا کہ تم کتنی اٹلا ہو" اسی لیے تو تم سے بات کی تھی میری جان! وہ مزے لیتے ہوئے بولا۔

اور ریج نے تھلا کر یکدم ریسیور کرپٹل پہ لگا دیا تھا۔ وہ لب پہنچے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں قلم کر بیٹھ گئی۔ ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ فون پہ رنگ ہونے لگی چند سیکنڈ وہ یونہی دیکھتی رہی پھر ریسیور اٹھا لیا تھا۔

"ہیلو۔ موز بخت بہت کر رہا ہوں۔"

"جانتی ہوں دنیا میں ایک سی کم طرف ہے۔"

"تم نہیں جانتی تو اور کون جانے گا؟ میری کم طرفی کے تمام تجویزوں سے واقف ہو تم۔" وہ قلم اٹھانے لگی۔

"تم نے مہاشل سیٹ بھیجا ہے؟"

"ہاں بھیجا ہے۔" کس لیے میں نے تم سے مانگا تو نہیں؟

"لیکن مجھے تو پتہ ہے میں کہ تمہیں کس کس چیز کی ضرورت ہے اور مہاشل بھی تقریباً آج کل کی ضروریات میں شامل ہوتا ہے۔"

"مجھے تو اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے کس کس کو پورا کرو گے؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تم اپنی ضرورت کی چیزوں کی ایک لسٹ بناؤ پھر دیکھتے ہیں کہ میں کیا پوری کرنا ہوں اور کیا نہیں۔"

"لکھو میری چیزوں کی لسٹ۔" ریج دل میں تجلے کیا اٹھان چکی تھی وہ شاید موز بخت کو بیچ کر اپنی

کام نہیں چل سکتا۔؟" وہ گھٹے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ مجھے بلیک پسند ہے میں پہلے بھی بلیک استعمال کرتی رہی ہوں۔" وہ سختی سے بولی۔

"موزی یا راجھ ڈیڑھ آگے ہیں۔ یہ لسٹ بنانے کا کام میں گھر آ کے کر لوں گا ابھی فون بند کرنا ہوں۔"

موز بخت کے لیے میں اچانک جلنے آگئی تھی۔

"بس اتنی جلدی؟" اس نے طنز کیا اور موز بخت مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ نہ سکی۔

"بس اتنی جلدی نہیں ہوتی ابھی تو شروعات ہے ابھی تم نے مانگا ہی کیا ہے بھلا؟ کوئی ایسی چیز مانگو جسے مانگنے میں تمہیں مزا آئے اور مجھے دے کر خوشی ہو۔"

"جی وے۔ سیٹی باتیں پھر سہی۔ تم ڈرائنگ روم کی گلاس وال کا پردہ ہٹا کر دیکھو پھر سوچو کہ تمہیں اور کس چیز کی ضرورت ہے اور پتی کیا مانگنا ہے۔"

وہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ ریج احمد اس کی بات سے الجھ گئی تھی اور پھر بے ساختہ ڈرائنگ روم کی گلاس وال سے پردہ ہٹا کر دیکھا تھا۔

باہر کٹ کے سامنے والی روش پہ بلیک کھرکی سیلون کھڑی تھی۔ چمکتی دیکھی ہٹھکے۔ رانی ہوئی زیر زمین۔

دوسری لگ رہا تھا کہ شوروم سے سیدھی میس لائی گئی ہے!

"نہو نہ! یہ سب کر کے میری نظر میں تم اچھائی کی کوئی سند نہیں پاسکتے سید موز بخت! اس نے ہڑتات سے جھگڑے سے پردے برابر کر دیے اور وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

آج منڈے تھا اور آفس سے چھٹی تھی رات لیٹ باٹ سوئے کی وجہ سے وہ ان چڑھے تک سوتا رہا تھا اور وہ ابھی سو رہا تھا کہ ریج گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل آئی تھی۔

"ماں جاری ہو پتا؟" عارفہ بیگم نے اسے تیزی سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"ٹارگٹ۔" وہ دو ٹوک کہتی آگے بڑھ گئی اور چند پلٹ کر اس کی گاڑی فرارے بھرتی ہوئی گیت سے

نکل گئی تھی لیکن عارفہ بیگم کو اس کے چوروں سے خطرے کی بو آئی تھی وہ اسے کندھوں موز کے بند دوم میں آئیں۔

"موز ڈاکھو۔" انہوں نے اس کا کندھ ہلایا۔

"جی ہاں! وہ بند سے بند رہا ہوا تو ان کی پریشان صورت دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"کیا ہوا آخریت تو ہے؟" وہ یکدم اٹھ بیٹھا۔

"ریج گاڑی لے کر نکلی ہے پتا نہیں کہاں گئی ہے؟" مارکیٹ کا کہا ہے اس نے "عارفہ بیگم حشکر ہو رہی تھیں اور پریشان تو موز بخت کو بھی ہو گئی تھی وہ بند سے اتر آیا۔

"کہاں جا سکتی ہے وہ؟" اس نے شرت بستے ہوئے حیرانی سے کہا اور مہاشل اٹھا کر اس کا نمبر ڈال کر لے لگا رنگ جاری تھی لیکن وہ کل ریسیور نہیں کر رہی تھی۔

"میں انڈین کر رہی ہوں! اس نے اس کے نمبر پر میسج لکھ کر سینڈ کیا لیکن اس نے میسج کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"کل انڈین کرو ورنہ مجھے خود تمہارے پیچھے آنا پڑے گا۔" اس نے دوسرا میسج بھی سینڈ کر دیا تھا۔

مزم جواب نہ دیا۔

"وہ خدیجہ آئی کی طرف گئی ہوگی۔"

"میں نے پتا کیا ہے لیکن ابھی تک تو وہ وہاں نہیں پہنچی لیکن موز کو یقین تھا کہ انہی گاڑی لے کر گھر سے نکل گیا تھا اور پیچھے عارفہ بیگم پریشان ہوتی رہ گئی تھیں۔

ابھی ابھی گھر میں صوفی الیاس صاحب کی گاڑی داخل ہوئی تھی اس لیے گیٹ ابھی مٹا ہوا تھا اور ریج احمد بڑی آسانی سے گاڑی اندر لے آئی تھی۔

"بی بی جی! آپ کو گاڑی اندر لانے کی اجازت نہیں ہے۔" جو کیدار ایک کے اس کے قریب آیا۔

"سیرے لیے تم نے گیٹ نہیں کھولا میں خود اندر

آئی ہوں، جنہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مرد آواز سے کہتی اندر چلی گئی اس کا رخ ڈراٹنگ روم کی طرف تھا۔

"فاطمہ!" اس نے سامنے صوفے پر بیٹھ کر کشنوز کے کورچر جاتی فاطمہ کو بے تابی سے پکارا۔

"ریج!" فاطمہ ایک دم صوفے سے کھڑی ہو گئی اس کی گود میں رکے تمام کورڈ نیچے زمین پر گر گئے تھے۔

"فاطمہ! میں تم سے ملنے آئی ہوں، تم سے بات کرنا چاہتی ہوں، پلیز میرے دل پر رکھا جو بھلا کر دو۔" ریج دوبارے لمبے میں کہتی ہوئی فاطمہ کے قریب چلی آئی۔

"میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" فاطمہ مرغ موڑ گئی۔

"پلیز فاطمہ! میں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، میں نے بس ایک مذاق کیا تھا، ایک شرارت کی تھی، بخدا! میری اس میں کوئی یا قاعدہ یا ناپاک یا نیت شامل نہیں تھی۔ میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی نہ جانے کیسے مجھ سے غلطی ہوئی، میری غلطی معاف کرو، فاطمہ! پلیز! میں تمہاری دینی ریج ہوں جس کی آواز سن کر ہی تم خوش ہو جاتی تھیں، جس سے تم گھنٹوں باتیں کر کے بھی پور نہیں ہوتی تھیں، آج میری غلطی کی وجہ سے منہ مدت موڑو، میں تمہاری طرف سے سزا کی نہیں معافی کی خواست گار ہوں میں بہت بری ہوں، لیکن تم تو اچھی ہو نا؟"

ریج احمد کہتے کہتے رو پڑی تھی، فاطمہ نے بے ساختہ پلٹ کر اس کی سمت دیکھا تھا، فاطمہ کے رخساروں پر بھی بے آواز آنسوؤں کی تحریر رقم تھی۔

"فاطمہ! ہم اندر جاؤ۔" صوفی الیاس کی یارعب دنگ قسم کی آواز سنائی دی تھی۔ ریج کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا تھا، فاطمہ کی اتنی جرات نہیں تھی کہ باپ کے سامنے غصہ کرتی۔ وہ اندر چلی گئی۔

"فاطمہ! کوئی پلیز۔" ریج جیسے کہی تھی۔

"آگے قدم مت بڑھاؤ لڑکی! تمہارا اس گھر میں داخلہ منع ہے، ہمیں چوکیدار نے نہیں بتایا؟" ان کی

آواز اور انداز اتنا سرد تھا کہ ریج احمد کو اپنے جسم و جان ٹھنہرتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

"میرا نام لڑکی نہیں ریج احمد ہے، میں کوئی غیر نہیں آپ کی بھانجی ہوں۔"

"اس سے پہلے کہ میں جنہیں باہر چھوڑ کر آؤں، شرافت سے خود ہی چلی جاؤ۔" صوفی الیاس سختی اور بیکانی کی جہد کر رہے تھے۔

"جو غلطی مجھ سے ہوئی آپ کی کسی بیٹی سے ہوئی ہوگی تو بھی آپ یہ ہی کچھ کرتے اسے دھکے دے کر نکال دیتے؟" ریج کا لہجہ زور خور جھلکا ہو گیا تھا۔

"اگر یہ حرکت میری کسی بیٹی سے ہوئی ہوتی تو گناہ کاٹ کے اسے کھرے کھرے قبر میں اتار دیتا ہوں، سوال جواب کرنے کا موقع نہ دیتا اسے۔" ان کا لہجہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

"مہوڑہ! یعنی آپ مجھے بھانجی ہی سمجھتے ہیں بیٹی نہیں، اس سے تو بہتر تھا کہ آپ میرا گناہ کاٹ کے مجھے قبر میں اتار دیتے، لڑکی بدگلی اور نفرت کی مارتوں مار رہے۔" وہ بدلتے ہوئے لہجے۔

"میری بیٹی تمہارے جیسی ناچار نہیں ہو سکتی، دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" انہوں نے غصہ میں اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا۔

"آرام سے بات کیجئے صوفی صاحب! یہ کوئی غیر نہیں ہمارے ہی گھر کی بیٹی ہے۔" غدیجہ مملتی رہ نہ سکیں اور ریج کے سامنے آئی تھیں۔

"خیر وار غدیجہ! بی بی! میری صرف چار بیٹیاں ہیں، میرے گھر میں عزت سے رہ رہی ہیں، اس سے کوئی جہل سے آئی ہے وہیں چلی جائے، نکل جائے یہاں سے، میرے ضبط کو مت آزمائے۔" وہ یک دم دھماکا اٹھتے تھے اور گھر کے دروازے پر اپنا منہ چھاپا گیا تھا۔

"ریج!" ریج کے عقب سے مہوڑہ بخت کی آواز ابھری تھی۔ انہوں نے چونک کر دیکھا، غدیجہ مملتی اپنا دوشہ دست کرنے لگی تھیں۔

"لے جاؤ اس کو یہاں سے۔" صوفی صاحب نے خفا سے بولے۔

"لے لے بی بی! آیا ہوں صوفی صاحب! اچھوڑنے نہیں آئے۔" مہوڑہ بخت نے آگے بڑھ کر ریج کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"جیو بی بی! تمہاری دھیان رکھا کرو کہ کہاں آج رہی ہے؟" وہ طنز اور کٹ دار لہجے میں بولے۔

"جی! میں مسجد کے لام صاحب کے گھر گئی ہے۔ کسی کلب یا فاشی کے آؤں؟ یہ نہیں گئی کہ آپ مجھے دھیان رکھنے کا لطف دے رہے ہیں۔" مہوڑہ بخت کا جہان سے بھی زیادہ کٹ دار تھا۔

"زبان سنجال کے بات کرو سید مہوڑہ بخت! ہمارا زہرا کوئی واسطہ نہیں کہ تم ہمارے منہ لگو۔" وہ چپ آٹھ۔

"میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا تب میرا اور آپ کا واسطہ ہوتا، لیکن آپ کی بھانجی سے شادی کر کے میرا اور آپ کا واسطہ نہیں رہا، یہ ہی جانا چاہتے ہیں نا آپ؟"

"مہوڑہ بخت بولنے پر آیا تو اس نے بھی کوئی ادھار نہیں رکھا تھا۔

"اس سے میں نے سب کے سامنے باقاعدہ شادی کر کے گھر سے بھاگ کر نہیں کی کہ سارے خاندان نے غلطی ترک کر دیا ہے۔"

وہ لفظ چپا چپا کر بول رہا تھا اور صوفی الیاس صاحب کا غصہ آسمان کو چھونے لگا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب دے پڑے مہوڑا اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا پلٹ گیا تھا۔

"چھوڑو مجھے، مجھے بات کرنے دو، میں فاطمہ سے بات کر کے ہی جاؤں گی۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ اسے زبردستی کھینچتے ہوئے گاڑی تک لے آیا تھا، اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اسے اندر دھکیلا اور خود راہیہ رنگ سیٹ سنبل لی تھی۔

"ساتھ ہی اپنے گھر کے ڈرائیور کو فون کر دیا کہ وہ صوفی صاحب کے گھر سے ریج کی گاڑی لے آئے۔

"تم گھر میں آئے ہو؟" وہ مہوڑہ بخت کی۔

"گھنٹی بجی کی خبر کہنے، اس کا دھیان رکھتے۔" وہ گھبراہٹ سے بولتا تھا۔

"یہ سب کیا دھڑا تمہارا بی بی ہے۔"

"میرے کیے دھڑے کا سبب تم ہو۔"

"کاش میں مرجاؤں۔" وہ دھڑکے سے بولی۔

"آئی ڈونٹ کیئر، میں دوسری شادی کروں گا۔"

اس نے اسے چھڑا تھا اور ریج بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھی۔

بستون ہونگے تھے ریج احمد کی طرف سے خاموشی دیکھنے اور سننے کو مل رہی تھی کوئی شور نہ گنگہ، کوئی دوا بیا نہیں ہو رہا تھا۔ خاموشی سے چپ چاپ صبح اٹھتی بیٹھا کرتی، پورا دن یوں ہی گھر میں کھوٹے پھرتے گزار دیتی اور سر شرم ہی سونے کے لیے لیٹ جاتی تھی وہ کالی دونوں سے اس کی رو بھی پچھنی سی دین سن لوٹ کر رہا تھا، لیکن جان بوجھ کر اسے دسرب نہیں کر رہا تھا کہ وہ پھر سے مختل نہ ہو جائے، اس کا ارادہ آج اس کے ساتھ کہیں باہر ڈنر کرنے کا تھا، لیکن کچھ ہی دیر میں اس کے ہاتھ اشتہام بخت کے گھر سے فون آ گیا وہ مہوڑا اور ریج کو رات ڈنر کے لیے اپنے گھر انوائٹ کر رہے تھے۔

مہوڑہ قدرے پس و پیش کے بعد ہائی بھری۔

"اوکے بیٹا! شام سات بجے پہنچ جانا گاؤں کا راستہ خراب ہے۔" انہوں نے فون بند کرتے ہوئے تاکید کی تھی۔

اس وقت چار بجے کا وقت ہو رہا تھا۔

وہ آٹس سے سیدھا گھر پہنچا تھا۔ مارو بیگم اسے جلد آتے کو کچھ کر حیران ہوئی تھیں۔

"ہم نے گاؤں جانا ہے۔ چاچا جی نے انوائٹ کیا ہے ڈنر پر۔" وہ انہیں بتا کر اور پلٹ آیا تھا۔

دروازہ کھولا تو وہ سامنے رائٹنگ پیئر پر بھولتی ہوئی نظر آئی۔

"اسلام علیکم۔" ہمیشہ کی طرح اس نے خود ہی سلام کیا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟" وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ

www.Paksociety.com

سے ملیں اور اس کے ساتھ پیار کیا تھا؟ احتشام بچانے اس کے سر پہ ہاتھ پھیلا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر اندر آگئے تھے۔

"میں نے سات بجے کا تھا؟ تم آٹھ بجے پہنچے ہو؟ ایک گھنٹہ لیٹ کیوں ہو گئے؟" انہوں نے صوفے پر بیٹھے ہوئے احتشام کو دیکھا۔

"میں نے سوئے اور تیار کی باتوں کی طرف تھلا ہوا تھا۔"

"تو راتے میں رنج کی طبیعت خراب ہونے کی بات چھپا گیا تھا۔"

"بھابی! آپ اتنی پیاری ہیں! بالکل پری لگتی ہیں جو راستہ ہلک کر دینا میں لگتی ہے۔"

نشا اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی اور اتنے عرصے میں پہلی بار رنج بے ساختہ انداز میں کھکھلا کر ہنسی بھی جس پر موز بخت کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی چونک کر دھچکی سے دیکھا۔

"دیکھ رہے ہو اپنی بہن کا کمال؟" احتشام بخت نے جسے دیکھا۔

"جی دیکھ رہا ہوں اور اپنی بہن کو انعام دینے کو بل چاہ رہا ہے۔" موز نے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے اسے آواز دی۔

"جی بھالی؟" دودھ سے پی بولی۔

"یہ تمہارا انعام؟" اس نے والٹ سے ہزار ہزار کے چیک نوٹ نکال کر اس کی سمت بچھا دیے۔

"انعام؟ کس چیز کا؟" وہ حیران ہوئی۔

"ساری بات میں پوچھتے ہیں رکھ لو۔" موز نے سب کو متوجہ دیکھ کر بات کوئل کر دی تھی۔

نشا نے فوراً "پیسے تمام لے لے تھے اور پھر موز کے قریب جھک کر بولی۔ "مجھے پتا چل گیا ہے کہ یہ کس چیز کا انعام ہے؟" موز بیک دم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

ہو گیا تھا۔ وہ لڑکیاں ان سے ذرا قاصدے، ذرا رنگ و دم کے گول حصے میں غلوں کھنڈنے، بیٹھی ہوئی تھیں۔

"آپ کی ہنسی کا انعام ملا ہے مجھے، تھوڑا اور جس دین، میرا کارہ بار چل نکلے گا۔" وہ رنج کے کان میں

سرگوشی کرتے ہوئے بولی رنج کی نظراس کے ساتھ میں پکڑے پیسوں پر گئی تھی۔

"پورے پانچ ہزار ہیں ہیٹ اسٹائل سے سوٹ لہا کی۔" نشا نے اپنی پالتنگ تائی اور رنج کے ہونٹوں کو مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

"اگر میں کوں کہ یہ پیسے واپس کر دو تو؟" اس نے نشا کے تاثرات جانچے۔

"نہ بھانپ گھر آئی دولت کون ٹھکراتا ہے؟"

"میں تمہیں دس ہزار دہائی کی" اس سے بھی زیادہ کمزور اسے نوٹ۔ "رنج نے لہا لیا تھا۔"

"بھابی! میں لوٹا نہیں ہوں کہ پھر جانوں یہ انعام مجھے میرے بھائی نے دیا ہے، میرے لیے یہ فی کالی ہے۔"

"اس دفعہ وہ رنج کو ہری لھنڈی دیکھائی تھی۔

"بڑی تو تاج پٹم ہو یا اس نے خفگی سے کہا۔

"تو تاج پٹم نہیں وقار ہوں وقار اور شعرتو تب نے سنا ہی ہو گا کہ کسی ایک کا بن کے رہنا بھی بڑی بات ہو کر رہی ہے۔ اپنا بھی کچھ یہ ہی معاملہ ہے۔"

اس نے فرحی کار کھڑے کیے تھے۔

رنج اس بڑی تھی اس کا موز تھوڑی سی دیر میں ہی کافی اچھا ہو گیا تھا اور اسی موز کے ساتھ انہوں نے ہنسنے مسکراتے ہوئے کھانا کھایا تھا۔

"بھالی! آپ لوگ ذرا رنگ و دم میں جا کر بیٹھیں اور بھابی! آپ پلیز میرے ساتھ یہ برتن میٹھے مشد کریں، شام کے کھانے کے برتن میٹھے کی ذمہ داری میری ہوتی ہے۔"

نشا کا انداز لا پرا سا تھا، رنج کے ساتھ باقی سب بھی خفک گئے۔

"نشا! نہ بہت بیگم نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

"دو دن دیری ای اب بھابی کوئی غیر نہیں ہے۔"

"لیکن نشا بھابی یہاں مسلمان ہیں یہ کیا لگتا ہے؟"

بے؟ انعام نے رنج کے ہاتھ سے برتن لینے چاہے۔

"ارے نہیں، نشا کی خوشی ہے تو کیا حرج ہے؟"

رنج نے نامہ کو راستے سے ہٹایا اور برتن اٹھ کر کرنی

میں پٹی تھی، وہ سب نشا کی باتوں اور حرکتوں پہ ہنسنے ہوئے ذرا رنگ و دم میں آگئے، جبکہ وہ دونوں برتن سیٹ رہی تھیں۔

"پچو! جلا کر چائے کا پانی بھی رکھ دوں، میں تب تک نہیں صاف کرتی ہوں۔"

اس نے ایک اور کام موزا، رنج نے چائے کا پانی ہی نہیں رکھا، بلکہ چائے بھی بنائی تھی۔ تب وہ دوبارہ چن میں داخل ہوئی تھی۔

"چائے تیار ہے۔"

"میں بھی تیار ہوں۔" نشا انہیں پلٹے لنگے کپ اتار کر ان میں چائے انڈیلنے لگی۔

"آپ یہ چائے لے جائیں، میں کچن سمیٹ کر ابھی آ رہی ہوں۔"

اس نے کپ ٹرے میں سجا کر ٹرے رنج کے حوالے کی۔

"گھر آئے مہمانوں سے کام کروانے کا اچھا طریقہ ہے یا؟"

رنج نے اسے خفگی سے ٹھوڑا۔

"آپ کو مسلمان کس نے کہا؟" نشا شرارت سے بولی۔

"اب کام لینے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔"

"جائیں اب۔" چائے لھنڈی ہو رہی ہے۔ موز بھائی گرم چائے پیتے ہیں لھنڈی نہیں۔"

رنج نے ذرا رنگ و دم میں اگر سب کو چائے سرو کی تھی اور موز بخت اسے اس روپ میں دیکھ کر خوش کھانے کے قریب ہو رہا تھا۔ کیا یہ وہی رنج احمد تھی جو چند گھنٹے پہلے انتہائی شکستہ لگ رہی تھی۔

"کھائے؟" اس نے ٹرے موز کے سامنے کی۔

"تھیکس۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"اور اگر بیٹھ جاؤ بیٹا، نہ بہت بیگم نے اسے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر ان کے قریب آگئے بیٹھ گئی۔

"اتنا عرصہ ہو گیا، آپ لوگ شریوں نہیں آئے؟" شادی کے بعد اس نے ایک بار بھی ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔

"بیٹا! روڈ کس آتا جاتا بھی تو ممکن نہیں ہوتا؟ اور پھر تمہارے بچا صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ شکار

کھیلنے سندھ چلے گئے، آج صبحی واپس آئے ہیں۔"

"آپ کا کوئی بیٹا؟" رنج نے ان کے گھر میں بیٹے کی کسی محسوس کرتے ہوئے پوچھا اور پوچھ کر جھجک بھی گئی تھی۔

"ماشاء اللہ دونوں بیٹیوں سے بڑا ایک بیٹا ہے ہمارا، پانچ سال پہلے پڑھنے کے لیے امریکہ بھیجا تھا، لیکن وہ وہاں شادی کر گئے وہیں کا ہو کر رہ گیا ہے، مجھے پوچھنے اپنی انگریزی وی کے ساتھ لینے کیا تھا۔ وہ بیٹے کو رکھا گیا، موز جب وہاں تھا تو اس نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اس کی آنکھوں پر سفید چھڑی کی پٹی بندھی ہوئی تھی، اسے کچھ دیکھائی نہیں دیتا، سوائے اپنی گوری میم کے، پاکستان میں کچھ ہو رہا ہے اسے ذرا بھی فکر نہیں، ہائے کایو سال پہلے نکال ہوا تھا، لیکن وہ لوگ ابھی تک شادی اور رخصتی کی بات نہیں کر رہے، وہ یہی شانی الگ ہے۔"

فرحیت بیگم نے بغیر کسی لگی پٹی کے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"کیوں رخصتی کیوں نہیں ہو رہی؟" اسے حیرت ہوئی۔

"اس لڑکے کی بہن ہمارے بیٹے کی معیت تھی بیٹا جب عصام ان کی بیٹی چھوڑے گا تو کیا وہ ہماری بیٹی نہیں چھوڑیں گے؟" انہوں نے اپنے بیٹے کا نام لے کر کہا، لہجے میں آزدی تھی۔

"اوہ تو یہ تو واقعی بہت ٹھیک اور حساس معاملہ ہے، جہاں نامہ کا نکاح ہوا ہے وہ کوں لوگ ہیں؟"

رنج کو سن کر بیٹھائی اور افسوس ہوا تھا۔

"وہ کوئی غیر نہیں، میرے اپنے ہیں بیٹا! میرے سگے بھائی، لیکن میرے بیٹے کی غلطی کی سزا وہ میری بیٹی کو دے رہے ہیں، نہ طلاق کا کہتے ہیں نہ رخصتی کا۔ میں تو اپنی بیٹی کی تحرم میں ہی ہوں۔"

فرحیت بیگم کا لہجہ جھجک گیا تھا اور رنج کا دھیان کہیں سے کہیں چلا گیا تھا، صوفی الیاس صاحب بھی تو اس کے پاس ہی تھے، اس کی اہی کے سگے بھائی، لیکن...

www.digipak.com

”آپ پریشان نہ ہوں آئی! ابن شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے چائے کا کپ نہیں پرکتے ہوئے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس میں تسلی دی۔

”اس لوگے بنا اتم چائے پیو میں نے تم لوگوں کو بھی پریشان کر دیا۔“ انہوں نے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”کس نے کس کو پریشان کر دیا؟“ نشا اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”تم نے اپنی بھابی کو پریشان کر دیا۔“ تربت بیگم نے بات بدل دی۔

”حاضرین چائے کیسی تھی؟“ اس نے با آواز بلند پوچھا۔

”تعریف سننا چاہتی ہو؟“ موز نے اسے چھیڑا۔

”میں بھلا کیوں سننا چاہوں گی؟“ سنے وہ جس نے چائے پلائی ہے۔ ”اس نے رتیج کی طرف اشارہ کیا“ موز کو جیسے اچھو لگ گیا تھا۔

”کیا واقعی؟“

”تو اور کیا میں اپنا کریڈٹ ان کو دے رہی ہوں؟“ وہ تھکا ہوئی۔

”تو پھر ایسا کرو اگر کیتلی میں تھوڑی اور چائے پئی ہوئی ہے تو وہ بھی کپ میں ڈال کر میرے لیے لے آؤ۔“ موز نے ویجی کا مظاہرہ کیا اور احتشام بخت زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

”یاد اپنے نسلے میں ہم بھی اپنی بیویوں کے بڑے عاشق ہوا کرتے تھے، لیکن تم تو ہم سے بھی چار ہاتھ آگے ہو۔“ ان کی بات پر موز بھی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”میرا تو دل چاہ رہا ہے نشا کو اٹھا کر گھر لے جاؤں“ کم از کم میری بیوی تو خوش رہے گی نا؟“

”کیا کہا؟“ آپ مجھے اپنی بیوی کے لیے گھر لے کر جائیں گے؟ کیا آپ نے مجھے تمنا کرنے والی بندر یا سمجھ رکھا ہے؟ ہل بھلاؤں کی آپ کی بیوی کا؟“

نشا کمر کس کے میدان میں اتر آئی اور وہ سب ہی ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔ کئی دیر ہوئی

تھی موز نے چائے ختم کی اور کپ رکھتے ہوئے کمرہ ہو گیا۔

”چلیں؟“ اس نے رتیج سے کہا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ احتشام بخت کو حیرانی ہوئی۔

”موز نے فوراً کھاک کی سمت دیکھا۔ ساڑھے گیارہ کا نام ہو رہا تھا۔

”تو پھر؟“

”تو پھر یہ کہ تم لوگ رات میں رکو گے، دلہن جانے کا نام نہیں ہے، میں ناشتا کر کے چلے جاؤں۔“

”لیکن پچا جان۔“ موز تذبذب کا شکار ہو گیا۔

”لب لیکن دیکھ کہ اس سے کیا؟“ ہم نے پہلے ہی تمہارے لیے بیڈ روم سیٹ کروا دیا تھا، اگر آرام کرنا چاہتے ہو تو کمرے میں چلے جاؤ۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”آرام کی طلب تو واقعی ہو رہی ہے، صبح سے اس میں بیٹھ بیٹھ کر تھک گیا ہوں۔“ موز نے ٹھٹھکی کا اعتراف کیا تھا۔

”تو جانا پھر، نشا اپنے بھائی کو بیڈ روم میں چھوڑ آؤ۔“ انہوں نے اشارہ کیا اور خود بھی آرام کرنے غرض سے کھڑے ہو گئے تھے۔ نشا موز کو بیڈ روم تک چھوڑ کر واپس آئی۔ آج اس کا ٹارگٹ رتیج تھی۔

رات کا نہ جانے کون سا پھر تھا جب رتیج بیڈ روم میں آئی تھی، موز گہری نیند سو رہا تھا، وہ بھی اگر خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی اور ٹھٹھکی کرکتے ہی اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں۔

صبح آٹھ بجے کھلی تو اپنے گرد بانڈوں کا حصار محسوس ہوا تھا، اس نے آنکھیں پھیل کر دیکھا تو وہ موز کے سینے سے لگی سو رہی تھی اسے ایک دم کرنٹ چھو گیا تھا وہ جھٹکے سے اس کے حصار سے نکل گئی۔ جس کی وجہ سے وہ بھی بیدار ہو گیا۔

”ہاں ہوا، صبح صبح اٹتے کرنٹ کیوں مار رہی ہو؟“ وہ ہنسی کے لٹ ذرا سا لہجہ ہوا تھا بغیر شرٹ کے اس کے سلاز بہت نمایاں ہو رہے تھے، اس وقت تو وہ اسے ہنسی بازی بلڈرے کم نہیں لگ رہا تھا، رتیج نظر جانے مجبور ہوئی تھی اور ڈورنگ نیل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا حلیہ درست کرنے لگی تھی۔

”نار! رات اتنی دیر لگائی تم نے آنے میں میں انتظار کرتے کرتے سو گیا۔“ موز نے اس کے عقب سے آکر چہرہ اس کے بالوں میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے اگر پتا ہو تاکہ تم ہمیشہ کے لیے گہری نیند سونا چاہتے ہو تو میں جلدی ہی آجاتی۔“ اس کے پاس بھی بس تیز دھار الفاظ کا ذخیرہ تھا۔

”کیوں اپنے بچے کو شیم کرنے پر تبی ہوئی ہو؟“ موز آنکھیں بند کرتے ہوئے بھاری کپیرہ آواز میں بولا اور رتیج کو لگا اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سنسنی بھڑکتی ہو اس کے ہاتھ سناکت ہو گئے۔

”پھر؟“ وہ مشکل بول رہی تھی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ تم یہ بات مجھ سے چھپاؤ گی؟“ وہ اس کے گلے سے اپنا گال مس کرتے ہوئے بولا۔

”مممم۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، وہ بے ربط سا بولی تھی۔

”تمہیں میں جانتا ہوں تاکہ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ پریقین لہجے میں مضبوطی سے بول رہا تھا۔

”لیکن اس نے کچھ کتنا چاہا تھا اور موز بخت نے اسے باتوں کے حصار سے آڑ لے کر تے ہوئے اس کا سر اپنی سمت موز لایا اور اس کا چہرہ قہم کر لوٹا گیا۔

”آپ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو کہ ایسی بات نہیں ہے۔“ موز کا انداز سخت تھا اور اس کی بے بسی کا بیالہ تھلکے کو تھا کہ دروازہ سے دستک ہونے لگی۔ وہ لیٹ گیا تھا اور رتیج احمد جن قدموں پر کھڑی تھی پتھر بن گئی تھی وہ شخص وہ بات بھی چلن گیا تھا جو وہ اپنے آپ سے بھی چھپائے پھر رہی تھی اسے کئی دنوں سے اپنی کیفیت پر شک ہو رہا تھا، لیکن وہ ہر بار

اپنے شک کو ٹال جاتی تھی وہ شک یہ یقین کی مہر میں لگنا چاہتی تھی مگر موز بخت اس کے دل کے پاتال میں چھپے اس راز کو بھی نکال لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ان لوگوں نے ناشتا کیا اور پھر ان کی واپسی کا سفر شروع ہوا تھا، لیکن رتیج کے خاموش آنسو بہہ رہے تھے اس کا وہ بیان اپنی ماں کی طرف تھا وہ کتنی آسانی سے اس سے انجان ہو گئی تھیں، کتنی آسانی سے انہوں نے اسے بھلا دیا تھا۔ جھٹکے وہ تین روز سے اسے ان کی یاد شدت سے آ رہی تھی اور ان کی کمی بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب وہ اس کی ذرا سی تکلیف پہ تڑپ اٹھتی تھیں اور ہر وقت اسی کی فکر میں لگی رہتی تھیں ایک اچھی ماں کی صورت۔

رتیج: ”اٹھ کر شاور لے لو میں نے تمہارے لیے ناشتا بنا دیا ہے۔“

”اتنی جلدی؟“ وہ بے زار ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ وہ الیاس بھائی آرہے ہیں، ہم سے ملنے۔“ انہوں نے آہٹ کی سے کہا۔

”کیا؟“ صوفی الیاس صاحب آرہے ہیں مگر کیوں؟“ وہ سنہلے ہوئے بولی۔

”انہیں یہاں لاہور میں کوئی کام تھا، کل شام سے آئے ہوئے ہیں، شاید کسی جماعت کے ساتھ آئے تھے، آج واپس اسلام آباد جانا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم سے مل کر جامیں گے۔“ لیکن بیگم نے قری سے بتایا۔

”صرف مل کر جامیں گے یا کوئی بیچر بھی دے کر جامیں گے؟“ رتیج نے غیر شجیدگی سے کہا۔

”بس کھانا رتیج اچلدی سے تیار ہو کر بیچے آؤ۔“ وہ تیار ہو کر نیچے آئی تو لیکن بیگم جربز ہو کر وہ گئی تھیں۔

”اب کیا ہوا ہے؟“ رتیج کو بے زاری ہوئی۔

”کوئی اور کچھ نہیں تھے پسنے کے لیے؟“ انہوں

نے جیتر اور اس کے اوپر پتے وائٹ ٹاپ کو ناگواری سے دیکھا۔

”میرے سارے کپڑے ایسے ہی ہیں ماما!“
”کیوں بیٹا! ایسا بھائی کو ایسا لباس پسند نہیں ہے“
انہیں دیکھ کر غصہ آئے گا۔

”ماما! میں اپنے گھر میں ہوں ان کے گھر میں نہیں اور ویسے بھی وہ مجھے اس لباس میں پہنے بھی دو تین بار دیکھ چکے ہیں آج پہلی بار نہیں دیکھیں گے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا دیا۔

”بیگم صاحبہ صوفی صاحبہ آئے ہیں۔“ ملازمہ نے اندر آکر اطلاع دی۔

”ایسا بھائی آگئے؟“ سیکنڈ بیگم چونک گئیں۔

”تم بھی ناشتا جلدی کر کے آجاؤ۔“ وہ اپنا دلہہ سلیٹے سے اوڑھتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔

”اسلام علیکم بھائی صاحب!“ ان کے بچے میں احترام تھا اور نظریں نیچی تھیں۔

”وعلیکم السلام سیکنڈ! آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا شاید والے صوفے پر احمد صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیسے ہیں آپ؟“ سیکنڈ بیگم کے لیے اور انداز میں احترام ہی احترام تھا۔

”اللہ کا کریم ہے تم سناؤ؟“

”جی میں بھی ٹھیک ہوں“ خدیجہ بھابھی اور بچیاں کیسی ہیں؟“ انہوں نے گھروالوں کے متعلق پوچھا۔

”مقدس اللہ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں“ تمہیں سلام کہہ رہی تھیں۔“

”وعلیکم السلام“ میری طرف سے انہیں پیار دیجیے گا۔ بہت دن ہو گئے ان سب سے ملے ہوئے اب اسلام آباد کا چکر لگانے سے مل کر رہی کوں گی۔“ سیکنڈ بیگم مسکرا کر بولیں۔

”اقبالہ“ تمہیں اور بیٹی کو بہت یاد کرتی ہے۔“

”تو اس سے کہا کریں تاکہ فون پہ بات کر لیا کرے۔“

”میں سیکنڈ! بیٹی فون کے رابطے میں ٹھیک نہیں سمجھتا۔“

”تو ہم کر لیا کریں گے؟“ سیکنڈ بیگم نے طریقہ دھونڈا۔

”اتنا ضروری بھی نہیں جب اسلام آباد آئی ہو تو ان سب سے ملاقات تو ہو ہی جاتی ہے تمہاری؟“

فون والی لائن پہ نہیں آرہے تھے سیکنڈ بیگم سمجھ گئی تھیں۔

”ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”بیگم بیٹی نظر نہیں آرہی؟“ انہوں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے پوچھا۔

”وہ ناشتا کر رہی ہے ابھی آجاتی ہے۔“

”اس وقت ناشتا؟“

”جی آج منڈے سے ٹیوٹریشن سے چھٹی تھی اس لیے ذرا الٹ اٹھی ہے۔“ سیکنڈ بیگم نے پچھپاتے ہوئے وضاحت دی۔

”ہوں!“ صرف ہوں کر کے رکھ گئے تھے۔

”اسلام علیکم یا بھائی جان!“ بیگم صاحبہ کے چہرے سیدھی میس نکلی تھی۔

”وعلیکم السلام“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن اس کے لباس کو دیکھ کر ان کے چہرے پہ ناگواری کے سائے پھیل گئے تھے۔

”قلمی کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“

”بہن! لاور لے کر آئیں نا اسے؟“ بیگم نے فرمائش کی۔

”وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی۔“

”کیوں کوئی پرہیز ہے؟“

”وہ آزاد نہیں مھو تھی۔“ انہوں نے زور دے کر کہا۔

”یعنی قید ہے؟“ بیگم نے مطلب اخذ کیا۔

”نا کھڑ قید نہیں ہو گی۔“

”آپ ہمیشہ کے لیے کسی ایک ہی جگہ پر بند ہو کر رہ جائیں تو وہ قید ہی ہوتی ہے چاہے اپنا پیرہن مہم ہی لیا

”ہو۔“ وہ بھی ان کی بھانجی تھیں۔

”بیگم! سیکنڈ بیگم نے سر ہلاتی تھیں۔

”مہرولی۔“ اس نے فوراً ”مہرولی“ بھی کر لیا اور اسے میں اس کامیاب مل جتنے لگا تھا۔

”اللہ کی خدمت۔“ وہ معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”مہرولی یار فارین! میں سو رہی تھی مجھے یاد ہی نہیں تھا میں تم لوگ رکو میں آ رہی ہوں۔“ اس نے کسی دہشت سے بات کی اور فون بند کر دیا تھا۔

”ماما! میں جی ہر کوں کی قادیہ وغیرہ کے ساتھ بدگراہی سے بوسہ لے لیٹ بھی ہو جاؤں۔“ اس نے اپنی ماں کو سمجھا دیا۔

”اوکے ڈیڈ! خدا حافظ ماموں جان!“

وہ ہاتھ ہلا کر چلی گئی تھی اور صوفی ایسا صاحب باگوار نظروں سے اس کی پشت کو گھورتے رہ گئے تھے۔

”یہ لڑکی کتنے آرام سے ماں باپ سے اجازت لیے بغیر اپنی سسلی کے ایک فون پہ بیٹھ کر مٹی مٹی مٹی اور ماں باپ بھی کتنے مطمئن تھے اگر اس کی جگہ صوفی صاحب کی اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ اس وقت تک اس کی باتیں تو کرنا سے سترے ڈال دیتے ہوتے جس انوس کے ان کی نظروں کے سامنے تک نہ گرتی جاتے والی لڑکی ان کی بھانجی تھی۔

”تم تو کوں کو بتا رہے کہ یہ کہاں گئی ہے؟“ ان کا رخ احمد صاحب کی طرف تھا۔

”وہ جہاں بھی گئی ہے لیکن ہمیں اپنی بیٹی پر اعتماد ہے۔“ احمد صاحب کے لیے میں میں بول رہا تھا۔

”یقیناً ٹیٹ بھی جانتے ہیں احمد صاحب!“

”مجھے پھر بھی اپنی بیٹی پہ بھروسہ ہے۔“ وہ کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتی کہ جس پہ اس کے ماں باپ کو شہنشاہ ہونا پڑے۔“ احمد صاحب مضبوط لہجے میں بولے۔

”ہونہ! بیٹی ہو یا بیٹا“ آخر یقین کو خمیس لگائی دیتا ہے بہر حال دعا ہے کہ اللہ تمہارا یقین سلامت رکھے۔“

انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں سیاست اور حکومت کو ذریعہ بحث لاکر گفتگو میں مصروف ہو چکے تھے۔



”عارف! کیا بات ہے؟“ تم کچھ پریشان لگتی ہو؟“ خدیجہ بیگم نے عارف بیگم کے سامنے چائے رکھتے ہوئے پوچھا۔

”پریشان تو میں واقعی ہوں۔“

”کیوں؟ کس لیے؟“

”مہرولی طرف سے۔“

”خدیجہ! مہرولی؟“

”مہرولی تو ٹھیک ہے لیکن حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”مہرولی اور اس کے بچے اشتیاق کا بیٹا ایک ساتھ امریکہ گئے تھے۔“

”پھر؟“

”پھر سننے میں آیا ہے کہ اس نے وہاں شادی کر لی ہے۔“

”تو تم کیوں ہلکان ہو رہی ہو؟“ خدیجہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر عصام وہاں شادی کر سکتا ہے تو پھر مہرولی بھی کر سکتا ہے۔“ اور ہمارا تو ایک بی بی بیٹا ہے ہمارے بھائی کا واحد سارا اگر وہ انگلینڈ یا امریکہ کا ہو کر وہاں بیٹھ کر رہا تو ہم کیا کریں گے؟“

”مہرولی کی معنی یا شادی کر کے بھجوا دیں۔“

”ہاں یہ سلی بولی مجھ سے۔“

”یہ کام تو اب بھی ہو سکتا ہے اسے گھر بلا لو اور چھ دیہی بولی میں کام نہ لادو۔“

”کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟“ عارف بیگم ٹھٹھکی گئی تھیں۔

”اور پھر آتے ہی انہوں نے سب سے پہلا کام یہ ہی کیا تھا کہ مہرولی کو کال ملائی تھی۔“ وہ شاید سو رہا تھا اس

ہونگے۔" رتی نے اسے باور کروایا۔

"بہر حال جو کچھ بھی ہے ہمارا گھر تو ان سب چیزوں سے پاک ہے قاتلہ نے شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔
"خیر یہ بتاؤ شادی کا کب ارادہ ہے؟" رتی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"جب وہ آئیں گے۔"

"ہیں؟ انہوں نے ابھی آنا ہے اور تم پہلے ہی آ گئیں؟" وہ پھر بن بن کر بولنے لگی تھی۔

"رتی پوری بات تو سن لو۔" قاتلہ خفگی سے گویا ہوئی اور رتی فون کی دوسری طرف یکدم کھٹکھٹا کر فنی تھی۔ اس کی جیب کی ٹھنک ریسور سے باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ "میں فون بند کروں؟"

"اوکے اوکے یہ بتاؤ کہ انہوں نے کہاں سے آتا ہے؟" رتی اپنی فنی کنوول کرتے ہوئے بولی۔
"امریکا سے۔"

"واٹ؟ امریکا سے؟ وہ بندہ امریکا میں رہ کر ایک ملائی سے شادی کر رہا ہے؟ کیا اس نے تمہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں۔"
"پھر بھی شادی کر رہا ہے! حیرت ہے یا؟"
"کیوں کیا بھی پہلے ایسی شادی نہیں ہوئی؟" قاتلہ نے ناراضی سے پوچھا۔

"ہوئی ہے ناں۔ تمہاری امی ابو کی وہ اگر شادی سے پہلے تمہارے ابو کو دیکھ لیتیں تو انکار کر دیتیں ہو سکتا تھا کہ گھر میں چند اڑال کے مراحمیں۔" رتی کہتے ہوئے خود بھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی قاتلہ کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم بہت خراب ہو رتی!"
"شکر ہے کہ تم تو خراب ہونے سے بچ گئی ہو۔"
"واقعی اگر تمہارے ساتھ رہتی تو پھر میں بچ سکتی تھی۔" قاتلہ نے اعتراف کیا۔

"ویسے ایک بات بتاؤ کہ کیا یہ سید مہوز بخت بھی مولوی ٹائپ بندے ہیں؟" رتی کا انداز ازارانہ

تھا۔ جو ماموں جان کو پسند آگئے ہیں۔"
"یار! مجھے کچھ بھی بتا نہیں ہے۔ میں بالکل انجان ہوں۔"

قاتلہ اس کی باتوں سے زنج ہو گئی تھی۔
"وہ سوری یاد رہا یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تمہیں جو بھی مل جائے بس قبول ہے۔" رتی نے یاد کرنے کی ایک ٹینک کرتے ہوئے کہا۔

"شادی میں کتنے دن پہلے آؤ گی؟" قاتلہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"دو دن۔" اس نے مختصر "کنا" کر میں پہلے آئی تو تمہارے گھر میں تھر تھلی آجائے گی یا تو ماموں جان گھر میں رہیں گے یا پھر میں۔" رتی نے اسے ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا۔

"لیکن رتی! تم آرام سے بھی تو رہ سکتی ہو؟"

"نہیں یا تمہیں آرام سے رہنے کا وعدہ نہیں کرتی میرا مومن بھی بھی بدل سکتا ہے میں کسی وقت بھی چل چا سکتی ہوں۔" میری سچے میں سکون شامل ہی نہیں ہے اور ماموں جان گھر سے بندہ بول کے باہر ایسے اصرار لے لے بیٹھو وہ کپڑے پہن کر یہ مت کرو! سب سوچا جب جاگ جاؤ سوری یاد رہیں یہ سب نہیں کر سکتی ہیں جب اسلام آباد جاتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں اسلام آباد کی صاف شفاف پرسکون سڑکوں پہ دن رات گاڑی اڑاتی رہوں لیکن ماموں جان کی وجہ سے قید ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے جیسے پرکاشیہ لگے ہوں۔"

اس نے وجہ بتائی اور قاتلہ جب ہو گئی تھی۔
"بیلو۔" رتی نے دوسری طرف خاموشی محسوس کرتے ہوئے پکارا۔

"تم چپ کیوں ہو گئیں؟"

"نہیں کچھ نہیں تم بولو اور کیا بولنا ہے؟" قاتلہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا اور رتی کو بھی بریک لگ گئے تھے۔

"سوری یار! اتنی تھنک کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔"

رتی کو احساس ہوا۔
"اس اوکے تم کو۔"

"مجھے کیا کہنا ہے میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں کہ شادی شادی سے کافی دن پہلے آجائیں گی مگر پہلے کہ تم پورے ہو جاؤ گی۔" رتی نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا تھا۔ اور قاتلہ نے ساختہ مسکراہٹھی تھی۔ رتی اسے خفا نہیں کر سکتی تھی۔

"اوکے میں انتظار کروں گی۔"
"اوکے اللہ حافظ۔" رتی نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

اور چند ہی دنوں میں دونوں گھروں میں شادی کے بگے جاگ اٹھے تھے مہوز بخت کی اسٹیڈی اور جاب کا فٹنگ مکمل ہو چکا تھا اس لیے اس نے فوراً واپسی کا فریاد نہ لیا تھا کیونکہ عارف بیگم شادی کی تاریخ طے کر چکی تھیں۔ ایک ہفتے بعد اس کی شادی بھی ان کی طرف سے ساری تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔

وہ صبح تیار ہو کر گھر میں جیسے چل پل اور کہاں بھی سی ہوئی تھی گاؤں سے فائدہ اور نشا بھی آگئی تھی۔ اس کے دوست بھی اس سے ملنے کے لیے آ رہے تھے اور حسان نے تو اس کے پاس ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

"بھابھی سے ملاقات ہوئی تمہاری؟"

"نہیں کی بھابھی؟" مہوز نے حیرانی سے پوچھا۔
"میری بھابھی؟"

"تمہاری بھابھی سے میری ملاقات کیوں ہو گی؟"

"کیونکہ میں تمہاری منگیت اور ہونے والی بیوی کی بات کر رہا ہوں۔" حسان نے اسے حقا سید کیا۔

"اوہ اچھا اچھا۔ نہیں یار! ابھی تو ملاقات نہیں ہوئی۔"

"کیوں؟" حسان نے بے ساختہ پوچھا۔
"کہہ کر رہی ہے۔" مہوز نے سرگوشی میں بتایا۔
"میں کسی مولوی کے گھر رشتہ داری کر رہی ہے؟"

صوفی الیاس صاحب ان کی صاحبزادی ہوتی ہیں قاتلہ صاحبہ اس ان ہی سے شادی کا شرف حاصل ہو رہا ہے مجھے ناچنے بندے کو۔"

حسان کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ "صوفی الیاس کی بیٹی سے شادی ہو رہی ہے؟"

"ہاں کیوں تمہیں اعتراض ہے؟"

"نہیں نہیں، بیٹی! یہ تو میں البتہ باپ پہ اعتراض ہے۔"

"تو مجھے شادی بیٹی سے کرنی ہے باپ سے تو نہیں۔"

"بیوی لو کھی جگہ ہاتھ مارا ہے تم نے؟" حسان کچھ بول کھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیوں؟ کیا مسئلہ ہے؟"

"یار! کافی سخت آدمی ہیں۔ کافی سال پہلے ہمارے محلے کی ایک مسجد میں امامت کرتے تھے اور صبح بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتے تھے اور ان بچوں میں میں بھی شامل تھا۔ سبق یاد نہ ہونے کی صورت میں بچوں کو ہمارے مار کر ان کی چڑی ادھڑکے رکھ دیتے تھے بہت تھکی مزاج اور تنگ نظر بھی ہیں۔ کسی لڑکے کو دیکھ لیں تو توبہ توبہ کرتے ہوئے گزرتے ہیں چاہے وہ بچہ ہمارے بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔"

"خیر تمہیں اس سے کیا؟ تم نے شادی تو ان کی بیٹی سے کرنی ہے وہ یقیناً اچھی ہی ہوگی۔ آئی نے کچھ دیکھ بھال کرنی یہ رشتہ کیا ہو گا۔"

حسان نے اسے تسلی دی تھی اور مہوز اپنے ذہن کو تسلی دے کر مطمئن کرنے لگا۔

"میں قاتلہ کو دیکھنا چاہتا ہوں صرف ایک بار وہ بھی شادی سے پہلے بلیرنگلی حل سوچو۔" مہوز کی بات سن کر حسان بدگ گیا تھا۔

میں کبھی مرے بھی صوفی صاحب کی بیٹی کو دیکھنے کا آئیڈیا نہیں سوچ سکتا۔ وہ تو مجھے بالکل میں انار دیں گے میں ان کی مارتے واقف ہوں تم نہیں ہو۔"

"پلیز یار!"

"یہ ناممکن ہے یار! صوفی صاحب اس شادی سے

www.Paksociety.com

انکار کر دیں گے لیکن شادی سے پہلے جس میں اپنی بیٹی
میں دیکھتے ہیں گے۔ "حسن نے اسے باز رکھا چاہا۔
"میں فاطمہ الیاس کو ضرور دیکھوں گا چاہے مجھے
بھی سہی۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"موزوں پاگل مت بنو۔ فاطمہ تمہاری مگھیر ہے،
تمہاری ہی ہے۔ پھر ایسی جلد بازی کیوں؟" حسن نے
ٹو کا تھا۔

"اگر میری ہے تو مجھے دیکھتے ہیں۔" موزوں کے لیے
میں ضد کا عنصر تھا جس کا بکا اسے دیکھنا تھا کیا!

میں کیا ہو رہا ہے؟ "فاطمہ کے کمرے سے نکل
والیوم میڈک کی آواز سنائی دے رہی تھی یوں لگ رہا
تھا جیسے کمرے میں کوئی اودھم مچا رہا ہو، صوفی صاحب
بیڑھیوں چڑھتے ہوئے اوپر آگئے تھے اور دھڑام سے
دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے ساری لوگیاں مل کر ڈانس
کرنے کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ جن میں ان کی چھوٹی
بیٹیوں بیٹیاں اور ریچ سرفرست تھیں البتہ فاطمہ کچھ
دور ایک کھاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"وہ۔ وہ۔ لہجہ جان۔ وہ! فاطمہ سے چھوٹی رقیہ سے
کچھ بولا ہی نہ گیا اس کی زبان بھلا گئی تھی۔
"بے شرم" بے حیا، انہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی یہ
بے ہودہ حرکت کرتے ہوئے؟ "انہوں نے کھڑے
کھڑے اپنی بیٹیوں بیٹیوں کو تحقیر کر دیے تھے۔
اور ریچ احمد بکا بکا پکرا کے رہ گئی تھی۔ "ماموں! ہم
لوگ کل مندی کے فنکشن کے لیے... اس نے
بولنا چاہا۔

"خبردار لڑکی! تم بس چپ ہی رہو۔" انہوں نے
ریچ کو بولنے سے روک دیا ان کے عتاب کا شکار ان کی
بیٹیاں ہوئی تھیں اسے افسوس ہونے لگا تھا۔

"یہ ذیک کہاں سے آیا؟"

"میں نے کر لی ہوئی۔" وہ فوراً "بولی۔

"جہاں سے لے کر آئی ہو وہیں جا کر پھینک دو۔"
ایسی چیزوں کی ہماری گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

وہ سختی سے حکم دیتے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے
اور وہ بیٹیوں، بیٹوں آنکھوں میں آنسو لیے چپ چاپ
بیٹھ گئی تھیں۔

"نکی ایم سو ری یا رابہ سب میری لاج سے ہوا ہے
ہمیں اتنا مل والیوم نہیں رکھنا چاہیے۔" فاطمہ
نے کہا۔

"اس میں تمہاری غلطی نہیں ہے، ہمارا گھر یہاں
ہے۔" آج قدرے "آسیب زدہ" لہجہ سے میں نے
کہنے میں بھوت مچے ہیں، میں خوشی میں مبتلا
جاسکتی۔ بس مام کیا جاسکتا ہے، شکر ادا کر کے فاطمہ
اس گھر سے نکل کر آواز ہو رہی ہے، ہم نے ابھی
تجائے اور کتنی سزا کاٹی ہے؟"

رقیہ بولنے لگی تو ان کی بھروسہ فاطمہ کی جلی جلی تھی
اور بائیں آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ صوفی
الیاس صاحب نے واقعی انہیں آج تک کھل کر
سناں بھی نہیں لینے دی تھی۔

وہ چاروں بیٹوں، بس اپنے گھر کی چار دیواری سے
واقف تھیں۔ کبھی کسی پھونکی خانہ، ماموں کی چادر
کے گھر بھی ان کا آنا جانا نہیں ہوا تھا۔

"اس کو اسے یاد رہے۔ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے، ہم کیا
اور چیز سے ناگم پاس کر لیتے ہیں۔" رقیہ نے ان کو
بھلایا۔

"میری! سن! وہ پھر آجائیں گے۔" رقیہ سختی سے
بولی۔

"فاطمہ! یاد رکھاؤ میں ان سب کو۔" رقیہ نے
چپ بیٹھی فاطمہ کو گھسیٹا اور بیڑی مشکل سے اٹھایا
ٹھیک ہوا تھا۔ وہ سب دھوئیں اٹھانے کے لیے آئی تھیں
اور اسے میں بیٹی کرنا بھی جمع ہو گئی تھیں۔

"کمال جاری ہو ریچ؟" فاطمہ ہر وقت اسی کی
فکروں میں لگی رہتی تھی، اس وقت بھی اسے
دیکھ کر بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔

"موسے کے لیے بہت سخت فیڈ آ رہی ہے، اس

نے جانی روکنے کی کوشش کی۔
"لیکن تم تو یہاں میرے بیڈ روم میں سو رہی ہو
نہ؟"

"میں بارگاہی تم نے خود ہمیں چھوڑ کر چلے جانا
ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہم تمہیں پہلے ہی چھوڑ دیں
اور نہ۔" بہتر ہے کہ تم بھی کچھ دیر کے لیے سو
باؤ میں آؤ گے، یہ بھی وہ تمہیں سوئے نہیں دیں گے۔"
اس نے کہتے تھے شرارت سے اسے چھیڑا تھا۔
"ریچ! فاطمہ! سن دی۔"

"اوکے۔ میں جارہی ہوں، رقیہ کے بیڈ روم میں
جگہ تلاش کرتی ہوں۔"

ریچ مسکراتی ہوئی بیڑھیوں اتر آئی اس کا رخ بچن
کی سمت تھا فرق سے جا کر اپنی با اور واپس اوپر جانے
کے لیے قدم برحاصل تھے رقیہ کا گھر بھی اوپر ہی تھا۔
ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ
بیڑھیوں کے قریب کارنر پر رکھے فون پر انتہائی تیز
دھم دھم کی گئی جب وہ فون باز کر لیا تو اسے فون
پر بیڑھیوں پر آواز آئی "رات کے دو بجے کا وقت تھا اس
وقت بھلا کون ہو سکتا تھا؟"

"ہیلو!" وہ اپنی آواز کو ذرا نارمل رکھتے ہوئے بولی
تھی۔

"اسلام علیکم!" دوسری طرف سے ہماری موانہ
توڑ سنائی دی تھی۔

"وعلیکم السلام" آپ کون ہیں؟ کس سے بات کرنی
ہے؟"

ریچ اپنی دھن میں پوچھ رہی تھی۔
"فاطمہ الیاس ہے۔" دوسری طرف سے بڑے
الہیہان اور اطمینان سے کہا گیا تھا "ریچ بری طرح چونک
گئی تھی۔

"فاطمہ الیاس ہے؟ مگر آپ کون ہیں؟" اسے
جس ہوا تھا تینہ اونگھتی تھی۔

"میں جو بھی ہوں، آپ بس میری ان سے بات
کرنا، میں پلیز، دوسری طرف سے بیڑی جاہت سے
نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اور ریچ دو سیکنڈ کے لیے چپ ہو گئی

تھی اور پھر اس کے ذہن میں کھڑے کھڑے شرارت سا
منی تھی۔

"تو پھر کیجیے بات، میں فاطمہ الیاس بات کر رہی
ہوں۔" اس نے دھڑلے سے جھوٹ بولا تھا۔

"میں سید موزوں بخت بول رہا ہوں۔"
اس نے اپنا ہاتھ کر ریچ کو اٹھانے۔ مجبور کر دیا تھا۔
"آپ۔ آپ نے اس وقت گل گئیوں کی؟" وہ اس
کا نام سن کے گھبرائی نہیں سکی۔

"آپ سے بات کرنے کے لیے میں بہت دنوں
سے آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن موقع نہیں مل
رہا تھا، اس لیے سوچا کہ آج آپ سے بات کر کے ہی
سوؤں گا۔"

"لیکن آپ سے ساری باتیں گل جو کر رہی ہیں تو
آج کون سی خاص بات سے کرنے کے لیے؟" اس کے
سوال پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر رہ گیا تھا۔

"جو گل باتیں کر رہی ہیں، آج ان باتوں کے لیے
تمہید بنا رہا تھا چاہتا ہوں۔" اس نے دلچسپی سے جواب
دیا تھا۔

"دیکھیں تمہید؟" وہ شرارت سے بولی۔

"وضاحت سے جواب دوں گا تو آپ کو شرم آئے
گی۔" اس کی بات پر ریچ بے ساختہ الم لے والی
مسکراہٹ دوک گئی تھی۔

"آج کل دنیا سے شرم کے جراثیم مر گئے ہیں۔"
"لیکن میں نے سنا ہے، آپ کے اندر یہ جراثیم
زندہ ہیں۔"

"آپ کا سا فطرت بھی تو ہو سکتا ہے۔" وہ ہنسی تھی۔

"آپ کا کا بھی تو فطرت ہو سکتا ہے۔" وہ اپنی بات پر
ذدور سے گر بولا تھا۔

"مجھے مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟"

"جاننے کا موقع تو دس پھر دیکھیے گا۔" اس نے دعو
کیا تھا۔

"کل جان لیجیے گا۔ ابھی وقت نہیں ہے، خدا
حافظ۔"

"پلیز فون بند مت کیجیے گا۔ پلیز فاطمہ! میری بات

شیں۔" اس نے تیزی سے کہتے ہوئے اسے فون بند کرنے سے روکا تھا۔ ریسیور کھتے رکھتے ٹھہر گئی تھی۔

"جی کہے؟"

"پلیز فائل اپلی تھوڑی دیر اور آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" مسوز بخت کی سنجیدہ آواز پہ وہ ٹھٹھک گئی تھی کہ آخر بات کیا ہے؟ رات کے اس پھر شادی سے ایک دن پہلے اسے کیا مصیبت پڑی تھی کہ یوں چوری جیسے فون کر رہا تھا۔ اور وہ بھی آخر ریح احمد تھی۔ اس کا شرارتی ذہن بھی اسے ایسی ہیٹیاں پڑھا رہا تھا کہ وہ بالآخر پوری طرح سے اٹا ہونے لگی۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر آپ میرے سیل نمبر پر کال کر لیں۔"

"ہوں۔ یہ نمبر لینڈ لائن ہے اور ہو سکتا ہے کہ ماموں جان۔ سواری میرا مطلب ہے کہ ابا جان آجائیں۔ وہ فون پہ بات کرنا پسند نہیں کرتے اس لیے بہتر ہے کہ آپ موبائل پر کال کر لیں۔"

"وہ بات کرتے ہوئے کھینچ لی تھی پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔"

"نمبر بتائیں۔" وہ تیار ہو گیا۔ اور اس نے مسوز بخت کو اپنا نمبر لکھوا دیا۔

اس کی شرارت عروج تھی۔

"اوکے۔ میں کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

"میں انتظار کر رہی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے بے ساختہ شرارت سے مسکراتی تھی۔ اور تیزی سے سیر حیاں چڑھتے اور رقیہ کے بیڈ روم میں آگئی۔ "یہ تو کل پہ چلے گا مسوز صاحب کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟" وہ پانچ منٹ بعد اپنے سیل پہ ہونے والی واٹس ایپشن سن کر مسکراتی تھی۔

"ہیلو۔"

"جی جناب! کیا کر رہی ہیں؟"

"دیکھیں مجھے نیند آرہی ہے آپ بھی سو جائیں۔"

"کیسے سو جائیں ہماری نیندیں ہی اڑ گئی ہیں کل

کے انتظار میں۔"

"بس۔ آپ اپنی لمٹ میں رہ کر بات کریں۔ میں اس وقت آپ سے بات کر رہی ہوں میں بھی رست ہے۔" اس نے مسوز بخت کو پڑی بدلتے سے روکا تھا۔

"اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں لیکن کیا آپ میری ایک اور خواہش پوری کر سکتی ہیں؟" اس نے بااثر کہہ دی۔

"خواہش؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں پلیز صرف ایک جھلک۔" ریح اس کی فرمائش اور اس کی خواہش پہ کبھی کشمکش کرتی نہ تھی۔

"آج کی رات خواہش پوری کرنے کی رات نہیں ہے بلکہ آج کی رات خواہش بھلنے کی رات ہے۔" وہ بڑی ادا سے بولی تھی۔

"تو خواہش کو سچائی تو چاہتا ہوں آپ کی ایک نظر کی جھلک۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"خواہش کسی کو دیکھنے سے نہیں بلکہ دیکھنے کے انتظار، طلب اور بے چینی سے جتنی ہے وہ ضرورتاً نہیں آپ نے؟"

ریح سمجھ کو ڈھونڈنے افق کے پار بھی گیا تو مل گیا تو سمجھ سے ملنے کا انتظار بھی کیا وہ بڑی دلکشی سے بولی تھی مسوز اس کے شعر پر چپ ہو گیا تھا۔

"اس لیے بہتر ہے کہ اپنی ساری خواہشیں کل پہ رہنے دیں۔ اور اطمینان سے جا کر سو جائیں۔" اس نے فون آف کر دیا تھا۔

آج فاطمہ کی مایوں کی رسم تھی اور پورے گھر میں مایوں کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ریح ہر کھلم میں فون چیک کرتی تھی۔

"جیو میٹھن سے تا تم لے لیا تم لوگوں نے؟" اس نے فاطمہ سے استفسار کیا۔

"نہیں۔" فاطمہ نے مختصر جواب دیا۔

"کیوں پھر تمہیں تیار کس نے کرنا ہے؟" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"تم نے۔"

"ارے نہیں نہیں۔ میں ہرگز اس کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ مجھے لپ اسٹک اور میٹھن آن لگانے کے سوا کچھ نہیں آتا یہ تمہارے لئے ہے بلکہ کون سیٹے گا جھلا؟" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تم لوگوں کے آس پاس کو کیا رہا رہے؟"

"ہاں ہے۔ یہ رات سا بیٹھ چوکی تھی مگر ہے وہاں راتل ہو گیا رہا رہے۔" مکتی اچھی پوچھ رہی تھی۔

"لو کہ میں اس کے پاس جا کر تمہاری مایوں، مندی اور شادی کے لیے تاہم لے لیتی ہوں۔ شہم تک وہ آجائے گی ناں۔" ریح نے نئے کام پہ کمر بند کر دیا۔

"لیکن وہ ابا جان۔" فاطمہ نے بات اوصوری چھوڑتے ہوئے کہا۔

"رہے وہ کچھ نہیں کہیں گے بلکہ انہیں پتہ ہی نہیں ہے گا میں سارا کچھ خود ہی سنبھال لوں گی۔"

اس نے فاطمہ کو تسلی دی اور باہر نکلتے گئی۔ "رکوہ۔" فاطمہ نے تیزی سے اسے پکارا۔

"یہ چادر اوڑھ کے جاؤ جب تک تم یہاں ہو یہ کام تو کرتا ہی رہو گے۔"

"فاطمہ پلیز! ریح جھٹکا لگائی۔"

"ریح پلیز! فاطمہ نے بھی الجھت سے کہا۔

اور فاطمہ کی خاطر مجبوراً اسے اتنی بڑی چادر اوڑھنا پڑی۔ صوفی صاحب کی سختی سے بایکدھی کہ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلے چادر اوڑھ کر نکلے اسی لیے فاطمہ پابندی سے اس پر عمل کر رہی تھی اور اس کی چادر کا خاص خیال رکھتی تھی۔ وہ تیزی سے سیر حیاں اترتی نیچے آگئی۔ خدیجہ بیگم نے اسے باہر جاتے دیکھا تو رید تھکتے ہوئے بولیں۔

"اور بیچل جیورز کے ہاں سے فاطمہ کا ڈائمنڈ کا میٹ آج اٹھانا ہے۔ تم لیتی آنا۔" مین بازار میں شاپ سب سے اس نے رسید دیکھا تھا۔ اسے پرس میں رکھ لی تھی۔

"اب کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟" فیوز بخت نے حسان اور مسوز کو گاڑی کی طرف دھتے دیکھ کر پوچھا۔

"بس تھوڑی سی شاپنگ رہ گئی تھی۔" مسوز نے لاپرواہی سے کہا۔

"ہوں! تو جناب کیا شاپنگ کرنی ہے آپ نے؟"

گاڑی میں بیٹھ کر حسان نے پوچھا۔

"تمہاری ہونے والی بھانجی کے لیے گفت لینا ہے یعنی رونمائی کا تحفہ۔"

"وہ اچھا تو یہ بات ہے میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی کون سی شاپنگ رہ گئی ہے جس کے لیے تمہیں اتنی جلدی رہی ہوئی ہے؟" حسان نہنسا۔

"جی تو خاص شاپنگ ہے یار! "جولیا" وہ بھی شرارت سے مسکرایا تھا۔

"تم جاکر گفت لیند کو میں تب تک ٹیلر سے لے کر کپڑوں کا یہ کر لوں اسے کرنا تھا کہ کڑھائی کے لیے ابھی تک اس نے تیار نہیں کیا۔"

حسان گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور خود سری طرف ہٹ گیا تھا۔

مسوز شاپنگ سینٹر کی طرف گیا اس کا رخ اور بیچل جیورز شاپ کی طرف تھا۔ وہ فاطمہ کے لیے کوئی لاکٹ یا انگوٹھی لینا چاہتا تھا۔

"کیا آپ کے پاس ہر قسم کا اسٹون ہے؟" اس نے شاپ کپر سے پوچھا۔

"جی سہا آپ کو کون سا اسٹون چاہئے؟" شاپ کپر نے شوکیس میں جی انگوٹھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کون سا ایسا چاہئے؟ فاطمہ کا پسندیدہ اسٹون کون سا ہے یہ تو مجھے پتا ہی نہیں ہے۔"

"ایک منٹ۔ میں ابھی آپ کو کتا تاہوں کہ مجھے کیا چاہئے۔" وہ جیب سے موبائل نکالتے ہوئے بولا اور فاطمہ کا کل والا نمبر ڈائل کر لیا۔ جیسے ہی اس نے نمبر ڈائل کیا شاپ کے اندر دھم سڑوں میں رنگ بجنے

گئی تھی۔ لیکن اس نے دھیان نہیں دیا تھا کہ ذرا فاصلے پہ کھڑی لڑکی کے ہاتھ میں موبائل بچ رہا ہے۔ کل ڈس کینکٹ ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر لڑائی کیا۔ اور ایک بار پھر رنگ بچنے لگی بالآخر اس نے شک اگر کل ریسیو کر لی۔

”جی موز صاحب! ایسے کیا بے چینی گئی ہوئی ہے آپ کو؟“ اس کی ہنسی سے بولی۔

دیکھے فاطمہ! میں آپ کے لیے ایک رنگ پسند کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ رنگ میں کون سا اسٹون اچھا لگے گا؟ ڈائمنڈ، یلیم، پیکراج، اومو یا کوئی اور؟

”نیلیم“ وہ مختصر بولی۔

”نیلیم کیوں؟ ڈائمنڈ کیوں نہیں؟“ موز کا

ڈائمنڈ لینے کا ارادہ تھا۔

”ڈائمنڈ میں خود لے رہی ہوں۔“ اس نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ تو پھر نیلیم؟“

”جی نیلیم۔“ وہ ذرا اندر دے کر بولی تھی اور موز

نے چونک کر اس لڑکی کی سمت دیکھا تھا جس کے منہ

سے اس نے نیلم سنا تھا۔

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“ موز نے جان بوجھ

کر بات پر حالی۔

”شاپنگ سینٹر میں۔“ وہ ہنسی اور خدا حافظ کہہ کر

فون بند کر دیا تھا لیکن موز حیران پریشان اس لڑکی کو دیکھ

رہا تھا جو اسٹائلش سے سوٹ پہ پڑی سی چادر اوڑھے

اپنے آپ کو حلیے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس

سے چادر پستھیل نہیں رہی تھی، بھی کوئی پلو سرک رہا

تھا تو کبھی کوئی کوٹا جھٹک رہا تھا چہرہ اچھپانے کی کوشش

بھی نہ کام ہوئی چارہ تھی۔

موز نے اپنا شک دور کرنے کے لیے ایک بار پھر

نمبر لایا اور اسی کا موبائل بجا تھا وہ اس انکشاف پہ ہکا کا

کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اس سے پہلے

کچھ کہتا کہ لڑکی کی چادر کا کونہ دروازے میں اٹکا چادر

ایک بار پھر جھٹک گئی تھی۔ اس نے تیزی سے

موبائل نکالا اور اس کی تصویر نکالی۔

”کیا چیز پسند کر کے گئی ہیں؟ اس نے سٹوڈنٹ سے

پوچھا۔

”جی ڈائمنڈ لاکٹ تھا۔“

”ہولہ۔“ وہ چیپ ہو کے رہ گیا۔ فاطمہ خود ڈائمنڈ

لے رہی تھی۔ اسی لیے مجھے منع کر دیا اس کا ذہن الجھ

گیا تھا وہ بار بار اس کے نمبر پہ کل ماسٹرنے پہ مجبور ہو رہا

تھا ایک بار پھر فون کر ڈالا۔

”جی کیسے؟“ اس کے سوال پہ رنج شاید مسکرائی

تھی۔

”آپ فاطمہ ہی ہیں نا؟“

”آپ کو کوئی شک ہے؟ وہ اپنے لہجے کی شرارت دہا

رہی تھی۔

”جی نہیں مگر۔“ وہ کنفیوز ہو رہا تھا۔

”اگر آپ کو کوئی شک ہے تو بے فکر ہو جائیے۔

کل آپ کے سارے شک دور ہو جائیں گے میں جیسے

تیسے کسی ایک رات گزارا میں کل سارے پچھلے کل

جائیں گے۔“ اس نے موز بخت کو سلی دی اور فون بند

بند کر دیا تھا۔ موز ہر بار اچھا چارہ تھا اور اسی لمحے میں

رات گزری تھی لیکن ایک بات سچ تھی کہ وہ اسے

بست پسند آتی تھی اس کے چہرے کی جھٹک اسے اب

بھی اپنی آنکھوں کے سامنے لہرائی ہوئی محسوس ہو رہی

تھی۔

اس نے دل ہی دل میں عارفہ بیگم کی پسند کی داد دی

تھی۔ ”کیا قیامت تلاش کی ہے دل خوش کر دیا

ہے۔“ وہ اپنی ماں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صوفی الیاس صاحب نے شادی کے فنکشن کا

سارا انتظام اپنے گھر میں ہی رکھا تھا۔ فیوز بخت نے

میں جہاں کے لیے بات کی تھی لیکن انہوں نے منع

کر دیا تھا حالانکہ وہ میرج ہال کی بلنگ یا آسانی افروز

کر سکتے تھے مگر انہیں لڑکیوں کا کھلے عام میں ہال میں

جانا تو گونگ کا دیکھنا، تصویریں اور موی بنوانا پسند نہیں

تھا۔ اس لیے ساری اینٹ مشن گھر پہ ہی کروائی تھی۔

ساتھ دینی کو بھی ایک دن کے لیے کرائے پر سہلی بھی

جہاں موبوں کے بیٹنے کا انتظام کیا گیا تھا اور اسے گھر

میں عورتوں کے لیے ارجنٹ منٹ کروائی تھی لان کے گھر

میں بس دولہا کی فیملی کو کونے کی اجازت تھی، فیملی

سارے موصمان ساتھ دانی کو بھی میں برآمدہ تھے۔

ان کے بتائے ہوئے مقررہ وقت پہ یارات پہنچ گئی تھی

اور ہر طرف سیارات آگنی کا شور مچ گیا تھا لڑکیاں پھولوں

کی پٹیلیں لیے گیٹ کی روش پہ دونوں سائیلوں میں

کھڑی تھیں سب ہی لڑکیاں جھجکی جھجکی شرمیلی

شریانی سی تھیں لیکن ان سب میں صرف ایک وہی

تھی جو بڑے اعتماد کے ساتھ چہرے پہ مسکان اور

آنکھوں میں شرارت لیے کھڑی تھی۔

موز بخت نے سہلا قدم اندر رکھا تو پھول پھول

کرنے میں بھی پہل اسی لڑکی نے کی تھی موز بخت

کے قدم زمین نے جھلنے لگے تھے، آخر کار کیا تھا؟ وہ

شرارت بھری آنکھوں سے حیران پریشان سے موز

بخت کو دیکھ رہی تھی اور سب لڑکیوں کے ساتھ مل کر

پھولوں کی جٹیاں لہا رہی تھیں اور وہی تھی۔

”فاطمہ!“ وہ زور سے بولا تھا۔

”رنج! رنج!“ سیکرٹ بیگم نے اس کی سمت آتے

ہوئے پکارا۔

”جی ماں؟“

”اندروں جانو۔ فاطمہ تمہیں بلارہی ہے۔“ انہوں نے

اسے پیغام دیا۔

”اوکے جاتی ہوں۔“ وہ خالی پلیٹ کسی لڑکی کو

تھا لی اندر کی سمت بڑھتی تھی اور موز بخت کے دل کو

جھٹکوں کی آدھیں چھوڑتی تھی۔

پوری رات چاہتوں کے زور سے سجا لی جانے والی

خوابشیں کسی کے جھوٹ اور قریب کے صدمے سے

بہ بخود رہی تھیں یعنی یہ لڑکی کوئی اور تھی اور فاطمہ

کوئی اور؟ رات اس لڑکی نے اسے بے وقوف بنایا تھا؟

اور اسے بے قیامی سوئپ کر خود لا تعلیق ہو گئی تھی۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ موز بخت نے پوری رات اس کی

تصویر کو دل میں بساتے اور صبح کا انتظار کرتے ہوئے

آنکھوں میں رات چادری تھی۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ

وہ اسے رات بخش ڈالتا؟

اب قیصلے سے بٹنا اسے کب قبول تھا؟

”حسن! اپنی بھابی دیکھی تھیں؟“ اس نے اس بچ

پہ آکر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب کون سی بھابی؟“ حسن کو حیرت

ہو رہی تھی۔

”وہی بیک شرارے والی۔“ موز نے کچھ دور

کھڑی کسی سے باتیں کرتی رنج کی سمت دیکھا۔

”لیکن یہ تو کوئی اور ہے۔“

”اے تمہیں یاد آ رہی تمہاری بھابی ہے۔“ موز

بخت کے ہونٹوں پہ عجیب استہزائی سی مسکراہٹ

پھیل گئی۔

”فاطمہ بھابی؟“

”جانب فاطمہ سے چائے کوئی اور میں لینی تمہاری

بھابی ہے۔“ اس کا اچھ مضبوط تھا اور حسن پاگل ہو

اٹھا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ چکر کیا

ہے؟

”ماں، موز نے عارفہ بیگم کو قریب بلایا۔

”جی بٹا؟“

”وہ ٹیک کپڑوں والی لڑکی کون ہے؟“ اس نے اشارہ

کیا۔

”وہ فاطمہ کی کزن ہے۔ اس کی پھوپھی کی بیٹی رنج

احمد گاہور سے آئی ہے۔“ انہوں نے تعارف کر دیا۔

”آپ مجھے میرے پاس“ اس نے ماں کو اپنے

قریب بٹھالیا تھا اور پھر انتہائی سکون سے ان کی ساتھیوں

پہ ہم چھوڑ دیا تھا وہ کل کے رو گئی تھیں!

☆ ☆ ☆

”ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔“ کن تو لگتا ہے حسین! چاند

زمین پہ اتر گیا ہے۔“ یہ تو فاطمہ کو تیار کر کے پیچھے

پہنچی تو چلی نظر رنج کی ہی پڑی تھی وہ کی بار بار لان میں

گئی تھی اور کی بار بار اندر فاطمہ کے پاس آتی تھی۔ ساتھ

ساتھ یونیشن کو بدلیات بھی دیتی رہی فاطمہ کا لنگا کیے کی طرف سے تھا اور وہ کمرہ کا سرال کی طرف سے۔
 دو لہائی کرنن نامہ بتا رہی تھی کہ وہ لہانے ولیمہ کا لنگا خود اپنی پسند سے سلور کلر میں ڈرائن کروایا تھا۔
 ”دو لہا بھی کسی چاند سے کم نہیں تھے ان کی مشترکہ کرنن شہرین نے تعریف کی ”جوڑی کمال کی ہے یارا“

سہی تعریف کر رہی تھیں۔
 ”فاطمہ۔ فاطمہ! غضب ہو گیا۔“ وقید جو اس سی بھاگتی ہوئی اندر آئی تھی۔ رنج سمیت سب نے چونک کر دیکھا۔

”غیر تو ہے؟“ تیرے چہرے۔ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔“ رنج نے اس کا ہاند پکڑ کے پوچھا تھا۔
 ”وہ۔ وہ دو لہانے شادی۔ شادی سے انکار کر دیا ہے“ وہ۔ وہ کہتا ہے میں فاطمہ سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ۔ وہ رنج۔ رنج سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ رقبہ نے ان کے قریب۔ ہم چھوڑتے ہوئے وہاں موجود فاطمہ اور رنج کے پرچے اڑا دیے تھے۔
 ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ رنج پکڑا آئی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں“ باہر سارے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ایسا جان تو وہ لہا کو مار دینے کے ورے ہیں“ رقبہ کے حواس اڑے ہوئے تھے فاطمہ ساکت و صامت ہو گئی تھی اور رنج تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تھی۔

”اگر اس نے ایسی حرکت کی ہے تو ہم اسے ضرور سزا دیں گے“ اور اگر تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو تو ہم تمہارا سر قلم کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے“ صوفی الیاس صاحب کی آواز وہاں موجود لوگوں کو گھبراہٹ کے رکھتی تھی۔ رنج کو اپنی باتوں سے جان بچتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”پائے یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟“ وہ دل ہی دل میں ہول رہی تھی۔

”سکینہ! اپنا اپنی جی کو۔“ انہوں نے برف سے زیادہ سرد نظروں سے بہن کو دیکھا۔ سکینہ بیگم اور احمد

صاحب خود پتھر لے ہوئے کھڑے تھے۔
 ”سکینہ“ وہ یکدم بہن۔ دھاڑا اٹھے۔
 ”سج جی بانی ہوں۔“ سکینہ بیگم باہر لپکیں لیکن رنج ڈراٹنگ روم کے باہری چونکھتے سے کئی لمبائی تھی۔

”رنج! میرے ساتھ آؤ۔“
 ”ہاں!“ رنج روپائی ہوئی لیکن سکینہ بیگم اس کی بھرائی ہوئی نظروں سے گھر کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی تھیں۔
 ”گوھر آؤ لڑکی!“ صوفی صاحب نے اسے سامنے آئے کو کہا۔

”جی؟“ وہ لرزتے جسم کے ساتھ بمشکل سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔
 ”تم نے اس لڑکے کو کہا کہ تم فاطمہ ہو؟“ انہوں نے بلند آواز سے پوچھا رنج نے بے بسی سے نظروں اٹھا کر مہوڑ بخت کو دیکھا۔
 ”ہو تو تم نے کہا؟“ وہ غرائے تھے۔
 ”جی میں نے کہا تھا۔“

”تم نے اس کے ساتھ باتیں کیں؟“
 ”جی کی تھیں۔“ لیکن یہ سب ایک شرارت۔

”پشخ!“ صوفی الیاس صاحب کا بھاری ہاتھ پوری قوت اور پوری نفرت سے اس کے گلے پر اٹھا۔
 ”یہ شرمناک شرارت ہے تمہاری نظر میں؟“ وہ اتنی بلند آواز سے دھاڑے تھے کہ پورے گھر کے دروازے اور بل کے درگئے تھے گمان کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ رنج بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی رہ سکی تھی۔

”ہمیں جان اس میں میری کوئی بدعتی شامل نہیں تھی میں نے واقعی محض ایک شرارت میں ان سے یہ سب کہا تھا۔ مذاق کیا تھا۔“ اس نے اپنا دفاع کیا۔
 ”یہ مذاق ہے؟“ کس غیر اور نامحرم مہوڑ سے باتیں کرنا؟ اسے اپنے آپ کو اس کی ہونے والی پوری ظاہر کرنا مذاق ہے تمہارے لیے؟“ وہ نفرت سے کہہ رہے تھے۔

”مجھ سے غلطی ہوئی ماموں! مجھے صاف

کہیں۔“ رنج نے عداوت سے سر جھکا لیا۔
 ”صوفی! کسی؟ تمہاری سزا میں ہے کہ تمہارا نکاح دھاڑ کر تمہیں یہاں سے صاف کر دیا جائے۔“ انہوں نے ایک انتہائی فیصلہ کر ڈالا تھا۔

”نہیں۔ نہیں یہ سب نہیں ہو سکتا۔“ رنج کے قدموں سے نشن سرک جاتی تھی۔ ”احمد مرتضیٰ مولوی صاحب کو بلانا ہے“ پھر ہمارے فیصلے سے کوئی اختلاف ہے؟“ انہوں نے سر جھکائے شرمندہ کھڑے احمد صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

”نہیں بلانا مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں۔ مہوڑ بخت فاطمہ کا نصیب ہے۔ وہ وہ دامن بنی بیٹھی انتظار کر رہی ہے وہ میر جائے گی۔“ رنج پک کے اپنے باپ کے سامنے آئی تھی۔

”وہ میری بیٹی ہے صابر شاکر شرمہو حیوالی“ اور اب تو میں بھی نہیں چاہوں گا کہ میری بیٹی کی شادی اس لڑکے کے ساتھ ہو۔“ صوفی الیاس کے کبے میں نفرت دھارت تھی۔
 ”مام پکیز۔“ کچھ تو بولیں۔ بیٹا پکیز لڑائی تو انداز اسٹینڈ۔“

وہ اپنے ماں باپ کے سامنے التجا کس کر رہی تھی لیکن وہ تو جیسے شرم کے مارے زمین میں گڑھکے تھے۔ انہوں نے صوفی الیاس کے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا اور رنج کے دھاڑیں مار مار کر رونے کے باوجود اس کا نکاح سید مہوڑ بخت کے ساتھ کر دیا گیا تھا اور چند ہی گھنٹوں میں اسے دامن بنا کر رخصت کر دیا گیا تھا لیکن رنج کی آنکھوں کے سامنے باہر دامن بنی فاطمہ کا چہرہ ابھوم رہا تھا۔

چچا ہوا چچا“ اور پتھر لائی ہوئی آنکھیں۔ باہر اس کی آنکھوں کے سامنے آکر شکایت رقم کر رہی تھیں۔ رنج کا دل اور ضمیر کسی بھاری بوجھ سے آگئے تھے“ پولنگ رہا تھا جیسے کسی تیزے کی الٹی اس کے کپڑے میں لڑکتی ہوئے اپنے ماں باپ کی اگلوٹی جی تھی لیکن قسمت نجانے کیسی پائی تھی کہ رخصتی کے وقت ماں باپ سے اس کے سر پہ ہاتھ بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ روئی

پکیتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی تھی۔
 وہاں موجود کئی لوگوں کو افسوس ہوا تھا۔ کئی لوگوں کو پٹھارے دار موضوع ملتا تھا اور کئی اس کی سزا پہ خوش ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو فاطمہ کی دل جوئی کرنے میں لگے تھے رنج کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس پہ کیا جاتی تھی؟ اس کی کسی کو پورا ہی نہ تھی۔ کیونکہ وہ قصور وار تھی۔ اسے سزا دے کر بھیج دیا گیا تھا اسے سب رشتوں سے دور رہنے کی سزا ملی تھی، قطع تعلیق کی سزا۔ وہ گاڑی سے بھی پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ مگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا!

اس نے گھر پہنچ کر گاڑی کو بریک لگائے اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اس کی سائیل میں آ گیا تھا اور دروازہ کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اترنے میں مدد دی تھی۔ لیکن وہ اس کا ہاتھ چھو ڈر آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا سر بند رہی طرف تھا۔

”ارے آگے آگے تو کم؟“ عارفہ بیگم نے آگے پیچھے ان کو لہر داخل ہوتے دیکھ کر خوشگوار کا اظہار کیا تھا۔ لیکن رنج بغیر کسی رکے اور چلی گئی تھی۔
 ”السلام علیکم۔“ مہوڑ نے ماں کو سلام کیا۔
 ”و علیکم السلام۔“ رنج کو کیا ہوا؟

”شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے ذرا لا پرواہی سے کہا۔
 ”کیوں کیا بات ہے۔ طبیعت کو کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہوئیں۔

”پریشانی والی نہیں خوشی والی بات ہے۔“ اسے آخر بتائی پڑا تھا۔
 ”جی؟“ تم جج کہہ رہے ہو؟“ عارفہ بیگم چمک اٹھی تھیں۔

”آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں اور کنفرم کر دیا لیں۔“
 اس نے کندھے اچکائے۔
 ”رنج! اس کیوں ہے؟“

"شاید اپنے گھر والوں کی کمی محسوس کر رہی ہے اس موقع پر؟" موز کو اس کی فلیٹنگز کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔
 "تو کوشش کروں میں اس کے اسی ایوان جائیں۔"
 انہوں نے بچے کو مشورہ دیا۔
 "ہوں! یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا لگتا مجھے ان سے ملنا پڑتا ہوگی۔"
 "ابن شاہ اللہ مان جائیں گے تم کو شش ضرور کرنا۔" وہ صوفے سے کھڑی ہو گئیں۔
 "کمال جاری ہیں؟"
 "تمہارے ڈیڈ کو خوش خبری سنائے۔" وہ مسکراتے پولیس اور موز کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"وہ تو تم کہہ رہی ہو۔" وہ بھی بڑبڑاتا رہا جس بھی یوں لگتا ہے شادی کو تیس سال ہو گئے ہیں۔ تین مہینوں والی تو کوئی بات ہی نظر نہیں آتی! امریکا میں تو سوچا تھا کہ اپنے سارے ارمان اپنے سارے جذبات اپنی ساری خواہشیں مشرقی بیوی پر پورے کرلوں گا موز ہوتے ہوئے بھی خود کو ایک عورت کی طرح سنبھال کے رکھا، کبھی جذبات کا پتہ نہ چھلکے نہیں دیا اور مشرقی بیوی ہے کہ ہاتھ ہی نہیں لگنے دیتی سارا جو رشتہ بچہ پہ حلال ہے اسے حرام تو مت کرو۔"
 اس نے رنج کو آہستہ سے اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔
 "کیا چاہتے ہو؟" رنج نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
 "وہ سب کچھ جو ہر شوہر چاہتا ہے۔"
 "ہر شوہر زبردستی کا شوہر تو نہیں ہوتا۔"
 "ہر بیوی تمہاری طرح ضدی اور غصیلی بھی تو نہیں ہوتی؟" لگتا ہے کہ وہاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو شوہر کے بڑے بڑے عیبوں کو بھی نہ دیکھ سکتی ہیں۔ "موز نے اسے اس کے رونے کا احساس دلایا۔
 "تم نے میرے عیب کو دھانپا؟" رنج کا چھوٹا سا سوال اسے الجھایا۔
 "معاف تو کر سکتی ہو میں؟"
 "مجھے کس نے معاف کیا ہے؟ تم نے؟ یا مام ڈیڈ نے؟ یا ماموں نے یا فاطمہ نے؟ اس روز تم بھی تو میری غلطی کو غلطی سمجھ کر معاف کر سکتے تھے؟ تو پھر آج۔۔۔ آج معافی کا لفظ زبان پر لانے والے تم کون ہوتے ہو۔" رنج کی آواز بھرائی تھی۔
 "یعنی تم معاف نہیں کر سکتی؟"
 "یقیناً۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔
 "اپنے فیصلے میں ذرا سی تنجائش رکھنی چاہیے۔"
 "مید موز بخت اب بات میں نے تم سے ہی سیکھی ہے کہ اپنے فیصلے میں تنجائش نہیں رکھنی چاہیے۔"
 اس کا انداز استغناء تھا۔ "دوسری فاطمہ اسی انتظار میں رہ گئی کہ تم اپنے فیصلے میں شاید کوئی تنجائش رکھ لو گے لیکن نہیں۔ وہ نامور اور مایوس بیٹی بھی رہی اور

"میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گی" تم اپنی مام کو منع کر دو۔"
 اس کے لیے میں ہنسنے لگی تھی۔
 "مجھے تمہاری نہیں اپنے بچے کی فکر ہے۔" موز نے اسے جتانے والے انداز میں گھمایا اور رنج کے توں کو سے لگی اور سر پہ ہنسی بھی اسے لگا موز بخت نے اس کے جسم پہ چابک دے مارا ہو۔
 "مجھے تمہاری فکر کی ضرورت بھی نہیں ہے محنت سمجھتی ہوں میں ایسی فکر۔" وہ حارث سے بولی۔
 "تو مجھے اپنے بچے کی تو فکر کرنے دو ناں؟" وہ ٹالی کی ٹانگ لگاتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
 "بڑی تکلیف ہو رہی ہے اپنے بچے کے لیے؟"
 اس نے مسخرانہ نظروں سے دیکھا۔
 "بیوی کے لیے بھی ہو رہی ہے یا رائف کیا حال بنایا ہے اپنا۔" وہ محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے بل چہرے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا تھا۔
 "تمہارا حال بھی اپنے جیسا ہی ہواؤں گی" بے حال کر بولی گی جنہیں۔ "وہ موز بخت کا ہاتھ جھٹک کر بولی تھی۔ اور وہ اس کی بات پہ مسکرایا تھا۔

تم۔۔۔ وہ کہتے کہ لب پہنچ گئی تھی۔
 "موز اور رنج تیار ہے؟" باہر سے عارفہ بیگم کی آواز سنائی دی۔
 "نہیں۔" موز نے بید سے اٹھتے ہوئے گہری سانس کھینچی تھی۔
 "آپ کون کر کے ڈاکٹر کو منع کر دیں کہ ہم لوگ نہیں آ رہے۔"
 موز دو نوک لہجے میں کہتا برف کیس اور اپنا کوٹ اٹھا کے باہر نکل آیا تھا۔
 "کمال جا رہے ہو؟"
 "لاہور۔"
 "واپسی کب تک ہوگی؟"
 "شاید کل۔"

وہ مختصر سے جواب دیتا ان کے ساتھ میڈیٹیشن کرتا آیا تھا۔ فیوز بخت سے مل کر وہ جانے کے لیے بیٹھ گیا۔
 "کیوں نہیں آ رہے؟" عارفہ بیگم نے استفسار کیا۔
 "اس کے حال یہ۔" موز نے وہاں سے نرمی سے کہنا گاڑی لے کر نکل گیا تھا لیکن اس کے ذہن سے رنج کی باتیں نہیں نکل رہی تھیں۔ وہ بار بار ان ہی کو سوچ رہا تھا۔ غلط اگر وہ بھی تو غلط خود موز بخت بھی تھا دونوں سے ایسے کام ہوئے تھے جن کو معاف کر دینا آسان بھی نہیں تھا۔

شام اپنے چہرے پر تھی گواہی ہر سو ہکورے لیتی پھر رہی تھی۔ حالانکہ اس سارے ماحول میں صرف وہ ایکی وائس تھی اور اس کی اداسی سارے ماحول کو اداس بنا رہی تھی شام کی افسردہ گہری افسردگی میں بدل چکی تھی۔
 "ججے کا نام ہو رہا تھا نہ ہی وہ گھر آیا تھا نہ فیوز بخت گھر آئے تھے ان دونوں کی گاڑیاں غائب تھیں۔"
 "جائے لوگ بیٹا؟" عارفہ بیگم کی آواز پر اس نے نکل کر دیکھا۔
 "میں یہیں بیٹھنے میں سہلایا۔"

"بیگم صاحبہ! آپ سے مسز قیش ملنے آئی ہیں۔"
 "چوکیدار نے اندر آ کر اطلاع دی۔"
 "انہیں یہیں بھیج دو۔"
 "یہ لو ڈیر کیا ہو رہا ہے؟" وہ اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی ان کے قریب پہنچی آئی تھیں۔
 "میں دیکھ لو کیا ہو رہا ہے؟" عارفہ بیگم نے انہیں سائیڈ والی کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔
 "دونوں سانس بہو کے شوہر حضرات نظر نہیں آ رہے؟"
 "ہاں فیوز صاحب اپنے کسی دوست کی عیادت کے لیے اسپتال گئے ہیں اور موز لاہور گیا ہوا ہے اپنے کام کے سلسلے میں۔"

عارفہ بیگم کے جتانے پر رنج نے بری طرح چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا وہ لاہور گیا ہوا تھا اور اسے بتایا بھی نہیں تھا؟ یعنی اس نے اسے بتا کر جانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ آج وہ رنج کے شکر گیا ہوا تھا اور اسے خبر ہی نہیں تھی۔ اسے بے حد افسوس ہوا تھا۔

نہ جانے کیلیات تھی کہ ساری رات اسے خالی بستر سے ابھن ہوئی رہی تھی اس کا دھیان بار بار موز بخت کی سمت جا رہا تھا اور وہ کوئی بدل بدل کر رہی سوچے جا رہی تھی۔
 "کیا میں اس کی عادی ہو گئی ہوں؟ کیا میں اس کو ایکسپلور کر چکی ہوں؟ کیا میں اس کی کمی محسوس کر رہی ہوں؟ کیا وہ نہیں ہے تو میں اس کے نہ ہونے پہ بے چین ہوں؟" شکر ہوں؟ وہ بھلا خراشہ بیٹھی تھی۔
 "کیا میں فاطمہ کو بھول رہی ہوں؟" اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ کیونکہ موز بخت کو یاد کرنے کا مطلب تھا کہ فاطمہ کو بھول جانا۔ اس کا چہرہ بیٹے کے قسطوں سے بھیگتا جا رہا تھا۔ ساری رات اس کی اسی جوڑ توڑ میں گزر گئی۔ کس کو ڈوٹی کس کو ڈوٹی فیصلہ مشکل تھا لیکن جب صابن کتب کے کھاتے کھولے

تو قصور اپنا ہی نظر آیا تھا، فاطمہ بھی بے قصور تھی اور موز بخت بھی، بس تیرا گھر تھی تو ریح احمد جس کو سارے رشتوں نے چھوڑ دیا تھا۔

وہ ساری رات یوں ہی بے چینی اور بے کلی کا شکار رہی تھی اور ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں پاتی تھی۔ صبح بھی وہ جاگی سوتی کیفیت میں ہی تھی جب اس کا سہل نکلتا تھا۔

”ہیلو! موز کی سنجیدہ سی توازنائی دی تھی۔ وہ غلاموش رہی تھی۔“

”یہی ہو؟“ وہ خاموشی محسوس کر کے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”رات کیسی گزری۔ میری یاد نے بے چین کیا تھا۔ میری کمی محسوس کی؟“

”رات اچھی گزری ہے، سکون اور اطمینان سے تمہاری یاد تو کیا خیال بھی نہیں کیا۔“ اس نے اہمو سے کہا۔

”تم تو جھوٹ بھی کچھ اس طرح سے پستی ہو کر بندھ چکے۔ مجھے یہ مجبور ہوا جاتا ہے، لیکن اس بار میں ج کھنے والا نہیں ہوں، اس بار جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ہی سمجھوں گا۔“ موز بخت کے اتنے یقین پہ ریح اور فاطمہ کیہ کر رہی تھی۔

”میں آج کھر آیا ہوں، میری رات بھی اچھی نہیں گزری۔“ اس نے کمر کر رہے سو روکھ دیا تھا اور ریح چپ چاپ سہل فون کو دیکھنے لگی۔ وہ ایسا سکون اور اطمینان کھل سے لاتی، جس کا اس کے سامنے ذکر کیا تھا۔

”مسد موز بخت! میں تمہیں دل سے یاد تو کر سکتی ہوں، لیکن دل سے معاف نہیں کر سکتی۔“ اس نے خود کھائی کے لیے انداز میں کہنے ہوئے گہری سانس کھینچی تھی اور کچھ سے سرد کہ کر چاکلیں مونڈتی تھیں، علائکہ باہر سوہن کی گھنٹیں پردوں سے اور کھڑکیوں سے گھرا رہی تھیں۔

اس کی فائل نکالتے ہوئے بولا۔

”جانتی ہوں۔“ وہ ڈائریکٹ ٹھیک کے سامنے اسٹول پر بیٹھی بائیں میں منگھسی کر رہی تھی۔

”تو پھر چلیں، غم ہو رہا ہے؟“

وہ اس کے قریب آگے ٹھہر گیا تھا، ریح نے اٹھ کر اپنے ارد گرد چارو پھیلایا تھی اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی موز نے تمام بیڑھیاں اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترنے میں مدد دی تھی۔

وہ اسے ساتھ لے کر گاڑی تک آگیا تھا، ریح کا جسم اب خاصا صحت مند لگنے لگا تھا، وہ دوا دہا رہے تھے اس کی ڈیوڑھی کو اور موز اس کی ہر بات کا دھیان رکھتا تھا، اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کھانے پینے اور سونے جانے تک اسے خیال رہتا تھا، ہر مہینے بعد چیک اپ بھی ریگور ہو رہا تھا، دوا اس بھی ناگہم رہتا تھا۔ اس نے ریح کا خیال رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اس وقت بھی وہ چیک اپ کے بعد اسے اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے آیا تھا۔

”ریح؟“ اچانک ان کے قریب سے نسوانی آواز ابھری تھی، گن دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

”فاریہ؟“ ریح اپنی دوست فاریہ کو دیکھ کر خوشی سے بے یقین ہو رہی تھی۔

”ریح! یہ تم ہی ہو نا؟“ فاریہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی تھی اور ریح نے بھی اسے سمجھ گیا تھا۔

”کہاں غائب ہو گئی تھیں تم؟“ فاریہ نے شکوہ کیا تھا۔ ”مجھے تو بس اتنا پتا تھا کہ تم چند دن کے لیے اسلام آباد گئی ہو، اب تو کرن فاطمہ کی شاہی میں اس کے بعد کیا ہوا، کچھ بتائی نہیں میں سکا، باقی سب فریڈز بھی حیران تھیں کہ ریح اتنی بے وفا نکلی ہے۔“

فاریہ بھی اسی کی دوست تھی، ننان اسٹاپ ہونے کی عادت اس میں بھی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔

”دیکھ کر چپ ہو گئی تھی۔“

”اسلام علیکم۔“ موز نے سلام کرنے میں پہلی کی تھی۔

”وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں آپ؟“ فاریہ کو مروت نبھائی پڑی۔

”اللہ کا شکر ہے۔“

”چلیں؟“ اس نے موز کو دیکھا۔

”لوگے فاریہ جی! اجازت دیجئے، آپ سے پھر کبھی ملاقات ہوگی، آپ سے مل کر اچھا لگا۔“ موز نے کہا۔

”اپنا نمبر ایڈریس تو دیتی جاؤ، کیا دوبارہ سے غائب ہونے کا ارادہ ہے؟“ فاریہ نے ریح کو ٹوکا اور وہ اسے نمبر دکھا کر آگے بڑھ گئی تھی، اس کے موز پہ پھر قنوطیت اتر آئی تھی۔

”کھانا کھاؤ گی؟“

”نہیں گھر چلو۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”تم نے سچ سے کچھ نہیں کھایا؟“

”کچھ جاکے کھاؤ گی، میں اب تھک گئی ہوں۔ گھر جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ گاڑی کی سیٹ سے پشت نکلتے ہوئے بولی تھی۔

”لوگے!“ اس نے گاڑی گھر کی سمت موڑ دی تھی۔

”میں نے ان کے احمق کو نہیں پہچانی تھی وہ معاف کیسے کرتے؟“ وہ طنز پر بولی۔

”تم نے کون سا جان بوجھ کے ایسا کیا تھا، یہ سب تو ہمیں مذاق اور شرارت میں ہو گیا۔“

”وہ جگہ ہمیں مذاق کی نہیں تھی وہ وقت شرارت کا وقت نہیں تھا، مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی زندگی کی سب سے بڑی غلطی، جس کا میں کبھی مر کے بھی ازالہ نہیں کر سکتی، اور جس کا بوجھ کبھی میرے خمیر سے نہیں ہٹ سکتا، بے شک میں نے موز بخت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے رہنا سیکھ لیا ہے، لیکن اپنے دل کی خلش کو میں اب بھی مٹا نہیں پاتی، دل میں اب بھی فاطمہ کے نام کا تیرا پتہ بہت ہے، تیرے لنگے بھی تو دل میں سوراخ رہ جائے گا۔“

وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی اور اس کے آنسو بے آواز بہہ رہے تھے۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کہاں گئی وہ ریح جو بڑی سے بڑی بات کو بھی ہمیں مذاق اور چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی؟“

”وہ ریح فاطمہ کی مسند کی رات ہی مر گئی۔“

”اب بولتے ہوئے کچھ تو سوچ لو۔“

”اگر ایسی ہی ہوتی تو اس نیت کو نہ آتی۔ اس روز ہی بولنے سے پہلے سوچ لیتی، میری ذرا سی غلطی کسی کے اجڑنے اور اپنے عمر بھر کے پچھتاوے کا سبب نہ بنتی، میں کیا کروں فاریہ! میں فاطمہ کو بھول کر موز بخت کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی، حالانکہ میں خوش رہتا چاہتی ہوں، مگر خوش رہ نہیں پاتی، میں خوش ہونے کی خواہش بھی کھل تو خود ہی شرمندہ ہو جاتی ہوں، کسی کی خوشیاں اجاڑ کے خود غریباں مٹانا، نہیں آتا یا را؟“ وہ بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

”تم نے یہ سب دانستہ تو نہیں کیا تھا نا؟“

”لیکن ہو تو گیا ہے نا؟“

”فاطمہ سے ملنے کی بات کرنے کی کوشش کرو۔“

”کی بار کر چکا ہوں۔“

”وہ میری بات سننے کی تو کچھ کہے گی یا جو بات ہی نہیں سنتی۔“
”میں قاتلہ سے ملنے کی کوشش کروں؟“ قاریہ نے حل سوچا۔

”بے کار ہے، جو لوگ میری بات نہیں سنتے وہ تمہاری کیسے سنیں گے؟“
”شاید سن ہی لیں؟“ قاریہ نے زور دیا۔

”یقیناً“ نہیں سنیں گے، وہ میرے اپنے ہیں میں ان کو اچھی طرح جانتی ہوں، رفیع کے انداز میں یہ سن تھا۔

”پھر؟“
”پھر کیا؟ پھر یہ ہی کرب سہنا ہے۔“ اس نے تلخی سے کہتے ہوئے کندھے اڑھائے۔
”خیر چھوڑو، یہ روگ تو عمر بھر کا ہے، لہجہ کا تاثر ہو رہا ہے، کھانا لگو آئی ہوں۔“

رفیع اٹھ کر باہر نکلی آئی اور ملازمہ کو کھانا لگانے کا کہنا تھا۔

”موزا! موزا!“ وہ مدت دیر سے دروازہ کھٹک رہی تھی، لیکن اس کی چیخ نکلی تھی، اس نے اسے پکار ہی لیا تھا۔

”رہا!“ وہ ایک دم بڑھ کر اٹھ بیٹھا تھا اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر لب جلا رہا تھا۔

”جیسے“ جیسے مدت تکلف ہو رہی ہے۔“ رفیع کا چہرہ بے بسیا ہوا تھا۔

”آہ! تم امت سے کلمہ دو میں مام کو بلاتا ہوں۔“ وہ اس کا چہرہ کھٹک کر باہر کی سمت لڑکھاتا عارفہ بیگم فوراً نیند سے اٹھ کر بھاگی آئی تھیں، رفیع کو سنبھالنے تک موزا گاڑی تیار کر چکا تھا، اس نے رفیع کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور عارفہ بیگم پہلے سے تیار بیگ لے کر آگئی تھیں۔ فیوز بخت بھی ڈرائیور کے ساتھ ان کے پیچھے ہی چلے آئے تھے۔

رات کے تین بجے اچھی خاصی افرا تفری جگ مچی

تھی، لیکن ایک گھنٹے بعد جب موزا کو مینی کی خوش خبری ملی تو وہ ساری افرا تفری بھول گیا تھا، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا، ترس نے پانی کو لاکر اس کی گود میں ڈال دیا تھا۔

”سنو سنو!“ اس نے بے ساختہ ترس کو آواز دی۔

”آئی ایم سوری۔ آپ کی دانت کی حالت خاصی خراب ہے۔“ ڈاکٹری کے دور میں ان کا بی بی لہو گیا تھا، ان کا جسم بالکل بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔ ”موزا کے چہرے پریشانی سے ہوا نیل اڑنے لگی تھیں۔

”نرس کہہ کے دوبارہ اندر چلی گئی تھی۔“ ان شاء اللہ بیٹا لہو ٹھیک ہو جانے لگا، اٹھو حوصلے سے کام لو اور نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرو، میں بھی مسجد جا رہا ہوں۔“

فیوز بخت نے بی بی کے کمان میں اذان دی۔ اذان کے بعد عارفہ بیگم نے مینی کو گھٹی دی تھی اور موزا نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا، لیکن وہ دونوں باپ، بیٹا، نماز پڑھ کے واپس بھی آجئے، مگر رفیع و پھر مینی ہوش نہیں آیا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ عارفہ بیگم نے گلوں فون کر کے احشام بخت کی فیل اور اس کی دوست قاریہ کو بھی بتا دیا تھا، کچھ ہی دیر بعد وہ سب ہی لوگ پہنچ گئے تھے، لیکن ایک رفیع کی فیل تھی جنہوں نے فون سننا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

”تم پہلے بھی دوبار آئے تھے اور پہلے بھی ہمارا جواب انکار میں تھا“ آج بھی ہمارا جواب انکار میں ہے“ احمد مرتضیٰ تلخی سے بولے تھے۔

”پہلے میں جب آیا تو حالات یہ نہیں تھے۔ پلیز میں آپ لوگوں کے پاؤں پکڑنے کے لیے تیار ہوں“ اسے معاف کریں، اسے ایک بار معاف کریں، وہ آج تین دن سے اسپتال میں پڑی موت و زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ یہ جنگ لڑتی نہیں رہی، وہ بار رہی ہے، وہ زندگی سے منہ موڑ رہی ہے۔“

موزا بخت کی آنکھوں میں زندگی میں پہلی بار یوں آنسو جھلپٹائے تھے، اس کا صبر جو اب بے کیا تھا، اس مقام پر اگر وہ اونیورسٹی میں موزا کی حوصلہ ہار گیا تھا اور مینی بار احمد مرتضیٰ ٹھیک تھے اور پہلی بار سیکرٹری جیم کا دل کسی نے پتی ریت۔ پچھکا تھا، وہ تڑپ گئی تھیں۔

”کیا ہوا ہے اسے؟“ ان کی منہ کی تڑپ چھپی نہ رہ سکی۔
”پچھکا ہوا ہے اسے پشیمانی ہے۔ اسے اپنی بیٹی تک کی خبر نہیں۔ لیکن اپنے ماں باپ کی فکر ہے اسے“ سید موزا بخت کا ہوش نہیں، اسے قاتلہ الیاس پاو ہے، کاش میں اس روز قاتلہ سے بات کرنے کے لیے فون ہی نہ کر، میری ضد اور تجسس نے یہ قوت دکھا دی، اپنے ساتھ ساتھ سب کا سکون برباد کیا اور دگر بھی برباد کر دیے۔ میں اس سے بھی زیادہ قصور وار ہوں، آپ مجھے سزا دیں اور اسے معاف کریں۔“

موزا نے حقیقتاً ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے، لیکن یہ ٹیکہ شوہر کی سمت دیکھ کر وہ نکلیں۔
”کون سے اسپتال میں ہے وہ؟“ اس کی تکلیف کا سن کر پتھر ہوئے دل بھی پھل گئے تھے۔ احمد مرتضیٰ نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا تھا اور موزا بخت کے آنسو ٹپک آئے، وہ پہلے بھی رفیع کو بتائے بغیر اس کے مام ڈیڈ کے پاس معافی مانگنے کے لیے آچکا تھا، لیکن ان دونوں نے موزا بخت کو بے عزت کر کے نکال دیا تھا، مگر اس نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔

”جہاں بعد ہوش میں آئی تھی اور اس کی پہلی نظر موزا بخت کے چہرے پر پڑی تھی، ماما ڈرائیور نے چوہینہ والی پشت اور نازی سے عاری تھا، کافی تھکا تھا، لگ رہا تھا، بلکہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ موزا بخت ہے، ہر دم لپکتی، تازہ دم اور کھرا ستھرا رہنے والا۔ وہ اس کی نظر خود بخود محسوس کر کے سامنے سے ہٹ گیا تھا اور پھر اس کی جگہ سیکرٹری جیم اور احمد مرتضیٰ کے چہرے دکھائی دینے لگے تھے۔“

”مام!“ وہ ذریعہ لب آہستگی سے بولی، جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔
”میری جان، میری بیٹی کیسی ہو؟“ وہ پک پکاس آگئی تھیں۔
”مام!“ اس نے بے یقینی سے انہیں ہاتھ لگا کر چھو کر دیکھا تھا۔

”ہاں میری جان! میں ہی ہوں تمہاری مام۔“ انہوں نے جھکے ہوئے اس کی پیٹھ پر ہوس دیا تھا۔
”ڈیڈ!“ اس نے گردن موزا کرپاپ کو دیکھا، وہ بھی پاس آگئے تھے۔

”آہ! آہ!۔۔۔ مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں؟“ اس کی تواضع اچھی تھی، مگر اس کا گولا سا چہرہ گھٹا تھا۔
”ہم پچھلے تین دن سے تمہارے پاس ہی ہیں، میں تمہاری آنکھیں بند کیے ہوئے پڑی ہو۔“ وہ اس کا سر پکھٹے ہوئے بولے۔

”اور وہ؟“ اس نے بے ساختہ پورے کمرے میں نظر دوڑائی، اسے موزا بخت کا چہرہ اس بھی نظر نہیں آیا تھا، ڈاکٹر نے باری باری ملنے کے لیے بھجوا تھا۔
”کون وہ؟“ بی بی کی بات کر رہی ہو؟“

”بی بی!“ رفیع چونک گئی تھی، اسے اپنے بچے کی تو خبر ہی نہیں تھی اور اب سیکرٹری جیم کے منہ سے بی بی کا لفظ سن کر اسے یاد آیا کہ بے ہوشی سے پہلے ڈاکٹر اور نرسیں بی بی کا ذکر کر رہی تھیں، تو گویا اس نے بی بی کو جنم دیا تھا۔

”جائے احمد! بی بی کو اندر لے کر آئیں۔ اس نے تو اپنی بی بی کو بھی نہیں دیکھا۔“ سیکرٹری جیم نے احمد صاحب سے کہا۔

”صبارک ہو بھابھی!“ اس سے پہلے کہ احمد صاحب باہر نکلتے، اچانک ڈاکٹر چلی آئی تھی، اس نے ہانپوں میں کمر میں لپیٹی بی بی کو اٹھا کر کھاتا تھا۔

”نشا؟“ رفیع اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔
”بی بی میں نشا پچھلے تین دن سے آپ کی صاحبزادی کو سنبھال رہی ہوں، تھکا کے رکھ دیا ہے اس نے مجھے۔“

نہ نے مصنوعی خلق کا انحصار کرتے ہوئے بھی کو
رجح کے پہلو میں لٹاوا تھا۔ رفتہ رفتہ تا کہ نہ نسبت بنیم
عارف بنیم، اشتہام بخت، فیروز بخت، قاریہ اور عثمان
وغیرہ سب ہی اندر آ گئے تھے اور سب ہی اسے ہوش
میں دیکھ کر خوش ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو باقاعدہ
سارا کلامی بھی۔

”جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ سائمنہ کی شادی ہے۔ میرا ہاتھ ملاتا ہے آپ نے۔“ انٹانے اس کی طرف جھٹکتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

”رنگی! رنج کو سن کر خوشی ہوئی تھی۔
”بس آپ کی بیٹی مبارک ثابت ہوئی ہے نامہ کے
لیے۔ اسی روز نامہ کے سررال سے فون آیا کہ وہ

وگھر رخصتی کروانا چاہتے ہیں، بس آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا، ابھی ہاں کیے دیتے ہیں ان کو۔ ”نشا بھی قاریہ کی طرح حنا لٹاپ بولتی تھی۔“

”اے مہرِ کماں ہے؟“ نہایت پیہم کو اس کا خیال آیا۔
”بھابی کا صدقہ دینے اور شکرانے کے نوافل

پڑھنے گئے ہیں۔ "مثلاً نے پھر فٹ سے جواب دیا تھا۔
"بے وقوف! کسی کا تو پرہیز رکھ لیا کرو۔" نامہ نے
اسے گھورا۔

”اس میں پردے والی کیا بات ہے“ انجی بیوی کی صحت یابی کے لیے لانی ہوئی مٹیں پوری کرنے گئے ہیں کوئی برا کام کرنے تو نہیں گئے کہ مرد رکھ لیں؟“

”اے واقعی آج کل کی لڑکیاں کچھنی اور چھری کو
بجھتے چھوڑ چکی ہیں ہر چیز کو کاٹتی جا رہی ہیں۔“ احتشام
بجھتے بھٹتے ہوئے کہا تھا اور نشانے ماب کو ناراضی

”یہ آپ بھی لوگوں کے کہے میں آگئے؟“
”لوگوں کے کہے میں نہیں آیا، کانوں سنا ہیں۔“

وہ اپنے کانوں کی سمت اشارہ کر کے بولے تھے اور باقی سب ہنس پڑے، نیشا اور فارہ نے ماحول کو کافی

اسلام آباد: قائد اعظم کی پوتلی کا کیا
 1 اپریل 2011

نام رکھنا ہے؟ اتنے دن ہو گئے ہیں رجسٹرڈ بھی کروانا ہے، فیوزر بخت نہ داخل کی گئی۔

”وایہ ہم کیسا ہے؟“ ہونے بے ساختہ کہا۔
 ”اس کے معنی کیا ہیں؟“
 ”اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

تختہ۔ اس نے معنی بھی بتا دیے۔
 ”وانیہ“ مہرِوزِ بخت۔ ہوں اچھا نام ہے رکھ لو۔“
 عارفِ بیگم اور فیروزِ بخت کو بھی یہ نام پسند آیا تھا۔

برتن چپ چاپ سر جھکائے کھانے میں مصروف
 رہی تھی اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا وہ کھانا کھانے
 کے بعد تھوڑی دیر نشا کے ساتھ باتیں کرتی رہا پھر

”تمہیں نام پسند نہیں آیا شاید؟“ مہموذ نے بچی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنی انگلیوں سے

”میں نے کب کہا کہ مجھے نام پسند نہیں۔“
”تم کوئی نام رکھنا چاہو؟“

”کیا تم نے اس کے اثبات میں سر نہ دیا۔
 ”کیا تم نے اس کے ثبوت میں سر نہ دیا۔“
 ”وہی سر نہ دیا۔“

”مفتی کب ہو۔“ مہروز نے شکر یہ ادا کیا۔
 ”ایک بات کہوں؟“ اس سبکی سے ہوں۔
 ”بات کہنے کے لیے اعازت کب سے لئے گی۔“

”جب سے تم نے انجان بننا شروع کر دیا ہے۔“

ت کی نظریں اپنی بیٹی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

مسل کرنا چاہتے ہو تو اس سے انجل بن جاؤ، مگر
 اس کہ مجھے یہ بات اب یاد آئی ہے، جب میں اپنی
 اور اپنی محنت کے سارے غم و غنا کا سامنا کر

نہایت نفیس حربہ پھر بھی ناکام تو نہیں ہو گیا؟" مسعود
تاکا نے اس مضمون پر خیر اور شرارت بھر کر جواب دیا۔

83

موٹاپے سے نجات



کہا جاتا ہے کہ رومی نے اپنی ہی چیز پیٹ کر خرابی ہے، یعنی پاور پیٹ کا بیڑہ جانا خرابی کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی طرح پیٹ کے پر مہیا سے کیلے، جھانپیاں بھی پیٹ کر خرابی سے بھرتی ہیں۔

خواتین کے تمام مسائل کا حل

موت، کچھ کا بڑا جانا، مرد سے رانی و تیز اینٹ
نیل مہارے، چھپ چھپ، جھانیاں دور کر کے

تاریخ: ۱۳۰۲ھ / ۱۹۱۵ء

جواهر حنا

واحدہ 80 پیسے قیمت

[illegible]

0333-8202553

[illegible]

حیات اوقات و چیزهای دیگر
از راه و وسیله ای است
چونکه در آن زمان که
از راه و وسیله ای است

[illegible]

0333-2338577
 0394-2994207-05
 Herbal Lab Karachi-Pakistan

2011-5-4

”کیا مطلب؟“ ریح نے ٹھنک کے پوچھا۔
 ”مطلب کو چھوڑو مطلب میں کیا رکھا ہے؟ ایک بات کے ہزاروں مطلب ہوتے ہیں۔“ مہروز نے ہاتھ بڑھکے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
 ”تم مجھ سے ناراض تھے؟“ اس نے آخر کمرہ ہی دیا۔
 ”نہیں۔“
 ”تو پھر مجھ سے نظر کیوں پڑائے پھر رہے تھے؟“
 ”پیشین قتلہ میں نے اسپتال میں تمہیں اسے نام ڈیڈ کے ساتھ خوش دیکھا تو مجھے شدت سے اپنی عقلی کا احساس ہوا تھا کیوں رشتوں میں دراڑ کا سبب بن گیا؟“
 ”یہ سب قسمت میں لکھا تھا۔“ ریح نے بیٹھ سے دھڑلایا چلنے والا لفظ دہرایا تھا۔
 ”تمہیں پکی ہوا اس پر کو؟“
 ”ہاں مان پکی ہوں لیکن فاطمہ نام کا تیر میرے دل سے اب بھی نہیں نکلا، جو شرمندگی جو ندامت جو ککب مجھے اس کی طرف سے ہوتی ہے وہ میرے دل سے بھی نہیں جاسکتی۔“
 ریح کا خمیر ابھی مٹھن نہیں ہوا تھا وہ اتنی خوشیوں میں بھی خیر مٹھن رہتی تھی۔
 ”لوھر آؤ میرے پاس۔“ مہروز بخت نے اسے قریب سے آنے کا اشارہ کیا اور جیسے ہی ریح قریب آئی اس نے اسے بازو میں گھیر لیا تھا۔
 ”زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر فاطمہ کا تیر بھی تمہارے دل سے نکل جائے گا اللہ سے اس کے لیے دعا کیا کرو وقت بہت سی تبدیلیاں لاتا ہے۔“ اس نے ریح کو تسلی دی تھی۔ ”تب تم اپنے آپ کو ہی سوچ لو پہلے قریب آنا تھا تو تم دور ہاتھ تھیں اور اب میں دور بیٹھا ہوں تاہم تو قریب آئی ہو۔“ مہروز بڑی سے اتر گیا تھا ریح دگ ٹٹی۔
 ”کیا کہا؟“ وہ دبے لہجے میں جچ اٹھی۔
 ”یہ ہی کہ میں اپنی بیٹی کو پیار کر رہا ہوں اور تم جان بوجھ کر میری توجہ اپنی سمت منتقل رہی ہو۔“ مہروز نے

اسے سر تپا کر پیار کیا اور نظروں سے دیکھا۔
 ”تم نے خود مجھے قریب بلایا تھا۔“
 ”مجھے کب پتا تھا کہ تم آجاؤ گی؟“ اس نے مسکراہٹ جاتے ہوئے کہا۔
 ”مہروز بخت!“ اس نے مہروز کے ہل دیوچ لیے تھے تب ہی وائے نے رونا شروع کر دیا اس سے پہلے کہ مہروز کا مہوہ کچھ اور دھنک ہو تا وائے کی چیخ پکار نے اس کی ساری مسکرتی اور دھنکس ہرین کر دیا تھا۔
 ✽ ✽ ✽
 ”ریح بیٹا مہروز کا فون ہے جلدی آؤ۔“ سلیکٹ بینک کی آواز سنائی دی۔
 ”آ رہی ہوں۔“ وہ چپکے سے لاؤنج میں آئی۔
 ”السلام علیکم۔“
 ”وعلیکم السلام کیسی ہو؟“
 ”ٹھیک ہوں۔“ اس نے مختصر کہا۔
 ”کیا بات ہے؟ مہروز کیوں آف ہے؟ مہروز جان چکا تھا۔“
 تمہاری لاڈلی نے میرا سیل توڑ دیا ہے، میرے حوصلے سے نیچے پھینکا ہے۔“ اس نے بیٹھ کی طرح شکایت کی۔
 ”کوئی بات نہیں۔ بہر تو بچی مٹی ہو گی مسئلہ بنانے لیں گے کیشٹ ڈائل جو بھی تمہیں پسند ہو۔“ مہروز نے اسے سہلایا۔
 ”مٹی دے تمہیں بتاؤ کرب آ رہی ہو؟“
 ”کرب؟“ مٹی کی زبان تو ہوتے ہیں آئے ہوئے؟“
 ”یار! کربت خلی خلی سالگ رہا ہے مام ڈیڈ تم دونوں کو مس کر رہے ہیں۔“
 ”میرے جانے کے بعد میرے مام ڈیڈ کو بھی تو کمر بہت خلی خالی سا لگتا ہے۔“ ریح اپنے ماں باپ کے لیے ادا ہوئی تھی۔
 ”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ کسی نے مہمان کی تیاری کروا کر پھر ایک انگل آئی کے پاس رہا کرے گا اور ایک مام ڈیڈ کے پاس۔“ اس نے اپنے مطلب کا شور مچا دیا۔

”پھر تم کو گے کہ تیسرے مہمان کی تیاری کرو جو ہمارے پاس رہا کرے گا۔“ ریح کے برکتہ جواب پر وہ قہقہہ لگائے کہنے لگا۔
 ”بہت چیز ہو یا راہی لیے تو میں تمہارے ہاتھوں پر وقوف بن گیا۔“
 ”اور اب ہر روز میں بے وقوف بنتی ہوں تمہاری چکنی چڑی ہاتھوں میں آکر۔“ اس نے اعتراف کیا تو وہ ہنس دیا۔
 ”پھر کرب آ رہی ہو؟“
 ”ڈیڈ کھر آجائیں تو ان سے کہتی ہوں کہ وہ سیٹ ریزرو کروا دیں۔“ مہروز نے فون رکھ دیا تھا۔
 ✽ ✽ ✽
 جہاز کے پرواز کرنے میں بہت کم ٹائم رہ گیا تھا، جب وہ اپنی سیٹ پر پہنچی تھی وائے کو دونوں ہانڈوں میں بٹھل اٹھا رکھا تھا۔ کندھے پر ٹیک بھول رہا تھا وہ اپنی سانس ہموار کرتی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور وائے کو گود میں بٹھ گیا تھا۔
 ”مما ڈیڈ بی۔“ وائے نے کسی بچے کی سمت اشارہ کیا تھا۔
 ”ہاں سو چھوٹا سا بھائی ہے۔“ ریح نے جھک کر کہا اور وائے کا گل چوم کر اسے گود لیا تھا۔
 وہ بچہ بھی وائے کی سمت ہلک رہا تھا شاید وہ بھی کھینا ہاتھ تھا۔ بلا خروائے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی سمت کھینچ لیا تھا اور وہ بچہ وائے کی گرفت سے رو رہا تھا۔
 ”لوہ آئی ایم سوڈی“ یہ ہنس کھیلنے کی ضد کر رہی ہے۔“ ریح نے گاؤں اور جاب میں لپٹی لڑکی سے معذرت کی جو یقیناً ”اس بچے کی ماں تھی کیونکہ بچہ اس کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔“
 ”اس لوگے، لیکن کبھی کبھی کھیل کھیل میں زندگی وائے لگ جاتی ہے۔“ اس لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا تھا، لیکن ریح کی سماعت پر حیرت اور بے یقینی کا ہم پڑا تھا وہ گردن موڑ کر خیر سے دیکھ رہی تھی۔
 ”فاطمہ؟“ ریح اسے اس کی آواز سے پہچان گئی

تھی، مگر لاکھ اس نے ڈھکی، تین سال بعد اس کی آواز سنی تھی۔
 ”فاطمہ! یہ تم ہی ہو نا؟“ ریح فاطمہ کو سامنے کر آس پاس سب کچھ بھول گئی تھی یاد تھی تو صرف فاطمہ۔
 ”کوئی شک ہے؟“ فاطمہ نارمل سے انداز میں بولی تھی۔
 ”فاطمہ! تم۔۔۔ تم کہاں تھیں؟“ ریح کا لہجہ بھرا گیا تھا پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ ”میں نے بہت بار تم سے ملنے کی کوشش کی، لیکن خدیجہ مملانی نے بتایا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے تمہاری شادی کس سے ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ یہ انہوں نے نہیں بتایا جب سے مام ڈیڈ نے مجھ سے ملنا ملنا شروع کیا۔ ماموں نے ان کے ساتھ بھی رشتہ ختم کر دیا تھا۔“ اس نے تو کہیں سے کوئی

بازوق قارئین کے لیے سالانہ بک سیل

مشہور و معروف مصنفین کی علمی، ادبی، اسلامی کتب مشہور شعراء کے شعری مجموعے مقبول مصنفین کے ناول اور ناولٹ کے مجموعے بچوں کے لیے کہانیاں

50 فیصد تک خصوصی رعایت خریداری کے لیے تشریف لائیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی۔

Young's Chicken Spread

Spread energy.



Energy to break.
Every difficulty in life.



With Young's Chicken Spread

- You stay active, alert, agile
- You get more energy to perform
- You get vital vitamins, proteins and good fats
- Your mind and body stay healthy and young

Young's

www.youngsfood.com

UAN: 111-968-647 (YOUNGS)

Spread Health. Spread Life

”مفتی کب یو فاطمہ!“ رنج نے اس کے ہاتھ چوم لیے تھے۔ دو تین سال بعد اس نے مکمل کے سائنس کیا تھا اسے اپنا آپ ہکا بھکا محسوس ہو رہا تھا۔ فاطمہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش تھی اسی لیے بار بار اس کی باتیں سناری تھی اس کے شوہر کا تعلق کافی اچھی فیملی سے تھا۔ کراچی میں ہوتا تھا اور کچ فاطمہ اپنے بچے کی چار دیواری تھی ماں باپ سے ملنے۔ اور رنج کھر کھڑی تھی ماں باپ سے مل کر۔

اسلام آباد اور یوٹ پیہ وہاں آئی تو سامنے ہی موزی بخت کھڑا تھا۔ فاطمہ اک نظر اسے دیکھ کر دو سری طرف بڑھ گئی جہاں صوفی الیاس صاحب کھڑے تھے۔

”کس کو دیکھ رہی ہو؟“ موزی رنج کے پاس آیا۔

”فاطمہ کو۔“

”فاطمہ؟“ وہ ٹھٹھکا۔

”وہاں کے ساتھ چار دیواری ہے۔“ اس نے رنج کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا وہ مکمل حجاب میں لپیٹی تھی۔

”آج فاطمہ نے مجھے زندگی بخش دی۔“ رنج اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے آہستہ سے بولی تھی۔

لیکن اس کی کواڑ سے آسودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ اور موزی بخت بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کرتا اسے ساتھ لے کر پارکنگ میں آیا تھا۔ وانیہ کو بانڈ پے اٹھا رکھا تھا۔

”اس بار لاہور جا کر تمہیں بہت مس کیا میں نے۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”کیوں؟“

”میں تمہیں یاد آ رہا تھا۔“

”تو ابھی کرلو۔“

”نہیں اب گھر جا کے۔“

”تو پھر جلدی چلو۔“ اس نے گاڑی کی اسپینڈ بڑھا دی اور رنج کھکھلا کر ہنس پڑی تھی جبکہ وانیہ ان کی ہنسی پہ تالیاں بجاتی تھی۔

خبر نہیں ملی تھی۔ ”رنج تیری سے کتنی چاہی تھی۔“ میری شادی لیا جان نے اپنی پسند سے کی تھی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔ گزشتہ زندگی میں کیا ہوا کچھ بھی یاد نہیں رکھنا۔ شادی شدہ زندگی میں سوچنے کا نام ہی نہیں ملتا۔

فاطمہ جانتی تھی کہ رنج شرمندہ ہے اسی لیے تو وہ نارمل سی بات کر رہی تھی۔

”فاطمہ! نام ملتا ہے بہت نام ملتا ہے جب سونے کے لیے لیٹو تو وحیان اسی چیز کی طرف جاتا ہے جس کے ساتھ ہم نے کچھ برا کیا ہوتا ہے۔“

”رنج! وہ قصہ مت جینو میں بھول چکی ہوں۔“

”میں بھول نہیں سکی بھولنے کی کوشش بہت کی ہے۔“

”چھو! اس بات کو۔“

”میں اس بات کو چھوڑ دوں گی تم مجھے مجھے معاف کر دو۔“ اس نے پتے آنسوؤں کے ساتھ فاطمہ کے ساتھ ساتھ چھوڑے تھے۔

”تمہاری معافی کا ایک لفظ میرے لیے عمر بھر کا سکون ہے فاطمہ! میں اندر سے بہت بے سکون ہوں۔“ اس نے التجائی تھی اور فاطمہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں وہ اب بھی پردہ کرتی تھی۔

”میں نے تمہیں معاف کیا رنج مجھے مل سے۔“

فاطمہ نے اس کے ہاتھ ہٹا کر اسے گلے لگایا تھا۔

”لیا جان بے شک تم سے ناراض رہیں مگر میری تم سے کوئی ناراضی نہیں ہے میں شروع شروع میں بہت دکھ ہوا تھا بہت درد ہوا تھا لیکن اب جب سے شادی ہوئی ہے تو پتا چلا ہے کہ میری قسمت تو یہ تھی وہ نہیں وہ تو تمہاری قسمت تھی۔“ رنج نے ہلکے ہلکے کر روتے ہوئے اپنے سارے آنسو بہا دیے تھے۔

بہت سے لوگ ان کی سمت متوجہ ہو رہے تھے۔

”سنجھا لو اپنے آپ کو۔“ فاطمہ نے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

گوتی دیکھ کر

نصرت بیٹھے لمبے میں روہیل کوڑے داریوں کا احساس دلاتے ہوئے شادی نہ کرنے کا کہتی ہے تو روہیل پر نصرت کے اچھے روئے کا بھید کھلتا ہے۔ حالات سے ناامید ہو کر اسے زونہ کی باتیں سچی محسوس ہوتی ہیں اور وہ ایک بار پھر زونہ کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔

زونہ شہباز سے رشتے ہونے سے پہلے ہر صورت میں ثانیہ اور روہیل کی ملاقات چاہتی ہے۔ وہ زونہ کے جھانے میں آکر روہیل سے ملنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

ہوٹل میں روہیل کا انکشاف ثانیہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ زونہ کا رونا تحفہ روہیل کو دے کر جان چھڑاتا چاہتی ہے۔ عین وقت پر زونہ کے بلاوے پر بلال پہنچ کر معاملے کو سنگین بناتا ہے۔ بلال اس ملاقات کو اسی انداز میں لیتا ہے جیسا زونہ چاہتی ہے۔ زونہ ثانیہ کو یہاں لے کر آنے سے صاف گرجاتی ہے جس پر ثانیہ دنگ رہ جاتی ہے۔ بلال روہیل کا کریاں پکڑ کر اسی وقت حساب بے باق کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ ثانیہ کے سمجھانے اور دوسرے پردہ اسی وقت ”طلاق“ کا لفظ استعمال کر کے اسے سناکت کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال میڈم لخصیہ کے لیے پریشانی اور دکھ کا باعث ہے۔ اس ماحول میں زونہ اسب سے زیادہ مطمئن ہے جس کی راہ کا کاٹنا صاف ہو چکا ہے۔ ہری طرف روہیل کی کشش نصرت کو ہولادری سے ہر طرف سے چھان بین پر بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔

بھنی ہے کہ ثانیہ اور روہیل نے تجوید محبت کرنی ہے کہ ایک دن اچانک کسی کی گذرات گئے نصرت کو سناکت کر دیتی ہے۔

تاؤلیٹ

www.PakSociety.com



www.PakSociety.com

ایک جیتا جاگتا رسک تھی مظلوم۔ اب اور کتنے سال
 اہل یہ خطروں میں لے سکتی تھیں۔
 اس کے بعد ہمسہ نے خاموشی سے ساجدہ کے
 لائے ہوئے کپڑے بھی پہن لیے اور مولوی صاحب
 کے سامنے قیام ہے بھی تین بار دہرایا اور دھڑکا بھی کر
 لیے۔
 "کوئی نہیں تو کم از کم ای کو تو یہ خوشی ملنی چاہیے کہ
 میرے جیسا عذاب ان کے سر سے اتر رہا ہے۔ مگر
 سے رخصت ہونے وقت بھی وہ ذرا نہیں بدلتی۔
 اور ذکیہ کتنی دیر اسے گلے سے لگا کر سکیوں سے
 روٹی دہی اور ہمسہ جاتی تھی اس کی ماں کی یہ
 سکیاں کتنی مہنوشی ہیں۔
 ابھی اس کے رخصت ہوتے ہی وہ فوراً مصلّا بچھا
 کر شہرانے کے نقل ادا کریں گی اور آج کی رات
 خوب چمن کی فینڈ سوئیں گی۔
 لیکن اس کا بے چین دل ہر وقت اسی مہنشی کو
 سلجھانے میں لگا رہتا اور جب اسے رو جیل کا موڈ
 اچھا لگتا تو یہ سوال ضرور پڑا۔
 اتنے سالوں میں اتنی تبدیلیاں آپکی تھیں۔ ان
 کے دو بچے ہو چکے تھے اور اس بات پر ہمسہ خدا کے
 آگے جتنے بھی سجدے کرتی کم تھے کہ اس کے دونوں
 بچے آنکھوں والے اور صحت مند تھے اور کہنے والے
 کہتے تھے۔ خوب صورتی میں اپنی اندھی ماں کی ہو سو
 کاپی ہیں رتیر اور روشن!
 اس کی زندگی مکمل تھی مگر یہ لوح و رات شدہ سوال
 اسے راتوں کو بھی بے چین رکھتا تھا۔
 "تو آپ مجھے نہیں بتائیں گے؟" آخر آخر وہ روٹی
 پڑی۔
 "کیا کوئی جان کر؟" بہت سالوں بعد جیسے رو جیل
 کی چپ ٹپٹ تھی۔
 "مجھے بس جانا ہے۔ کرنا تو کچھ بھی نہیں۔" وہ
 بچپن سے بولی۔
 "اور یہ تو میں جانتی ہوں رو جیل! آپ نے مجھ سے
 شادی کسی لگاؤ کی وجہ سے نہیں کی تھی۔ آپ کو مجھ

سے ایسا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔
 "مگر اب تو ہے تاہم سے تو انکار نہیں کر سکتیں۔"
 وہ ہچکے سے کہنے میں بولا۔
 "مجھے آج آپ مل نہیں سکتے۔ پلیز بتائیں نا! اور
 آج یہ جان ہی لینا چاہتی تھی۔
 "اگر تم یہ کہہ سکتیں ہمسہ! تو تمہیں کہ اس گھر
 میں میرے فیماثل منتقل اسٹور میں جہاں بھی میرا زمانہ
 سے زیادہ وقت گزرا ہے۔ میں نے کوئی آئینہ نہیں لگا
 رکھا۔" وہ عجیب سے کہنے میں بولا۔
 "کیا مطلب؟" ہمسہ نے بھی سے بول۔
 "آئینے کوئی کو اس کا چہرہ دکھائے ہیں اور مجھے اپنے
 چہرے سے نفرت ہے۔"
 "رو جیل! میں نہیں سمجھی مگر آپ ایسی باتیں کہیں
 کر رہے ہیں۔"
 "آپ جتنے آتے ہیں مگر انتخاب صورت آپ کا دل
 چاہے میں جاتی ہوں آپ کا چہرہ بھی اتنی ہی خوب
 صورت ہو گا۔"
 "اتفاقاً ہی صورت۔" وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولا۔
 "رو جیل کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ قسم کھاتے ہوئے
 "میں نے محبت کو کبھی دیا نہیں تھی۔ آپ جس سے
 محبت کریں وہ آپ کو نہ مل سکے تو کیا اسے برباد کر دینا
 چاہیے؟" وہ بولا۔
 "وہ سارے ہی بیٹھی رہ گئی۔
 "نہیں! لیکن میں نے کیا میں نے جس سے محبت
 کی اس کو برباد کر دیا۔ اور مجھے اپنے اس روپ سے اتنی
 محبت آئی۔ اتنی نفرت کہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب
 میں زندگی بھر اپنا چہرہ نہیں دیکھوں گا اور جس کے ساتھ
 زندگی گزاراں گا وہ بھی میرا چہرہ بھی نہ دیکھے اس
 لیے۔" وہ جیسے بولتے بولتے ہانپ سا گیا۔
 "اس لیے آپ نے مجھ سے شادی کی؟" وہ شائد
 سے انداز میں بولی۔
 "وہ کون تھا رو جیل! جس سے آپ کو محبت تھی۔"
 اس کا دل جیسے غم سے بوجھل سا ہو گیا۔ جانے یہ کس
 کا غم تھا اس کا اپنا کہ وہ رو جیل کی محبت میں۔

اگرچہ وہ یہ بات جانتی تھی مگر خوش نمی سی قیام
 کو اتنے سالوں سے کہ شاید رو جیل نے واقعی اس سے
 محبت کی ہو یا رو جیل کی کچھ جانے والی محبت کے دکھ
 سے جس نے رو جیل کے دل کو اتنے سالوں سے
 مغھم کر رکھا ہے یا اس پر ہوا دھانے والی محبت کے غم
 سے جو جانے کس طرح برپا ہوئی ہوگی اور اب کہاں
 ہوگی؟
 "سو جاؤ؟" جہیں تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے
 نا! وہ ایک دم سے بدلا ہوا تھا اور ذرا دیر میں ہمسہ
 نے اس کے کونٹ لینے کی سرسراہٹ سنی۔

 "آپ سوئیں نہیں ابھی تک؟" وہ لاؤنج میں
 داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔
 "کیا مجھے سو جانا چاہیے تھا؟" فیصلہ نہ کرنے والے
 انداز میں بولیں۔
 "وہ شرم سے ساکھڑا رہ گیا۔
 "اس عمر میں فینڈ آئی کہاں سے اتنی جلدی پھر اگر
 اس مسلسل پشیمانی کے احساس میں گھرا ہو تو فینڈ کے
 لیے بستر کی طرف جاتے ہوئے خوف آنے لگتا ہے۔"
 وہ جیسی آواز میں خود کلامی کے سے انداز میں بولیں۔
 "یوں نہ کہیں نا! وہ ہولے سے بولا۔
 "اور وہ خود بھی کون سا کبھی ہے۔" وہ آہی بھر کر
 بولیں۔
 "کی ٹی مینوں کے بعد تم گھر آتے ہو پھر سارا سارا
 دن قابو رہتے ہو اور میں ان لوگوں کو دیکھ کر ان کے
 درمیان خود کو کس خوفناک طریقے سے بکرا ہوا
 محسوس کرتی ہوں شاید جہیں اندازہ نہیں۔" وہ آج
 سب کچھ کہہ رہی تھی۔
 "میں تو آپ سے کہتا ہوں آپ میرے ساتھ
 چلیں۔ یہاں ایسی رہتی ہیں۔ میں بھی فکر مند رہتا
 ہوں اور مجھے دو چار مینوں بعد اتنا پڑتا ہے۔"
 "تو تم کیوں نہیں آ جاتے؟"
 "کیا کرنا گا اگر؟" وہ جھکے ہوئے کہنے میں بولا۔

"اور وہاں کیا کرتے ہو؟"
 "کم از کم قرار تو ہو سکتا ہوں ان سب خوفناک
 یادوں سے۔" وہ حد حال سے انداز میں سر صوفے سے
 لگا کر بولا۔
 "تم میری بات مان کیوں نہیں لیتے بلال! وہ
 عاجزی سے بولیں۔
 "میں مان سکنا۔" وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے
 ہوئے بولا۔
 "یوں کب تک تمہارا ہو گے؟" نہیں اس پر بہت
 ترس گیا۔
 "میں تمہا ک ہوں نا! وہ پھکی سی مسکراہٹ
 سے بولا۔
 "آپ جو ہیں میرے ساتھ۔"
 "کب تک خود کو بھلاتے رہو گے۔ میں تو خود اپنے
 ساتھ نہیں ہوں تمہارے ساتھ کیا ہوں گی۔" وہ دل
 مگر فکری سے بولیں۔
 "دونوں خاموش ہو گئے۔
 "دونوں کے درمیان کم و بیش روزی طرح کی باتیں
 ہوتی تھیں اور بغیر کسی جھجکے جھجکے جھجکے جھجکے
 "میں آج زندگی کی طرف تھی؟" وہ بہت دیر بعد
 بولیں۔
 "بلال کے لب بھج گئے۔
 "تم نے ابھی بھی اسے معاف نہیں کیا نا! وہ اس
 کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولیں۔
 "میری معافی سے کیا ہو گا؟" وہ سرو لیجے میں بولا۔
 "ہاں اسے کیا فرق پڑے گا۔ کون سا اس کا تعیب
 بدل جائے گا۔" وہ آہی بھر کر بولیں۔
 "شہیار! اتنے سالوں میں میں نے بھی سمجھ نہیں پائی
 اور زندگی کی عمر کی کہ وہ بھی ماں نہیں بن سکتی۔ کیا
 قدرت کی طرف سے منہ والی یہ سزا کافی نہیں اس کے
 لیے جو تم بھی بھالی ہو کر۔"
 "نام! میں بہت بار کہہ چکا ہوں میں ان ساری باتوں
 کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے بار بار میرے
 سامنے ان کو نہ دہرایا کریں۔" وہ ایک دم سے بھڑک

”میرے پاس دھرانے کے لیے اور ہے ہی کیا۔“ وہ دیکھی لہجے میں بولیں۔
 ”سوری!“ وہ خود ہی ٹھنڈا ہوا گیا۔
 ”شلوی کر لو بلال! میری یہ بات مان لو۔“ کچھ دیر بعد وہ جتنی کہیں بولیں۔
 ”نہیں مام! میں نے مجھ پر نہ بھیجے۔“
 ”نہی تمہارا چہرہ ہی نہیں۔“ وہ زور اور بعد پھر پہلے والی بد مزگی بھول کر بولیں وہ اسی طرح اب ذرا ذرا سی باتیں یونہی بھلنے لگی تھیں۔
 وہ جواب میں خاموش بیٹھا رہ گیا۔
 ”نہی کہہ رہی تھی اس کا شک درست نکلا۔“ وہ انہیں دیکھنے لگا۔
 ”شہناز نے وہ ساری شلوی کر دی تھی ہے اسلام آباد میں رکھا ہوا ہے اسے اس کی ساس کو بھی بتا ہے مگر سب ایسے انجان ہیں جیسے کچھ جانتے نہیں۔“
 ”مجھے نیند آ رہی ہے۔“ وہ بے زار ساتھ کر کھڑا ہوا گیا۔
 ”اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بار آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی۔“ جاتے ہوئے رک کر بولا۔
 ”تھک ہے میں بھی اس تھالی اور اکیسے پن سے لڑتے لڑتے تھک سی گئی ہوں۔“ وہ دھکی ہوئی آواز میں بولیں۔
 ”آپ واقعی میرے ساتھ چلیں گی نا؟“
 ”ہاں!“ وہ سر ہلا کر بولیں۔ ”رنگارنگ منٹ کے بعد یوں گھر میں رہنا اور پھر ان تکلیف دہ باتوں کو سوجھنا رہنا اب میرے لیے کسی اہمیت سے کم نہیں میں تھک گئی ہوں بلال!“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔
 ”اسی لیے تو کہتا تھا ہر بار آپ سے کہ چلیں میرے ساتھ۔ یہاں اکیسے رہتے رہتے آپ خدا نخواستہ بیمار پڑ جائیں گی۔ آپ کل ہی مجھے پاسپورٹ دینے لگے تھے۔“
 ”بلال! میرا بل اتنا ہے ایک بار ٹائیپ ضرور آئے گی۔“

”بچے کو لے کر۔ اگر وہ اتنی اور یہاں کوئی بھی نہ ہو تو۔“
 ”مہما! آپ کو ابھی بھی۔“ اس سے چودہ سال ہو گئے ہیں۔ کسی کی واپسی کے لیے کم تو نہیں ہوتے۔ اگر اسے آتا ہوتا۔ آپ بھول جائیں اسے۔“ وہ خود پر ضبط کر کے بولا۔
 ”تم بھول چکے ہو؟“ وہ حنا کر بولیں۔
 ”جانے تو کہتا ہوا ہو گیا ہو گا۔“ مہما ہوا ہوا گیا۔
 ”پکڑی بد نصیبی دیکھو۔ میرا دل کیسے ترس رہا ہے اسے دیکھنے کو۔ کاش بلال! تمہیں سب فیصلے اتنی جلدی جلدی نہ کرتے تو آج ہم دونوں بیٹھے ہوں اکیسے پن کا زہر نہ پل رہے ہوتے۔“ وہ دن بھر کے لہجے میں بولیں۔
 ”شہناز! اب۔۔۔ بہت رات ہو گئی ہے۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
 * * *
 ”ٹائیپ نے نماز کے بعد سلام پھیرا اور دعا پڑھتے گئی۔ اسی وقت ملازم ہاتھ میں کوریز کا بڑا سا ٹیپ اور ریوولنگ سلپ لیے ہوئے آئی۔
 ”ہیکم صاحبہ! اس پر دستخط کریں۔“
 ”ماں! کیا ہے؟“ اسی وقت فاطمہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آ کر ٹیکٹ دیکھ کر بولی۔
 ”مجید کہاں ہے؟“ ٹائیپ جاتے نماز تہ لگا کر بولی۔
 ”میں کھیلنے گیا ہے کل اس کا سچ ہے نا اسکول میں۔“
 ”ٹیکٹ تو کھولیں نا ماموں نے کیا بھیجا ہے؟“
 ”سہری سے بولی۔“
 ”تم دونوں کے گفٹ ہوں گے پاس ہونے کے۔“
 ”عمیدو مجھ سے کہہ رہا تھا۔“ فاطمہ جلدی جلدی ٹیکٹ کی پیکنگ کھولنے لگی۔
 ”واؤ! ماں! دیکھیں تو کتنا خوب صورت ڈریس ہے۔“
 ”میرا اور بھائی کے لیے کیا ہے؟“ وہ باقی کے ٹیکٹ کھولنے لگی۔
 ”تمہارے اسکول کے فنکشن کا کیا بنا ہے؟“ ٹائیپ

”اسی ٹیکٹ کو ہے آپ آنکس کی نا!“
 ”کیوں نہیں تمہاری ٹیکٹ کسی تیار ہے؟“
 ”اے دن۔ اس بار بھی دیکھیں گے کافر سٹ پر انز میرا ہی ہو گا۔ ماں! آپ کی بیٹی ہوں۔ ہر سال ایچل فنکشن میں سب سے زیادہ پر انز میرے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی مجھے beat نہیں کر سکتا۔“ وہ فخر سے کہنے لگی۔
 ”اوہ! توں ہی بات یوں نہیں کہتے یہ سب اللہ کی رحمت اور تمہاری محنت کا نتیجہ ہوا ہے۔“ ٹائیپ نے اسے ٹوکا۔
 ”نا ہے وہ میری فریڈ اور نا ہے اس کی بڑی سسٹر آپ کے گلے میں رہتی ہے۔ کل ان کی فریڈ کا گروپ ہمارے اسکول آیا ہوا تھا ناں! آپ سب کیا کہہ رہی تھیں؟“ وہ ایک دم سے ٹائیپ کے گلے میں ہانسی ڈال کر بولی۔
 ”فاطمہ! تمہاری مام جیسا گریس فل شاندار اور اتنے زبردست تھانے ایکٹنگ کیہیر کے ساتھ اتنی مائٹری اور خرم خاندان۔ سارے کالج کی آئیڈل ہیں۔ آپ اس سچے لکھے لکھے میرا سچے ساتھی ہیں جو نا ہوا کیا ہو یا میرے بچے لگ گئے ہوں اتنی خوشی ہوئی کہ بس۔ اور میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ میری ماں تو میری بھی آئیڈل ہیں۔“ وہ پرجوش انداز میں کہتی جا رہی تھی اور ٹائیپ کم سمی اسے دیکھنے جا رہی تھی۔
 ”صرف تمہاری آئیڈل کیوں میری ماں صرف میری آئیڈل ہیں۔“ سمجھیں تم۔“ مجید ہاتھ میں اسکاوش کا ٹیکٹ لیے اندر آ گیا اور فوراً ہی ٹائیپ کے کہنے پر اپنا سر رکھ کر محبت سے بولا۔
 ”تمہارا حلق تو مجھے کسی لیزنٹیا سے لگتا ہے۔“
 ”لفظہ گروپ۔“ وہ اسے منہ پر آ کر بولی۔
 ”خیر! اور جو میری اتنی پیاری ماں کو لیزنٹیا کہا ہو تو۔“ وہ سہ اختیار ٹائیپ سے لپٹ کر بولا۔
 ”ہنو نا گیا چاہی ہی کرتے لگے ہو تم دونوں۔“
 ”ایک دم سندی سے بولی تو دونوں بل بھر کو خاموش سے رہ گئے۔
 ”آپ کو اچھا نہیں لگا؟“ فاطمہ تو جیسے اس کی بیٹی

”شٹاس تھی۔“
 ”یہ بات نہیں بیٹا! لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ کوئی آئیڈل نہیں ہونا آئیڈل تو ہمارے لیے خدا نے ایک ہی ہستی کو پیدا کیا ہے اس کی سنت اس کے اسوے چلنا ہی سب سے بڑا آئیڈل اور فخر کے لائق بات ہے اس کے علاوہ انسانوں کو ان کی معمولی خوبیوں کی بنا پر آئیڈل بنالینا ہمیشہ سے خسارے کا سودا ہے اور رہے گا۔ تم بھی یہ جھگڑ نہ کرنا۔“
 اس کے لہجے میں محبت سے دکھ گھل رہے تھے جیسے کوئی کالج ترخا ہے۔
 ”تیری محبت ماں؟“ دونوں ماں کے اس انداز کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔
 ”آئیڈل جب ٹوٹتے ہیں تو بہت دکھ دیتے ہیں۔ ایسے دکھ جو کبھی کبھی روگ بن جایا کرتے ہیں اور میرے بچوں! میری تو بل بل تم دونوں کے لیے یہی دعا ہے کہ میں کبھی کوئی ایسا روگ نہ لگے۔“
 ”ایک بات پوچھوں ماں؟“ مجید ہولے سے بولا۔
 ”کلی! تمہیں بتایا کرتی تھیں ہمارے بیٹے آپ کو چھوڑ دیا تھا۔ کیوں؟ اس کا جواب انہوں نے کبھی نہیں نہیں دیا۔“ آپ سے بھی اس لیے میں پوچھا کہ آپ ہرٹ ہوں گی لیکن ماں! آج کل یہ سوال میرے فریڈز جب اپنے فلورز کی باتیں کرتے ہیں اپنے رشتہ داروں کی اپنے قریبی عزیزوں کی۔ تو میں! میری فیملنگز بہت عجیب سی ہوتی ہیں۔ بہت دن سوچا مگر آپ سے پوچھ نہیں پایا۔ مگر آج۔ ماں! ہمارے بیٹا کون تھے؟ لیکن کیا انہوں نے آپ کے ساتھ ایسے؟“
 وہ دونوں اس سے اتنے سارے سوال اتنی جلدی پوچھ لیں گے تو ٹائیپ نے سوچا بھی نہیں تھا۔
 جب تک خدیجہ زندہ تھیں اسے اس طرح کے مسائل سے دور ہی رکھا۔ دونوں جیسے زیادہ تر ان کے پاس رہتے اور ٹائیپ اپنی تعلیم مکمل کرتی رہی۔ شروع کے کچھ سال عمیدو نے ان کی گفتگو کی اور اب بہت سالوں سے وہ خود اپنا سب کچھ کر رہی تھی مگر اس سب کچھ میں ظاہر ہے ان کا باپ تو نہیں تھا۔ یہ رشتے ایسے

تو نہیں ہوتے کہ خود کھیل ہونے کے بعد انہیں بازار سے خرید کر لایا جائے یا ان کے خدا کو پر کیا جائے۔
 جانیے کو ان سوال کا دھڑکا تو تھا مگر اتنی جلدی۔
 وہ خاموش فکروں سے عید کے متفرج چرے کو دیکھتی رہی۔

”میں! بتائیں نا!“ قاتلہ اس کی اتنی ایسی چپ بولی۔

”ابھی یہ سب جاننے کے لیے قہر دونوں بچھوٹے ہو
جب میں ضروری مجھوں کی قہر دونوں کو خود سے سب
کچھ قہر دونوں کی سب اس دور ان اب تمہارا مجھ سے یہ
سوال نہیں کرو گے اور نہ اپنی اسطرز کو متاثر نہیں
وہ نہ کرو گے سوا کرو۔“

انہوں نے کچھ بے بسی سے اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

”میں حانا لگا رہی ہوں۔ آجائو جلدی ہے۔
تمہارے زہراموں بھی آچکے ہیں اُنس سے تو کہہ کر
لڑے نکل گئی۔“

”مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“

”میں نے اب وعدہ تو میں نے سنی تو ان پہلے سے کر رہا تھا۔ اب میں وقت پر منح کر دوں تو کتاب رائے گا۔“ وہ دروازہ کھول کر گئی۔

”ایسا یوں سا غمزدی فنکشن سے ایک معمولی فنکشن تو ہے پھر سرسری ہے آپ کر سکیں گی۔“

”یہ بڑھ چنے کا رستہ ہے اور وہاں جا کر مجھے کیا کرنا

غور ہوئی دیر کی تو بات ہے۔ اب میں انہیں منع کر سکتی۔“

بہت خدشی ہیں مام آپ بلا کھڑے آپ کو منع کیا
میں نے بلا کھڑے فون پر بات کرنی تھی۔ اتنے سفر

”اور ہم دعوتِ حق کے فاطمہ بلال کی قابلِ فخر“
 قابلِ تقلید و تالیفِ بلال کو وہ شیخ پر اگر اپنے خیالات
 ہاتھ کر دیں کہ بیٹی کی اتنی شان و کرامت ملی پر ان کے
 ہوا تو کیا ہیں۔“

مرد تو مجھے بھی نہیں سن رہی تھیں ان کی نظریں تو کہیں اور تھیں۔

”جیسے خوشی ہے کہ میری بیوی فاطمہ ہلال نے ہر سال طے طرح اس بار بھی میرا سر فخر سے لوتھا کر رکھا۔ اس کی محبت، تابعداری اور سخاوت مندی کے ساتھ اس کی مسلسل کامیابی کسی بھی ماں کے لیے کسی خوشی سے کم نہیں۔“

ہے اس لئے خدا کے سامنے سوائے شکر کے اور کچھ نہیں کہتا کہ اس نے مجھے سرخرو کر دیا۔ یہ شکر ہے۔
وہ اسی احترام اور بھروسے سے لفظ لفظ بتاتی جا رہی
تھی بھروسے اور احترام سے وہ سارا سچا سچا لگا

اور وہ اپنی خجالت پر سوالوں پر محیط شرمندگی اور
جھجھکاتوں میں جکڑی تھی۔ ایک لفظ بھی انہیں بول
نہیں سکتی۔

کے جسم میں تو جیسے خون کی گردش تک ٹھہر جاتی تھی۔
 وہ ایک نلک کسی پتھر کی طرح اس انسو نے منظر کو
 دیکھے جا رہا تھا۔
 سب کچھ کسی خواب کی طرح تھا۔

ساتھ آنے کی ہائی کین بھری۔ وہ مدت ہوئی اس طرح کی محافل اور مشاغل سے دور بھاگتا رہا تھا مگر آج۔

”فاطمہ بلال سے ٹانویہ کی بیٹی اور میری بہن۔“ اس کی
میں شافی پسینے سے تر ہو گئی۔

”کیونکہ ہم اس پر کوئی حق نہیں دے سکتے ہیں اس کے سامنے کوئی چیز نہیں ہو سکتی تو کوئی نقصا کرنے اس کے گھر کیسے جاتی۔“

”کیا اس طرح واپس آکر آپ کو سکون مل جائے گا؟“
 وہ مضطرب انداز میں بولا۔
 ”نہیں۔“ وہ آنکھیں بند کر کے بولیں۔
 ”بچھام؟“ (ہر طرح سے بے چھم، بھول)

وزیر معالیٰ مائتوں کی۔ اس میں بھی تم میری خود عرصی

سمجھ لو کہ شاید اس طرح میری نفی کو خدا سے معافی مل سکے اور ہماری انا کے بہت... وہاں نے لگیں۔
 ”اے تو! نا اور قد اور ہیں کہ کسی کو دکھ دے کر“
 اذیت پہنچا کر تو ان کا قد بڑھتا ہے مگر جھک کر معافی مانگتے ہیں۔ بلال! مجھ میں حوصلہ نہیں اس کے سامنے جانے کا۔ کس منہ سے جالوں کیا کہوں؟“
 بلال! تم صبر سہا بنی میں کو دیکھتے کیا۔
 کیا اس میں حوصلہ تھا اس کا سامن کرے گا؟
 ”لیکن ہاں۔! فاطمہ۔ میں خود پر بند نہیں باندھ سکوں گم۔“ اور دیر بعد وہ پھر بے چینی سے بولا۔
 ”اس بیماری صورت نے تو مجھے حوصلہ دیا ہے کہ میں ثانیہ کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ سکوں گی۔ ایک بار اسے حقے لگا کر پیار کر لوں، جس کے خیال نے مجھے راتوں کو جگایا ہے۔ وہ میری پوتی میرے بلال کی بیٹی۔ بلال! دیکھا تم نے، کتنی ذہین تھی ایک شوہر ہماری فاطمہ بالکل ثانیہ کی کالی۔ میں تو اسے دیکھتے ہی جیسے مہسوت سی روئی تھی جیسے ثانیہ میرے سامنے آنکھیں ہوتی ہو۔“ وہ ہر جوش انداز میں بولیں۔
 ”چلو بلال! ابھی چلتے ہیں۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ میں ثانیہ سے معافی بھی مانگ لوں گی مگر ایک وعدہ کرو تم مجھ سے؟“
 ”کون سا وعدہ؟“
 ”تم اب ثانیہ کو دکھ دینے والی کوئی بات نہیں کرو گے۔“
 ”کیا مطلب کون سی بات؟“
 ”فاطمہ کو اس سے الگ کرنے کی بات جس طرح اس نے اکیلے اسے پالا ہے اب اگر ہم دونوں اس پر حق جتا میں جو پہلے ہی ہماری وجہ سے اتنی تکلیفیں بھگیل چکی ہے اب اور نہیں بلال!“
 وہ خاموشی میں کود پھتا رہ گیا۔
 ”جہیں معلوم ہے جب تم نے اسے طلاق دی تو میں پوری تین راتیں نہیں سو سکی تھی۔ میں سلیپنگ پلو بیٹی میرا دل غم جو جاتا مگر میری آنکھیں چھپت کھلی رہیں اور ان میں ثانیہ کی شبیہ۔ مجھ

سے سوال کرتی میڈم! آپ تو میری آئینہ میں تصویر۔ آپ نے بھی بلال کو نہیں روکا۔“ وہ ایک دم سے روٹنے لگیں۔
 ”پلیز ہاں!“ وہ ایک دم سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔
 ”صمت رہیں۔ کیا صرف آپ تادم ہیں ساتھ سالوں سے میرے صمیرنے جس طرح مجھے کھا کر کا ہے کاش میں آپ کو اپنے زخم دکھا سکتا صرف آپ کو مزید دکھ اور تکلیف سے بچانے کے لیے ہاں! میں جسے بنا پھر رہا ہوں نہ میرا دل۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر سسکتے لگا۔
 ”اور ہاں! آپ کی شرمندگی کو میں ذرا مل تو نہیں کر سکتا مگر تھوڑا کم ضرور کر سکتا ہوں۔“ دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولا۔
 ”میں نے۔ ثانیہ کو طلاق نہیں دی تھی۔ بلال! جیسے ان کے سین صبر کے اوپر ہم چھوڑا تھا۔“
 ”بلال! تم راق کر رہے ہو میرے ساتھ؟ جانتے ہو میرا دل۔“ انہوں نے بے ساختہ دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر زبردستی حرکت کے ساتھ کہا۔
 ”آج ہی تو جی بول رہا ہوں۔“ وہ بڑھ چلا لیٹے میں بولا۔
 ”اسی لمحے جب میں جذباتیت کے طوفان میں پاگل ہو رہا تھا کہ اگر میرے ہاتھ میں پستول ہوتا تو شاید میں ان دونوں کو شوٹ کر دیتا۔ ہاں! میں نے ابھی صرف یہ الفاظ بولے ثانیہ میں جہیں طلاق۔“
 ”اور تپا ہے کیا ہوا؟“ وہ ذرا لمبی انداز میں رک گیا۔
 ”ایک دم سے کسی شخص نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ کا دیا ڈالا کہ میں اگلا لفظ بول ہی نہیں سکتا۔“
 ”ابھی آپ غصے اور جذبات میں ہیں ابھی آپ کو کچھ سمجھ نہیں سکتے کہ آپ کیا بول رہے ہیں اور یہ طلاق حلال کاموں میں سے خدا کی ناپسندیدہ ترین شے ہے۔ یہ بیک وراثت ہے۔ خود کو اور انہیں تماشہ بنائیں۔“ گھر جا کر ٹھہرے دل سے بہت بار ضرور

سوچیں پھر جو آپ کا دل فیصلہ کرے اسے مذہب انداز میں جیسے ہمیں شریعت کہتی ہے اس طرح سے فیصلہ کیجئے۔

”فہرہ شہر کرونا وہ شخص جلتے ہمارے کون تھا کوئی انسان یا فرشتہ۔“

اور میں تو جیسے تنگ سا ہو گیا وہ اتنا کہہ کر چلا گیا۔ ٹانیہ اور دو جیل والے سے کب گئے مجھے نہیں پتا اور بس وہ دیار مجھے نہیں ملے۔

”اور زونیا نے جو کہا کہ تم نے اسے طلاق دیا وہ شدید سے کہنے میں ہو گئی۔“

”آپ کو ابھی بھی زونیا کی باتوں کا یقین ہے۔ کس طرح اس نے یہ سب بیان کیا اور اس کی اس بات کی تردید میں نے اس لیے نہ کی کہ میں شدید غصے میں تھا۔ اگر ٹانیہ میرے سامنے آج بھی جاتی تو بھی ہمارا میں اسے طلاق ہی دیتا مگر۔ پھر سچ میں اتنے سارے سال آگئے اور زونیا نے بعد میں جس طرح سے خود اقرار کیا۔ اس کے بعد میرا دل مکمل طور پر تو نہیں کافی حد تک ٹانیہ کی طرف سے صاف ہو گیا پھر ایک بار دو جیل مجھے ملا۔ اس کی اندھی بیوی اس کے ساتھ تھی اور وہ جس طرح اس کے ساتھ انوالو تھا۔ مجھے لگا بس قسمت نے مجھے ہی برلا کرنا تھا جو یہ سب کچھ بولا۔ وہ دونوں باتوں میں سر جھک کر بیٹھ گیا۔

”آپ شرمندہ ہیں تو کیا میں اس کا سامنا کر سکتا ہوں؟ کبھی نہیں۔“



”میں آپ نے بھی بتایا نہیں کہ وہ میڈیم فیصلہ ہر آپ کی پریسبل بھی رہ چکی ہیں اور آپ اسی طرح سے پوزیشن ہو لیں وہ چکی ہیں لیکن ایک بات کی مجھے حیرت ہوئی مل! قافلہ اس کے ساتھ ہی لپٹی تھی۔“

”آپ نے ان کے بارے میں اتنا کچھ کہا اور وہ کچھ بولیں ہی نہیں آپ کے بارے میں؟“

”اچھا چھوٹا ان باتوں کو دیکھو شہناز بچن میں کیا

کر رہی ہے۔ اسے کتنا آج کھانا ذرا زیادہ پناے اور تم ذرا اٹھ کر گھر کی حالت تو درست کر لو۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کوئی آ رہا ہے؟“ وہ کچھ حیرانی سے بولی۔

”ابھی سکتا ہے۔ اٹھ جاؤ تم اب۔“ وہ کہہ کر خود بھی باہر نکل گئی۔

شام سے دن کو کی بل چین نہیں تھا۔ وہ فنکشن کے شروع ہی میں فیصلہ ہر اور بلال دونوں کو دیکھ چکی تھی۔

ٹھیک ایک ایسا سوچا ہوا منظر جو ان پچھلے سالوں میں اس کے جانے لے گئی بار سوچا تھا اگر وہ زندگی میں دوبارہ بھی ان سے ملے تو کس طرح اور ہر بار اسے قافلہ اور عبیدہ کی وسیلہ بننے نظر آتے۔ خدیجہ نے اپنی زندگی میں کئی بار کوشش کی کہ وہ دوبارہ ان سے رابطہ کر لیں مگر ٹانیہ نے سختی سے منع کر دیا۔

”ہوش سے وہ جس جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر نکلی تھی کسی بھی حادثے کا جو جانا نامکن نہیں تھا۔ مگر جانے کیسے وہ رباب کے گھر پہنچ گئی۔

دونوں وہ شدید بخاری حالت میں پھنکتی رہی۔ اس نے رباب کو قسمیں دے کر منع کیا کہ ان لوگوں کو بالکل نہ متائے۔

خدیجہ کو فون کر کے اس نے وہیں بلوایا جو بچی کی حالت دیکھ کر فیصلہ کو ٹھیک ٹھاک سنانا چاہتی تھیں مگر ٹانیہ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

پھر دونوں ملتان چلی آئیں۔

بست دونوں بعد فیصلہ کا فون کیا تو خدیجہ نے صاف انکار کر دیا کہ ٹانیہ ان کی طرف آئی ہے۔

اور پھر دن گزرتے چلے گئے۔ دن پھر بلال کو بھلا کر زندگی کو ایک چیلنج سمجھ کر گزارنے لگی۔

دونوں بچوں کی پیدائش اور پھر رابوٹ حاصل تعلیم کا سلسلہ۔ اپنی مصروفیت کہ اسے ان ایلیمینٹری سکول کے بارے میں سوچنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔ آج۔۔۔ ان تو جیسے زخموں کے ٹائٹلے اوپر گئے تھے۔

پر آگے میں اندھیرے میں کھڑی ان اذیت ناک لڑکیوں کو یاد کر رہی تھی جب گیٹ پر کسی گاڑی کی لائٹیں چمکیں۔

”تو آگے چلاں آپ! اس امید پر کہ میں آپ کو معاف کر دوں گی۔ ہرگز نہیں۔ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں جب ضرورت تھی تم نے کس طرح دوسروں کے کہنے میں آکر مجھے رسوا کیا تو اب کیوں؟“ وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ باہر مسلسل گاڑی کا باران بج رہا تھا۔



فاطمہ اور عبیدہ کے لیے یہ کتنے حیران کن لمحے تھے۔ مگر اس سے بھی زیادہ بلال اور فیصلہ کے لیے تھے۔ فاطمہ کے ساتھ بیٹھے معصوم صورت لنگے قد والے چھوٹے بلال کو دیکھ کر دونوں ششود سے رہ گئے۔

ایک ناقابل یقین حقیقت اور فیصلہ تو دونوں کو دیوانہ وار چمکتے ہوئے بس روئے جارہی تھی۔

”اللہ نے مجھے اتنی باری تعین دیں۔ ایسے مگر ایسے نکل اور میں بد نصیب تھا تو میں وہاںوں سے نکریں ماری رہی۔ میرے بچے میری جان! وہ تو بالکل جیسے اپنے خواہوں میں نہیں تھیں۔ ٹانیہ بے تاثر چہرے لیے ملازمہ کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

بلال صوفے پر بیٹھا صرف اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ”بلال! اوہ تو کوئی کھانا دونوں کو نہیں یاد ہے بلکہ تمہاری وہ اسکل ڈیز کی تصویریں۔ بالکل اتنی قدر تھا تمہارا یہی صورت ایسی آئینیں تھیں چہو۔ میرے اندامیں کیسے تیرا شہزادہ کروں مجھ کو گارگو۔“ وہ ایک دم سے دونوں کو چھوڑ کر ٹانیہ کے سامنے آ کھڑی ہو گئی۔

”ٹانیہ! میں جانتی ہوں میں معافی کے قابل نہیں اور مجھے مانگنی بھی نہیں چاہیے مگر ان دونوں کے لیے تو اگر تم کو تو میں تمہارے چہرے بھی پکڑ سکتی ہوں۔ مجھے

معاف کر دو گی تاہم؟“ ان کے لیے جس کیسی حسرت تھی اتنی اجاسی تھی۔

ٹانیہ جو پھر دل کیے فیصلہ کیے ہوئی تھی کہ کسی صورت میں ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کرنی جیسے ان کے سامنے موم کی طرح پگھل کر رہ گئی۔ ”آپ تو ایسی باتیں نہیں کریں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”مجھے ہی تو یہ سب کہنا ہے۔ میرا ہی تو سارا قصور تھا۔ میں ہی تو سزاوار ہوں۔ اونچے بول پر حائلے والی کی دکان پر کیسا اٹھایا سو! میں تمہارے سامنے تو شرمندہ ہوں ہی اپنے خدا کے سامنے بھی نہیں کھڑی ہو سکتی۔ مجھے معاف کر دو۔“ وہ بے اختیار ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

”یوں نہ کریں پلیر میں کسی کو کیا معاف کر دوں گی۔ میں تو خود کھانا کھا رہا ہے میں نے۔ پلیر آجا میر۔“ وہ مڑ کر جانے لگی۔

”ٹانیہ! یوں نہیں کر دو میرے ساتھ۔ میرا دل تو پہلے ہی اس شرمندگی اور پچھتاوے سے ختم ہو چکا ہے۔ اگر تم بھی منہ پھیر کر چل دیں مجھے معاف نہ کیا تو۔“ وہ گڑگڑا کر بولیں۔

”میں نے آپ کو معاف کیا۔“ وہ خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد آہستہ سے بولی اور اندر چلی گئی۔ ”ہلم کا حوصلہ بہت بدلتے مگر میں بہت کمزور ہوں۔

اور شاید ابتر ست بھی اپنے بچوں کے سامنے اپنی ماں کے سامنے جس طرح تمہارے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گا۔ شاید میری موائی میری انا کو جوت لگتی مگر یقین جانا وہاں میں خود کو معاف نہیں کر سکتا تب تک میں سب کے سامنے تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی نہ مانگ لوں جس طرح میں نے تمہیں سب کے سچ رسوا کیا اسی طرح تمہیں سرخرو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اندھیرے میں صرف بلال کی آواز تھی۔

”آپ کیا چاہتے ہیں مجھے اس نے کوئی پروکار نہیں اور آپ مجھے کیا سرخرو کریں گے۔ میرا خدا مجھے سرخرو کرنے والا ہے۔ میرا دامن کل بھی صاف تھا۔

آج بھی مجھے کوئی عداوت ہے نہ بچھڑاؤ۔
اور آپ شاید بھول گئے ہیں جب میں اتنے سال
آجائیں تو پھر جدائی کی بجائے بن جایا کرتی ہے جسے صرف
محانی نہیں بات سکتی۔

بچے آپ کے ہیں۔ آپ جب چاہیں ان سے ملنے
آسکتے ہیں۔ وہ کہہ کر تیزی سے اندر جانے لگی۔
”ماں! میرا قصور یہ ہے کہ میں جانتا ہوں تمہارا دل
میرے قصور سے بھی زیادہ بڑا ہے پلیرا بڑا ہے اور تمہیں
یہ جدائی نہ پہنچے ہے نہ پہاڑ۔ جس طرح میرے
جدیدوں نے تمہیں پہلے جیتا تھا۔ آج بھی تمہارے دل۔“

”بس کر دیں۔ آپ کے خیال میں میں ابھی بھی
وہی احمق ٹانیہ ہوں پھر آپ کے چند جذباتی مکالموں
اور جھوٹے وعدوں کے پھول میں۔“
”کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا میں نے۔ تم سے کیے ہر
وعدے کو بھلیا مگر میری قسمت۔ کاش!“
”آپ دلستہ کرنا چاہتے ہیں تو رک جائیں مگر۔“
کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور بلال بے بس سا
کھڑا رہ گیا۔



آنے والی رات اس کی زندگی میں پہلے آنے والی
بہت سی مشکل راتوں سے بھی دشوار تھی۔ اس نے
پہلے کبھی اس بات کو نہیں سوچا تھا کہ اگر بلال پھر سے
اس کے راستے میں آکھڑا ہو گا اور وہ بھی اس شرمندگی
کے ساتھ تو وہ کیا فیصلہ کرے گی؟

اور آج ان لمحوں میں اسے لگ رہا تھا یہ دل تو کبھی
اس بے وفا کے خلاف ہوا ہی نہیں۔ یوں جیسے وہ مدت
پہلے سے شکر تھا کہ وہ آجائے گا اور سب کچھ پہلے جیسا
—

”پہلے جیسا۔“ اس کے دل سے سسکی سی نکلی۔
”جیتے دنوں کا خیال ایک کاٹا تھا جو اس کے دل میں کڑا تھا
اکہرو مسلسل!“

”ماں! آپ نے ہم سے کیوں چھپایا؟ ہماری رادھی

ایک عظیم درگاہ کی پریشانیوں میں ہیں۔ ایک شاندار
عورت اور ہمارے بابا۔ ماں آپ دونوں کی جوڑی تو
اتنی پینڈ سم اتنی خوب صورت میرے سارے فریڈ
جیلس ہو جائیں گے۔“

وہ دونوں باپ اور رادھی کو دیکھ کر جس طرح سے
ایک ساتھ ہوئے تھے اور انہیں دیکھتے ہی جس طرح
توہمت انہوں نے فوراً ”پاندھی“ تھیں۔ کیا وہ کوئی حقیقی
فیصلہ کر سکتی گی۔

”ہماری رادھی ایک عظیم درگاہ۔“ کیا چاہتا ہوا
جملہ تھا جو فاطمہ کے منہ سے بے اختیار ہی نکلا تھا۔ کیا
مجھے اس عظیم درگاہ کا بھید کھولنا چاہیے اس چور چور
ہوئے آئینہ کی پیچھے جو چھپنے لگا۔

نہیں کبھی نہیں۔ میرے بچے کبھی عمول میں ہی
شک کرنا کبھی جائیں گے۔ زندگی کے سارے اچھے
روشن رنگوں سے بدگمان ہو جائیں گے۔ ہر اچھے
چہرے کے پیچھے ایسا نوناہا بیت تلخ تھیں گے۔ وہ کبھی
اچھا اور شہت نہیں سوچ سکیں گے اور آج کے بعد یہ
دونوں کبھی کسی کو آئینہ نہیں بٹائیں گے۔ اگر وہ رادھی
اور بابا جیسے چہرے بھی اندر سے بد نما نہ تھے۔“

سوچ کا ایک نیا دور اس کے اندر کھلا تھا۔
”یہ دونوں ابھی تربیت کے کچے دور میں ہیں۔
میرے غمے اور نفرت کی تیز ہولناکی ان رشتوں کو
تو ختم کرے گی ان کی شکلیں بھی مسخ کر دے گی۔“ وہ
بری طرح سے بے چین ہو گئی تھی۔

”اب رادھی ہمارے پاس رہیں گی ماں! اور بلال
بھی؟“ فاطمہ قوی الفاظ پر اقرار چاہتی تھی جیسے سچ کے
سال آئے ہی نہیں تھے۔
”پاگل! ہم ان کے ساتھ جا کر رہیں گے۔ ہے ناں! آ
عید عیش مندی سے بولا۔

”تو پہلے کیوں نہیں رچتے تھے؟“ فاطمہ پرسوز
نظروں سے ماں کو دیکھ کر بولی۔
”ماں! یہ دونوں آپ سے کیوں ناراض تھے؟“ اور
ٹانیہ لڑ جواب ی ہوئی۔
”کاش یہ سامنے چند سال بعد ہو گیا چند سال پہلے تو

شاید ان دونوں کو ہینڈل کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔“
اس کا اپنا قصہ ”نفرت“ میں برسرے گئے تھے۔ اب
ساری فکر صرف ان کے بارے میں تھی۔
”یا اللہ! میں کس دور اپنے پر آگئی ہوں؟“ وہ سر پکڑ
کر بیٹھ گئی۔

”مجھے کچھ تاہم چاہیے۔“ بلال کے چوتھی بار آنے
پر وہ سجدہ کی سے بولی۔
”کتنی تاہم؟“ وہ بے صبری سے بولا۔
”مجھے نہیں پتا لیکن اتنی جلدی نہیں۔“ وہ عجیب
الجھن میں تھی۔

”میں جانتا تھا۔“ وہ مگر اسانس لے کر بولا۔
”یہ فیصلہ یقیناً“ آسان نہیں اور میں تمہارے
ساتھ زندگی گزارنا بھی نہیں چاہتا۔ پہلے بھی زندگی کر
چکا اور نتیجہ۔ یہ بہتر ہے تم سوچو! اس بار فیصلہ تم
کوئی اور مجھے سرخسہ کانا ہو گا۔“

”خواہ یہ فیصلہ الگ ہو جائے کافی کیوں نہ ہو؟“ وہ
جلدی سے بولی۔
”مجھے یقین ہے تم ایسا فیصلہ نہیں کرو گی۔“ وہ یقین
سے بولا۔
وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”وہ جدائی تو شاید ہماری قسمت میں لکھی تھی۔
اسے تو ہم دونوں نہیں مٹا سکتے تھے مگر آئندہ اگر ایسا کچھ
ہونا ہو ابھی تو مجھے یقین ہے ہمارے بچے نہیں ہونے
دیں گے۔

اور ابھی تو مجھے تمہارا شکریہ ہے۔ لیکن کس کس
بات کا کروں گا۔ یہ خوب صورت تھے متحد تو تم بھی
تھیں اور میں قدر نہ کر سکا۔ لیکن ایسا چر بار تو نہیں
ہوتا۔ اگر ان سالوں میں تم نے بہت کچھ سیکھا ہے، سنا
ہے تو ٹانیہ! میں نے بھی بہت کچھ برواشت کیا ہے۔
خود اپنے آپ سے نفرت بھی کی ہے کہ میرا اسکی چہرہ
کتنا شرمناک تھا کہ میں نے دوسروں کی آنکھوں سے
دیکھا اور دوسروں کے کانوں سے سنا مجھے اپنی محبت پر
خود پر بھروسہ نہیں تھا۔“ وہ ہر حال لیجے میں نکل رہا تھا۔
”تم نے اگر وقت مانگا ہے تو اس وقت کی ضرورت

تو مجھے بھی ہے شاید توڑی سی مہلت ہمیں ایک
دوسرے کے اور قریب لے آئے۔“ وہ گہری نظروں
سے اسے دیکھ کر بولا۔
ٹانیہ نے نظریں جھکا لیں۔

”میں بچوں کو کھڑے کر جا رہا ہوں، ہمانے بلوایا
ہے۔ انہیں اپنا گھر تو دیکھنا چاہیے۔ تمہیں کوئی
اعتراض تو نہیں؟“
اور وہ انکار نہ کر سکی۔

بلال ان دونوں کو لے کر چلا گیا اور وہ برآمدے میں
کھڑی دیکھتی رہی۔
ابھی اسے اپنے اندر بہت سا حوصلہ پیدا کرنا تھا۔

ایک بار پھر پچھلی زندگی میں واپس جانے کے لیے۔
لوگوں کی زندگی آگے چلتی ہے اس کی زندگی پیچھے جاتا
چلو رہی تھی۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا مگر وہ جانتی تھی
اسے یہ کرنا ہی ہو گا۔ اپنے لیے نہ بھی سہی۔ ان دونوں
کے لیے جو شاید اب ان دونوں کی آرزوؤں کا محور
تھے وہ قدرے مطمئن سی اندوہ میں گئی۔

37

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دل دادیں

ثمرہ بخاری

قیمت --- / 350 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی۔

انگلی کے درد

کلج سے واپس پر وہی روزانہ کی ہڑبگ استری اسٹینڈ کے پاس لگی ہوئی کارڈرو میں دو تین لوگ فیل کے پاس کپڑے اٹھائے انتظار میں کھڑے ہوتے۔

”فرقی! صبح یونیفارم پہنچ کر سنے کے بعد کپڑوں پر استری پھیر لیا کرو۔ کم از کم بندہ وہاں انتظار کی کوفت سے بچ سکتا ہے۔“

ایک روز درخت نے اسے مشورہ دیا تھا۔ اور واقعی اس نے رفعت کے مشورے پر عمل کیا دوست آسانی ہو گئی تھی۔ واپس آکر آرام سے کپڑے تبدیل کیے اور بچن میں آگئی تھی۔ اتفاق سے رفعت بھی اسی وقت ڈانٹ بھیل پر اپنا کھانا لے کر آئی تھی۔ دونوں آنے سے پہلے کھانا کھانے لگیں۔ اور بالکل پستکی گپ شب کے درمیان دوستی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اسے باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی عادت نہ تھی۔ مگر رفعت کبھی نماز قضا نہ ہونے دیتی۔ سو اس کے ساتھ رہ کر فرج کی نماز پڑھنے کی روٹین بننے ہوئی چلی گئی۔

کلج سے واپس آکر وہ دونوں اکٹھے کھانا کھا کر منہ کی نماز پڑھ کر کورس کی کتابیں لیتیں اور باہمی بلڈنگ کے سامنے وسیع و عریض گراؤنڈ کے افتتاح پر کوریڈور کے ہلیں سے ٹیک لگائے آئے سامنے بیٹھ جاتیں۔ وقفے وقفے سے گپ شپ اور پرحالی کا سلسلہ جاری رہتا۔

”بھی بچو اچانے تیار ہو گئی ہے۔“

وعوب زمین سے نظریں چرائے دیواروں پر اترتا شروع ہوئی اور آیا امان کی بیکارستانی دیتی تو وہ دونوں بھی اٹھ کر کمرے میں آجائیں چھوٹے موٹے کلم بنائیں، مخصوص لگی بندھی روٹین کے مطابق رفعت جلدی ہونے پر اصرار کرتی کہ اسے صبح نماز کے لیے جلدی اٹھنے کی فکر ہوتی تھی۔

”میزم السلام علیکم! کلج کے لیے تیاری کی ہلاکار بنی تھی۔ جب وارنن میڈم عقلی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔“

”و علیکم السلام۔ ایک نئی اسٹوڈنٹ مائیکسٹ ہو کر آئی ہیں ہاشم میں رہتا تھا جی۔ میرا خیال ہے آپ لوگوں کے روم میں جگہ نکل سکتی ہے۔“

سلام کا جواب دے کر انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تھا۔ اور پھر پھر تک نئی اسٹوڈنٹ آگئی تھی۔ پراؤن آکھوں اور گولڈن ہالوں والی اسٹارٹ اور دلی تھی زاریہ احمد اپنے مقابل کو متاثر کر دینے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتی تھی، کم از کم فرج کو تو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ چونکہ ارے اس کی چارپائی اور بستر کمرے میں لا کر رکھا تو زاریہ اپنے روم سے بندھے ہوئے بستر کو کھولے بغیر اس کے اوپر چوڑی مار کر بیٹھ گئی اور کمرے میں موجود لوگوں کا انہیں پوچھنے لگی تھی۔ اس کے انداز میں کسی بھی جھجکا کا معمول سا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ بڑے ہی اعتماد سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے نہ جانے کب سے یہاں آکر رہ رہی ہوگا۔

ان لوگوں کی پرانی واقف کار ہو، قرح اس کے انداز و الطوار سے دل ہی دل میں متاثر ہوتی رہی۔

”ہیکس کھوڑی! آپ لوگوں میں سے کون میرے ساتھ واک کرے گا؟“ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر کمرے میں آتے ہی زاریہ نے سب کو مخاطب کیا تھا۔

”آپ چلیں گی؟“ اس نے اپنا روئے سخن فرج کی طرف موڑا تو قرح کی دلی مراد یہ آئی تھی۔ یوں زاریہ نے اسے دوستی کا اعزاز بخش دیا تھا۔

”کیا بات ہے فرجی! تم مجھ سے ناراض ہو، میری کوئی بات بری تھی؟“ چند روز بعد جب وہ ہستی ہستانی زاریہ کے ساتھ کمرے میں آئی اور زاریہ واش وائش لگی تو رفعت نے موقع کیا کر اس سے پوچھا تھا۔

”میں تو دراصل زاریہ کے ساتھ ٹائم گزرنے کا پتا نہیں چلتا، اس لیے تمہیں ایسا مل ہو رہا ہے۔“ رفعت کے ساتھ چرے پر اٹھنا اتر آیا تھا۔ پھر فرج کو کبھی رفعت کو کبھی دینے کا وقت نہ ملا۔ البتہ زاریہ کے ساتھ رہتے ہوئے وہ بائیل کی ڈل لائف کو بے حد انجوائے کرنے لگی تھی۔ ”اف رفعت جیسی بوڑھی روح کے ساتھ۔“ اس نے چند روز بعد خود ہی سوچا تھا۔

بائیل کے رولز کا کبڑا کرتے ہوئے mp تھوڑی کے ساتھ ہینڈ فون لگا کر گانے سننا کورس کی کتابوں میں چھپا کر فلمی میگزین پڑھنا، واش روم میں جا کر زاریہ کے فون میٹ پر کھڑی ہونا، یہ چھوٹے موٹے ایڈجسٹ انجوائے کرنے میں فرج کا خیال تھا کوئی برائی بھی نہیں تھی۔

مگر ایک بات جو اسے بے حد ناگوار گزرتی وہ زاریہ کا لونی سے ٹھنڈی فون پر بات چیت کرنا تھا۔ اور پھر وہ اس قدر منہ پھٹ تھی کہ دھڑلے سے اپنے فانیسی کی گپ شپ تمام لوگوں کو سنائی، اگرچہ اس کے پاس فون کی موجودگی کا علم صرف فرج کو ہی تھا کیونکہ شام کا انداز چھیلنے کے بعد زاریہ اسے لے کر لان کے فیسٹا“ ٹارکس گوشے میں آجاتی اور قرح کو بطور



سنتی کچھ دور کھڑا کر دیتی کہ اگر کوئی اس طرف آئے تو وہ زاریہ کو فوراً مطلع کر دے۔

زاریہ کی شخصیت کے اس ناگوار پہلو کے باوجود فرج کو رفعت کے ساتھ اپنی سابقہ دوستی پر حیرت ہوتی تھی۔ رفعت جسے بائیل کا مولوی صاحب کہا جاتا تھا اور کمال زاریہ جیسی ذمہ دار دوست۔

”میزم! مجھے سوٹ سلائی کے لیے دینا ہے۔“ وہ میڈم عقلی سے اپنا مسئلہ بیان کر رہی تھی، کلج میں ویلم ہائی کی تیاریاں جوش و خروش سے ہو رہی تھیں فرج کو ایک اینڈر گرس کی تواری سے کہہ کر سوٹ منگووا لیا تھا مگر سلائی کا ٹائم نہیں تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے بازار سے کچھ چیزیں لینی ہیں۔ تو آپ بھی ساتھ چلیے گا۔ کسی ٹیکس کو دے دیں گے۔“ میڈم کے کہنے پر فرح نے سکون کا سانس لیا تھا۔

”اپنی کسی دوست کو ساتھ لے کر جائیں اور جلدی سے سوٹ لے کر واپس آجائیے گا۔“ چند روز بعد سوٹ کی واپسی کے لیے اجازت مانگنے پر میڈم عظمیٰ نے کہا تھا۔

دروزی کی دکان پر لگے اپنے قیمتی سوٹ کا حشر تو دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ٹیکس کو خوب منائے مگر اس کی نظریں اور انداز تجلے میڈم عظمیٰ کے ساتھ آتی تھی تو اچھا بھلا بندہ لگ رہا تھا۔ مگر اب۔۔۔

”دیکھیں اصل میں میرا شمار دسے نا اس نے آپ کا سوٹ سلائی کیا ہے ابھی اس کے ہاتھ میں اتنی مقالی نہیں ہے اس کے ٹھوڑی سی لڑبڑ ہو گئی۔ مگر اصل آپ جیتیں۔ میں آپ کے لیے چائے منگوا رہا ہوں۔“

”مگر سوٹ تو بالکل بے کار کر کے رکھ دیا ہے آپ کے شاگردو محترم نے۔“ فرح نے چنچا چاکر کہا تھا۔ جیسے شاگردو اس کے دانشوروں کے نیچے ہی تھوہو۔

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں میں کوئی آن پڑھ توڑی ہوں۔ میں نے ایف ایس سی کیا ہوا ہے۔ میں ہزار روپے روزانہ نہ کماتوں تو میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بات سے بات نکال کر ان پر کیا واضح کرنا چاہ رہا تھا۔ فرح جی جی پریشان ہو گئی تھی جبکہ زاریہ اس کی باتوں پر کھلکھلا رہی تھی۔

”آپ پلیز“ آئندہ بھی حضور آئیے گا۔ آپ کو میری قسم میں آپ کو مفت میں سوٹ سلائی کر کے دوں گا۔“

تمہاری جان ہمیں کب سے عزیز ہونے لگی؟ فرح نے سوچا تھا۔

جبکہ زاریہ کی کھلکھلا ہٹ تقویوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اطمینان سے یوں بیٹھ گئی جیسے اگلے

کئی گھنٹوں تک اٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔ فرح نے سلائی کے پیسے منیجر پر پٹے اور زاریہ کا ہاتھ پکڑ کر چھینچھین دکان سے باہر آئی۔

”ارے آئیں تو ارے ابھی چائے آرہی ہے۔ آپ لوگ۔۔۔“ اس نے ٹیکس کی پکار کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔

”یار انداز کر سکتی تو سی۔ تمہارا وہ کرم فرما جائے گا آؤ روے چکا تھا۔“

فرح نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ ایک تو اسے سوٹ خراب ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ دوسرے اس ٹیکس کا انداز۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی پیچینی لگو اسے۔

گیٹ سے اندر داخل ہوئیں تو میڈم عظمیٰ جو صوب میں کرسی رکھے لوگوں کے ساتھ بیٹھیں لگا رہی تھیں۔ فرح سلام کرتی اندر چلی گئی جبکہ زاریہ وہیں بیٹھ گئی تھی۔

”فرح! ذرا میری بات سننا۔“ شرم کے کھانے سے ٹھوڑی دیر پہلے رفعت اسے بلا کر کمر آؤند میں لے آئی تھی۔

”ہاں کیا بات ہے؟“

”یہ ٹیکس کے ہاں کیا چکر ہوا ہے تمہارا؟“ رفعت انتہائی سنجیدگی سے دریافت کر رہی تھی۔

”کیا مطلب؟ کیا چکر؟“ اس نے انتہائی اچنبھے سے پوچھا تھا۔

”زاریہ نے واپس آکر میڈم کو ہنس ہنس کر بتایا ہے کہ وہ ٹیکس کو براؤن رنگ سے دھوا تھا فرح کے ساتھ بیڑی آؤند شافرس دے رہا تھا میڈم کا منہ اوتا خراب ہے کہ وہ کہہ رہی تھیں کہ آئندہ کسی لڑکی کو یوں بازار نہیں جائے دیں گی۔“

”یہ سب زاریہ نے بتایا ہے میڈم کو؟“ فرح کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ اسے تو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”تو اور کون کیا تھا تمہارے ساتھ جو یہ سب کہے گا۔“

اور اس وقت میڈم کے پاس دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اب جو تمہارے بارے میں چہ میگوئیں ہوں گی ہاں میں۔۔۔

رفعت کے خدشات بالکل درست تھے۔ فرح کے قدموں سے زمین کھٹکنے لگی تھی۔

”میں بات کرتی ہوں اس زاریہ کی بچی سے۔“ وہ انتہائی غصے میں واپس بیٹھ گئی۔

”پگل ہوئی ہو۔ مزید اپنا تمنا نہ آؤں گی۔“ رفعت نے اس کا بازو پکڑ کر سختی سے روکا تھا۔

”مگر رفعت۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو پہلے دفعہ اس ٹیکس کی دکان پر میڈم کے ساتھ گئی تھی۔ اور اس نے میرے سوٹ کا ستریاں کر دیا مگر وہ ہم اسی لڑکیوں کو دیکھ کر شوخا ہو رہا تھا۔“ فضل فضل باتیں کر رہا تھا تو میڈم سلائی کے پیسے پھینک کر جلدی سے نکل گئی۔

”زاریہ تو خود ہی دیکھ رہی تھی اس کی باتوں پر مجھے تو اتنا اور غم ہوا تھا۔“ فرح نے رفعت کو ساری تفصیل بتائی تھی۔

”مجھے خود لگا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے مگر جسے کبھی اپنی عزت کا پاس نہ ہو رہا ہو۔ وہ دوسرے کی عزت کا خیال کیوں رکھے گا۔ میرا خیال ہے اس پوزیشن میں تمہیں میڈم کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنی چاہیے۔“

”مگر کیسے؟“

”تم میڈم عظمیٰ کے پاس جا کر یہ تمام تفصیل انہیں بتاؤ اور زاریہ کے رویے کے متعلق بھی۔“ رفعت نے چند سیکنڈوں کے بعد فرح کو سوجا تھا۔ ”اور اس نے ٹیکس کے بارے کہ وہ زاریہ کو سمجھائیں کہ لڑکیوں کو یوں ہنس کر کسی کی بات پر رسپانس نہیں دینا چاہیے۔“

”بچے! دیکھو تو اس زاریہ نے بات کو کتنا غلط رنگ دیا ہے۔ کتنے بگڑے ہوئے لوگ سوسائٹی میں نظر آتے ہیں۔ ابھی پچیس سال کی بات ہے ہم بچک چ

”بچے! دیکھو تو اس زاریہ نے بات کو کتنا غلط رنگ دیا ہے۔ کتنے بگڑے ہوئے لوگ سوسائٹی میں نظر آتے ہیں۔ ابھی پچیس سال کی بات ہے ہم بچک چ

کئے تو مری میں لفتوں کا پورا گروہ بچوں پر آوازیں کئے لگاؤں میں نے اور میڈم فیاض نے پولیس کو کال کرنے کی دھمکی دی تب نہیں جا کر وہ دفینکر ہوئے۔ اب یوں تھوڑا کرتے ہیں کہ اپنی دوستوں کے کردار پر کچھ اچھا نشانہ شروع کر دیں۔ اور اس زاریہ کو تو میں بلا کر سمجھا رہی ہوں۔ پہلے اپنا طریقہ کار تو درست کرے۔ خود میاں فضیلت اور دوسروں کو نصیحت۔“

اگرچہ میڈم کی نظروں میں اس کی پوزیشن کلیئر ہو گئی تھی۔ مگر دل پر بوجھ آن رہا تھا اس نے رفعت جیسی مخلص ہمدرد اور شریف لڑکی کو یو ڈی قرار دے کر اس کی دوستی کو مسترد کر دیا تھا۔ اور زاریہ جیسی چمک چمک چمک کے ساتھ کو باعث افتخار جانا تھا۔ زاریہ جس کا اپنا نہ کوئی کردار تھا اور نہ ہی عزت۔ سو وہ اسے بھی منہوں میں بے توقیر کرتے چلی گئی اگرچہ رفعت اس کو درست راستہ نہ دکھائی تو۔

”اننگ ننگ ننگ پر تم صدمہ فرح سوچے جا رہی تھی۔ تمام لوگوں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمروں میں جا رہی تھیں۔“

”سو فرح! میں نے ذرا نوٹی سے بات کرتی ہے۔ آؤنا پچھلے لان میں چلتے ہیں۔“ زاریہ اپنی کرسی سے اٹھ کر پاس آئی تھی۔

”رفعت! کہاں جا رہی ہو؟“ فرح نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے رفعت سے پوچھا تھا۔

”وٹو کر کے ڈراما دیکھنے سے پہلے نماز پڑھ لوں ورنہ تو تیرا حملہ کر دیتی ہے۔“

”تھو نہیں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ فرح اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔

اب اس نے اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ زاریہ نے چند لمحے حیران پڑیشن ہو کر اس کے بدلے ہوئے روپ کے بارے میں سوچا اور پھر کندھے اچکا کر آیا اداں کی طرف متوجہ ہو گئی جو اسے میڈم عظمیٰ کا بلاوا دینے آئی تھی۔

دُستی کا طائر

خوابِ کبھی

میں نے اسے دس یا شاید گیارہ سال بعد دیکھا تھا۔
تھوڑی سی وقت کے بعد اسے پہچان بھی لیا تھا وہ ابھر
ہی تھی بہت بدل گئی تھی مگر پھر بھی میں اسے پہچان گئی
تھی اس کا سالو لا رنگ کافی حد تک صاف ہو گیا تھا۔
پہلے اس کا چہرہ مہاسوں سے بھرا رہتا تھا مگر اب اس کی
چہرہ بالکل صاف تھی آہستہ آہستہ سوکھا ہوا جسم بھی بھرا
بھرا سا تھا۔ دس سال پہلے جس ابھر کو میں جانتی تھی وہ
آج کی ابھر سے بہت مختلف سی تھی میں بخور اسے دیکھ

تاکر فیل



دی تھی اور شاید میری نظروں کا کارنگاز محسوس کر کے ہی اس نے بھی میری جانب دیکھا تھا۔

"بیلا! اس کے ہونٹوں سے لٹکاؤ میری محبت بھی لٹکی وہ بے تابی سے میری طرف آئی اور یکدم ہی میرے گلے لگ گئی۔

"دوکانی بھلا! بیلا تم۔ تم بیلا ہی ہو نا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھے برسوں بعد تمہیں دیکھا ہے۔" وہ مجھ سے الگ ہو کر اب جتنی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ تم بہت بدل گئی ہو مجھے تمہیں پہچاننے میں چند منٹ لگے تھے۔"

"مگر میں نے تمہیں فوراً پہچان لیا" فکی کی ویسی ہوا گنش اور نازک گزرا جیسی۔"

ہم دونوں وہیں اس گشت شب کے اندر کھڑے تھے میری بیٹی کی برتھ ڈے آنے والی تھی میں اس کے لیے تحفہ لینے یہاں آئی تھی میرے ہاتھ میں رسپ کیا ہوا گشت تھا امیر بھی شاید اسی لیے آئی تھی اس نے بھی دو تین شاہزادہ ہمارے گھر تھے۔

"تمہاری شاہزادہ کھیلٹ ہو گئی یا ابھی کچھ اور لینا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بس میں فاس ہو گئی ہوں۔"

"اوکے۔ مجھے بھی اب کچھ نہیں خریدنا چلو چل کر کس بیٹے ہیں کافی بھی بچیں گے اور ساتھ میں ڈھیر ساری باتیں بھی ہوں گی تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟" وہ چلتے چلتے رک کر پوچھنے لگی۔

"نہیں ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں وہ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے اور تم؟"

"میں۔ میں بھی ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔" وہ کہہ کر ایک دم زور سے فکس ہوئی میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو ہنستے ہنستے ہوئی "سمجھا کرو نا یا ریشو ہر طور شو فرمیں کوئی خاص فرق تو نہیں ہے نا اور میرے شو ہر تو خوشی خوشی میرا شو فرمیں کے لیے تیار رہتے ہیں سو میں بھی ان کی اس پیش کش سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہوں۔" اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی

مسکراہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بھرپور شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے۔

"تو شادی ہو گئی تمہاری؟" میرے پوچھنے پر وہ ایک لمحے کو رک کر پھر بولی۔

"ہاں ہو گئی تھوڑی دیر سے ہوئی مگر ہو گئی حالانکہ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ کوئی مجھ سے بھی شادی کرنے والا ہو گا مگر مجھ جیسی لڑکیوں کے بھی گھر میں جلتے ہیں اور محبت جس پر شاید ہمارا حق بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی بارش کی طرح برستی ہے اور جل تھل کر جاتی ہے بس کچھ عرصہ میری شکل ایسی ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ وار چاہے مگر میرے نصیب کی بارش ہے جو مجھ پر دن رات برستی ہے اور مجھے شہر اور کیے رکھتی ہے۔"

پتا نہیں وہ مجھے جتنا دی تھی یا مجھے ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

"چلو چھوڑو تم یہ دو کھیں ہوتی ہو آج کل سنا تھا شادی کے بعد جتنی ملتی کئی ہوا اب بھی وہیں ہوتی ہو یا پاکستان شفٹ ہو گئی ہو؟"

"وہیں رہتی ہوں بچوں کی چٹھیاں تمہیں اس لیے یہاں آئی ہوئی ہوں بس ایک ہفتہ اور ہوں پھر واپس چلی جاؤں گی" تمہیں سچے ہیں میرے حال کا تمہاری پیش گوئی کے حساب سے میرے سات سب سے ہونے چاہیے تھے مگر میں نے میرے بیٹے کی پیدائش کے بعد آپریشن کروا لیا تھا اب بھی تمہیں اس پیش گوئی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔" نہ چاہتے ہوئے میرا لہجہ ٹھنکا ہو گیا۔

"ارے نہیں یار۔ وہ تو غم غلہ کرنے کے بہانے تھے اب کوئی غم ہی نہیں ہے۔"

"کتنا جھوٹ بولتی ہیں امیر تم۔ کالج کی ساری لڑکیوں کو تم نے اپنے پیچھے لگا رکھا تھا مجھے تب بھی تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا تھا تمہیں یاد ہے ان دنوں مجھے کتنا غصہ آتا تھا لڑکیوں کی بے وقوفیوں پر جو تمہارے اور گرد پروانوں کی طرح منڈلاتی رہتی

تھیں۔"

"اچھی طرح سے یاد ہے میں بھلا کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ دن کوئی بھلانے والے دن تھے بھلا۔ آج بھی ان دنوں گویا وہی ہوں تو ایک عجیب سی کک اٹھتی ہے دل میں۔" وہ ٹھنڈی سی سانس بھر کر بولی۔

باتیں کرتے کرتے ہم پارک ایریا میں پہنچ چکے تھے اس نے پارکوں طرف نظر گھمائی اور۔ اور بلیک ٹکری کو لائی طرف اشارہ کیا۔

"وہ رہی میری گاڑی چلو آؤ کسی اچھی سی جگہ بیٹھ کر کافی پیئیں میں تم اپنے ڈرائیور سے کہہ دو کہ کھرچلا جائے واپسی میں تمہارے گھر میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔" وہ میرا ہاتھ تمام کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی اور میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چلتی چلی گئی حالانکہ مجھے دیر ہو رہی تھی مگر جیس بھی تھا کہ وہ محسوس تو کسی کہہ کوں ہے جس کی چاہت میں امیر پر پور نہیں ہوتی ہے اور جس کی محبت برستی بارش کی اندازے بھگتے رہتی ہے۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر امیر نے کھڑکی کا شیشہ بھلا لیا اور جب وہ شیشہ نیچے ہوا تو میں اپنی جگہ پر جیسے ٹنڈ ہو گئی۔

معین احسان ہاں وہ معین احسان ہی تھا۔ یہ۔ یہ معین احسان امیر کا شوہر ہے ایسا ایسے ہو سکتا ہے؟" میرے دل میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

"معین! یہ بیلا ہے میری کالج فیلو آج اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی اور بیلا نے معین کو میرے شوہر اور یہ میرے کزن بھی ہیں چلو گاڑی میں بیٹھو باقی باتیں راستے میں کریں۔" جیسے معین سے باتیں کر کے یقیناً اچھا لگے گا۔" وہ بہت گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی اور اس کی نظروں میں جو کچھ تھا اس نے مجھے آنکھیں جھٹکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں تم سے پھر ملوں گی امیر اس وقت مجھے

دیر ہو رہی ہے تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو میں جرنی جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔" میں بڑی مشکل سے خود کو کمپوز کر کے بول رہی تھی۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ میں تمہیں معین کا برنس کارڈ دے دوں گی ہوں جب تمہیں سہولت ہو ضرور آنا میں تمہارا انتظار کروں گی۔" میرے ہاتھ میں کارڈ پکڑتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر ایک گہری براسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس مسکراہٹ کا مفہوم میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی تب ہی تو یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

وہ گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی آہستہ آہستہ رہتی ہوئی آگے بڑھ گئی میری نظروں نے دور تک اس بلیک کرول کا لچھا کیا تھا۔ معین احسان کو دیکھ کر مجھے جو جھٹکا لگا تھا اس نے مجھے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔

تمہیں دن کی چھٹی کے بعد میں آج کالج آئی تھی اور فرح کو ڈھونڈنے پھر میری کھاس کا بھری کھینے لیا سب جگہ دیکھ چکی تھی۔ پتا نہیں کس کونے میں چھپی بیٹھی تھی اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ آج کالج آئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نالکہ نے مجھے بتایا تھا کہ فرح آئی ہوئی ہے فرح میری ہسٹ فرینڈ تھی ہم اسکول کے زمانے سے ساتھ تھے اس کے بغیر میرا دن نہیں گزرتا تھا اور اب وہ غائب تھی پہلے ہی میں تین دن سے اس سے نہیں ملی تھی مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا انگلش کالج پر شروع ہونے والا تھا میں کھاس میں آکر بیٹھ گئی یہ سوچ کر کہ وہ کھاس لینے ضرور آئے گی۔

پھر وہ آئی مجھے دیکھتے ہی وہ تیری طرح میری طرف آئی۔

"ہائے بیلا! تم آگئیں میں تو سمجھی تھی تم آج بھی چھٹی کرو گئی۔ اب یہی طبیعت ہے تمہاری؟"

"ہائیک ہول میں۔" میرا منہ بدستور پھولا ہوا تھا کھاس صاب میں تم؟ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ

دی تھی۔ میرے پونچھے پر وہ ایک دم سے پرجوش ہو کر بولی۔

”بھی ایک لڑکی کا اس میں آئے گی نیلے اسکارف والی اسے غور سے دیکھتا پھر میں تمہیں بتاؤں گی میں کہیں تھی۔“

”کلیا مطلب؟“

”خوش دودھوہ آ رہی ہے نیو ایڈیشن ہے امیر

نام ہے اس کا بڑی زبردست چیز ہے بیسٹ فٹم ہونے

کے بعد اس کے پاس چلیں گے۔ ہمیں نے کلاس میں

داخل ہوتی نیلے اسکارف والی اس لڑکی کو غور دیکھا اس

کے گہرے سالوے چہرے پر مسالوں کی بھرمار تھی

انتہائی بد وقت ہے جسم والی اس لڑکی میں ہرگز ایسی کوئی

بات نہ تھی اسے غور سے دیکھا جانا بلکہ غور سے دیکھنا

تو درکنار ایک نظر دیکھ کر کوئی اس پر دوسری نظر وانا بھی

گوارا نہیں کرتا اور قریب سے زبردست کہہ رہی تھی

میں فرح سے پوچھتا چلتی تھی کہ اس میں ایسی کیا

خاص بات ہے مگر مسز سامی کلاس میں اپنی محسن اس

لے میں چپ رہی۔

کلاس ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ لڑکیاں اس کالی

کلیٹی بد وقت سی لڑکی کے ارد گرد جمع ہونا شروع

ہو گئیں۔ فرح نے میرا ہاتھ تھما اور خود بھی ان لڑکیوں

میں شامل ہوئی سمجھے سمجھے میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ

سب ہو کیا رہا ہے میں پوچھتا چلتی تھی مگر فرح نے

مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس لڑکی کے قریب پہنچ

کر بولی۔

”ہلو امیرا یہ بلا ہے میری بسٹ فریڈ اور بیلا یہ

امیر ہے ابھی وہ دن پہلے ہی یہ ہماری کلاس میں داخل

ہوئی ہے جس میں رہا ہے بیلا امیر بہت اچھی باسٹ ہے

ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر ایسی ایسی باتیں بتاتی ہے کہ یقین

نہیں آتا امیر پلیر بیلا کا ہاتھ بھی دیکھو نا۔“ فرح نے میرا

ہاتھ پکڑ کر اس کے سامنے کر دیا تب مجھے سمجھ میں آیا

کہ لڑکیاں کیوں اس کے گرد جمع ہیں صرف دونوں کے

انداز اس کم شکل سی لڑکی نے اتنی مقبولیت اس لیے

حاصل کر لی تھی کہ وہ ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ کر

گوئیاں کرتی تھی۔

اب میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ سر جھٹکے

میرے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی تمام لڑکیوں کی

توجہ ہم دونوں کی طرف تھی میری دلچسپی بھی ایک دم

بڑھ گئی میں عمر کے جس دور میں تھی وہاں اس طرح کی

باتیں بہت متاثر کرتی ہیں میں دھڑکتے دل کے

ساتھ شکر تھی کہ وہ کہتا ہے۔

”بیلا نا امیر بیلا کی لکیریں کیا کہتی ہیں؟“ فرح نے

میں ہو کر بولی۔

”جی ہاں یار دیکھ تو لینے دو ویسے بڑا زبردست

ہاتھ ہے تمہارا۔“ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا

پھر گویا ہوئی ”تمہاری دولت کی لکیر بہت اسیارنگ ہے

بہت چیرے آئے گا تمہارے پاس دولت میں کھیلوں

تہ۔“

”بھئی ظاہر ہے میرے کو کھینچا ہے وہاں کا تعلق

ایک دولت مند گھرانے سے ہے کچھ اور بھی جڑ

نا۔“ فرح پھر بولی۔

”اور یہ کہ بیلا تمہاری جس سے شادی ہوگی وہ

تمہیں لوٹ کر چاہے گا محبت کے معاملے میں بھئی تم

بہت قسمت والی ہو۔“ اس کی اس بات سے شاید میں

بیش ہو گئی تھی کچھ شرارتی قسم کی لڑکیوں نے اس بات

پر سنی بھالی تو میں نے امیر کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا

لیا۔

”کیا ہوا؟“ دیکھنے دو نا ابھی تو بہت کچھ بتاتا ہے

بھئی۔“ اس نے کہتے ہوئے پھر سے میرا ہاتھ تھم

لیا ”ہاں زندگی کی لکیر بھی بہت لمبی ہے ہاں لڑکی کی عمر

کو پانچویں تم، تعلیم بھی ٹھیک تھا کہ حاصل

کر دو۔“ وہ مختلف زاویوں سے میرا ہاتھ دیکھتے ہوئے

بولتی جا رہی تھی۔

”سب کچھ اچھا ہی اچھا ہے یا کوئی ٹیڑھ بھی ہے

میری زندگی میں؟“ کچھ آپ سیٹ بھی تو ہوں گے نا

بھی بتاؤ تاکہ میں ذاتی طور پر تیار رہوں۔“ مجھے اس کی

ہاں باتوں پر کچھ خاص یقین نہیں تھا اسے یونہی

آواز کے لیے پوچھا۔

”میں نے تو دیکھا سب ہی کی زندگی میں آتی ہیں مگر

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تمہارا ہاتھ بہت اچھا ہے

زندگی تمہاری بہت لمبی ہے مگر ساتھ میں بیماری بھی

ہے دیکھو تمہاری لائف لائن ایک جگہ سے ہلکی سی کٹی

ہوئی ہے اس کا مطلب ہے کہ زندگی کے کسی حصے میں

کسی کیس میں بیماری کا بہت شدید حملہ ہو گا مگر تم ان

شاء اللہ صحت یاب ہو جاؤ گی اور پھر بہت چوکی دیکھو نا

آگے جا کر تمہاری لائف لائن پھر ملتی کہی ہوگی

ہے۔“ وہ کسی ماہر باسٹ کی طرح گفتگو کر رہی تھی ایسا

لگتا تھا کہ اس نے باقاعدہ یہ علم سیکھا ہوا ہے پھر وہ

انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان بننے والی

لکیروں کو غور دیکھنے لگی۔

”اب کیا دیکھ رہی ہو؟“

”ان لکیروں سے بچوں کی تعداد کا پتا چلتا ہے سات

بچے پیدا کرو گی تم۔“ اس کے آستے کھلے کھلے چلنے پر پھر

میں نے بچے لکیر میں سے گھیر کر ان کا ہاتھ مچھلیا۔

”بس بھئی محبت ہو کیا چلو فرح! بے یقین چلیں مجھے

جو کہ لگ رہی ہے۔“ میں کپڑے بھاڑ کر کھڑی

ہو گئی۔

”بہت ہی فضول کی باتیں کرتی ہے یہ لڑکی بلو جہ تم

نے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور اٹھا نہیں

کرئی جو منہ میں آتا ہے بیک دیتی ہے۔“ برگر کھاتے

ہوئے میں نے فرح کو لٹاڑا۔

”لیکن یار باتی تو صحیح ہے نا۔“ فرح نے اس کی

طرف اشاری کی تو میں تب کی۔

”یہ تمہیں کہہ سکتی ہو، مستقبل میں بتا نہیں کس

کے ساتھ کیا ہونا ہے یہ ابھی سے ایسے جان سکتے ہیں

ہم یہ سب فضول باتیں ہوتی ہیں اور ان باتوں پر یقین

کرنا بھی نہیں چاہیے، ہمیں بھی اس نے یقیناً اسی

کم کی باتیں بتائی ہوں گی بل خوش کرنے والی اسی لیے

تم اتنا متاثر ہو رہی ہو دیکھنا آج سے دس پندرہ سال

بعد جو کچھ یہ لڑکی کہہ رہی ہے ان میں سے کچھ

ہو جائے گا اور کچھ نہیں ہو گا۔ یہ کارل کی بات ہے

بڑے بڑے باسٹ اسی طرح لوگوں کو بے وقوف

بناتے ہیں آئی ہی بڑی مستقبل بینا ہے یہ لڑکی تو اس

سے ماضی کی واقعات کے بارے میں پوچھو سارا علم

دھرے کا دھارہ جالے گا۔ ہمیں فرح کو بھٹی شہید کی

سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنی ہی غیر

شہیدہ لگ رہی تھی تنگ آکر میں نے اپنی کوششیں

ترک کر دیں۔

پھر میں نے دیکھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں امیر

کانج کی مقبول ترین لڑکی بن گئی فریڈ وین میں یا بریک

نام میں لڑکیاں اسے گھرے رہیں وہ اپنی اپنی سیدھی

باتوں سے انہیں متاثر کرنے کے چکر میں رہتی تھی

فرح بھی اب تک اس کے اثر میں تھی میرے منع

کرنے کے باوجود وہ اس کی طرف پکتی چلی تھی کہ

اسے میری ناراضی کی بھی پروا نہ تھی مجھے فرح کے

ساتھ ساتھ ان لڑکیوں پر بھی شدید غصہ آتا تھا جو اس

کے ہاتھوں بے وقوف بن رہی تھیں ایک انتہائی عالم

سی صورت شکل کی لڑکی نے سارے کالج کی لڑکیوں کو

اپنے پیچھے لگا رکھا تھا۔

میں خوب صورت تھی اور خوب صورتی کو پسند

کرتی تھی اسی لیے امیر مجھے ایک آنکھ نہ بھائی تھی میرا

خیال تھا کہ امیر کو اپنی بد شکلی کا اچھی طرح احساس

تھا جب ہی اس نے سب کی توجہ حاصل کرنے کے

لیے یہ بھونچا طریقہ اپنایا تھا اور تو اور کبھی بھی وہ مجب

بی حرکتیں کرتی تھی کہ کلاس میں سب سے آخری

پتھر جا کر بیٹھ جاتی پھر کے تاثرات اس طرح کے

ہوتے جیسے انتہائی کرب کے عالم میں ہو کر لڑکیاں پوچھ

پوچھ کر تھک جاتیں مگر وہ ایک لفظ نہ بولتی نہ کسی کا

ہاتھ دیکھنے پر تیار ہوتی خاموشی کی گہری چادر اوڑھنے وہ

اپنے آپ کو برا سر رہانے کے چکر میں انتہائی ہونق

لگتی سمجھتے تو صاف لگتا کہ وہ دھڑک کر رہی ہے

صرف اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور اپنے اس

دھونک میں کامیاب بھی رہتی تھی خیر سمیت کلاس کی ہر لڑکی اس کی دل جوئی میں مصروف ہو جاتی گو حراوہر کی ہمدردی سمیت کر جھولی جی کمائیاں گڑھ کر وہ پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ ہر حال یہ بات میں بھی باقی تھی کہ وہ ہری فنکار چیز بھی گو کہ میں اسے سخت پسند کرتی تھی مگر فرح کی خاطر اس سے پہلے ہائے کر لیا کرتی تھی۔

نھو انہر کی ایک لڑکی بھی اسماء اس کی آواز بڑی خوب صورت تھی۔ کالج کے مختلف پروگراموں میں وہ اپنی آواز کا جادو بگاڑتی تھی کالج کی طرف سے ہونے والے تہذیبی مقابلوں میں بھی شریک ہوتی تھی اور اپنی ٹرافیاں جیت کر لاتی تھی اس کی آواز اس قدر سلی تھی کہ جب وہ گاتی تھی تو یوں لگتا جیسے آتشاں نکلتی رہی ہو میں اور فرح فری بیڈ میں اکثر اس سے گیت سنا کرتے تھے۔ وہ بھی ہمارے کالج کی مقبول ترین لڑکی تھی لڑکیاں اس سے فرمائش کر کے نغمے سنتی تھیں اس دن بھی ہماری اردو کی پیچر چھٹی کر گئیں تو ہم نے اسماء کو گھیر لیا ہم اسے لکھنؤ کے چھپے آئے۔ یہاں پر دور دور تک جہاز جھنکار کا ہوا تھا عموماً یہاں دس ڈرامہ ہی ہوتا تھا میری یہ پسندیدہ جگہ تھی۔ ہم دو خوں کے سائے میں آکر بیٹھ گئے اور اسماء کی جلاوہری آواز کے حیر میں گھومنے وہ ایک کے بعد ایک خوب صورت گیت سناتی رہی اور ہم سر دھننے رہے اس وقت بھی وہ مکیش کا ایک مقبول عام گیت گا رہی تھی جب امیر ہمیں دھونڈی ہوئی وہاں آگئی گت دیکھ کر اسماء خاموش ہو گئی۔

”اوسے یار گاؤ تا پلینز چپ کیوں ہو گئیں؟ بہت پیاری آواز ہے تمہاری۔ یہی گانا شروع سے سناؤ۔“

اسماء پھر گلنے لگی ”مجھے کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو“ بلاشبہ یہ ایک درد بھرا گیت تھا خاموش فضا میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہا تھا پھر بتائیں کیا ہوا گانا سنتے سنتے امیر سکیاں لے کر رونے لگی اسماء گھبرا کر چپ ہو گئی۔ اسے اس طرح روئے دیکھ کر میں اور فرح دوا تھا پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا امیر؟ ایسے کیوں رو رہی ہو تم؟“ میرے

پوچھنے پر اس نے جواب دینے کے بجائے گھٹنوں میں سر رکھ دیا اور اس کے رونے میں شدت آگئی ہم تینوں نے ایک دوسرے کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا پتا نہیں اسے اچانک کیا ہوا تھا جب یہاں آئی تھی تو اچھے خاصے میڈم میں تھی اور اس نے

”امیر پلینز کچھ تو بولو ہوا کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟ کوئی بات ہوئی ہے؟ پلینز بناؤ۔“ فرح اس کے ہنسنے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے جا رہی تھی مگر وہ ایسے ہی سر نیو اڑے روئی رہی۔

”اچھا چلو مت بناؤ مگر یار اس طرح رو تو مت“ چپ ہو جاؤ۔ دیکھو تمہارے اس طرح رونے سے ہم لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔“ تھوڑی دیر رو کھینے کے بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ لگاؤ ہو رہی تھیں آنسوؤں سے بھیلے چہرے پر کرب ناک سے تاثرات تھے اور وہ نولہر رو رہی تھی شکر ابھٹ۔

”مسوری یار! میں نے خواب دیکھا تم لوگوں کو ڈسٹرب کر دیا آتم سوہوری۔“ ”یو ماری سی آواز میں لگی“ ”مگر ہوا کیا تھا؟ تم اچانک کیوں رونے لگیں؟“

”مسئلہ ہوا ہے؟“ ”میں بد روئی سے پوچھ رہی تھی مجھے اس وقت واقعی اس سے ہمہ روی محسوس ہو رہی تھی۔“ ”بس یار! یہ گانا سن کر دل بھر آیا آتما درد بھر گانا ہے یہ دل کو چھو جانے والا اور کچھ اسماء کی آواز میں بہت سوز ہے شاید اسی لیے رونا آ گیا تھا ورنہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“

”تم ٹال رہی ہو نا امیر! اب ایسا بھی کیا کہ گانا سن کر کوئی اتنی شدت سے رونے لگے۔ ہاں جن کے دل پر چوٹ لگی ہو ان کی آنکھیں ضرور چھلک پڑتی ہیں مگر اس طرح شاید وہ بھی نہ روتے ہوں تم بتانا میں چاہ رہی ہو تو اور بات ہے۔“ میں نے کندھے اچکائے فرح اور اسماء بھی اسے ٹوٹی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”کچھ نہیں ہوا ہے یار پلینز اس طرح تو مت بھو“ ہماری گہری کچھ کھوجتی نظروں سے شاید وہ کھلی ہو گئی تھی ”اچھا چلو اٹھو سنا کالو کی کا پیڑ شروع ہونے میں صرف سات منٹ رو گئے ہیں فافٹ کلاس میں

چلو ورنہ سسر اتھوئی گھٹے بھی نہیں دیں گی۔“ ”ی گھڑی دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوئی تو ہم نے بھی کلاس کی طرف دوڑا لگائی۔“

اسبر انکوش مشرا اسماء کے پاس پائی جانے لگی گو کہ اس کی اپنی سرگرمیاں بھی تھیں پھر بھی وہ وقت نکال کر اسماء کو سنا کر آئی اور زیادہ تر اسی گیت کی فرمائش کرتی جو اس نے پہلی دفعہ اسماء سے سنا تھا اور جسے سن کر رونے لگی تھی۔ اب اسماء ایک سی گانا سنا کر رورہونے لگی تھی۔

”میں بھی میں سخت بور ہو چکی ہوں یہ گانا گا کر اب نہیں سناؤں گی کچھ اور سننا ہے تو یو لو ورنہ رہنے دو۔“

”ایسا نہ کو اسماء! ایک بار اور سناؤ پھر نہیں کہوں گی بس تمہاری آواز میں یہ گانا سن کر میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے“ ”ی چاہتا ہے تم گاتی رہو اور میں آنکھیں بند کر کے سنتی رہوں۔“

”اور ساتھ ساتھ روئی بھی رہوں؟“ ”ہے نا“ میں نے طعنے لگایا۔

”پتا نہیں کیوں یہ گانا سن کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں میں خود پر کنٹرول ہی نہیں کر پاتی۔“

”اس لیے کہ تمہا پر ہوا اور تمہیں ملاوڑ شوافٹ کرنے کا شوق ہے تم چاہتی ہو کہ کسی نہ کسی وجہ سے لوگوں کی توجہ تمہاری طرف رہے اس لیے تم ایسی بچکانہ حرکتیں کرتی ہو۔“ میں نے بے رحمی سے تجزیہ لپٹا۔

”میں بیلا! ایسی بات نہیں ہے تم میرے بارے میں بہت غلط سوچتی ہو اور اتنی سخت بات اتنی آسانی سے کہہ گئی ہو تم میری دوست ہو اس لیے میں تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گی مگر میں ایسی نہیں ہوں جیسا تم مجھے سمجھتی ہو۔“

”ہو نہ! میں تو تمہیں اور بھی بہت کچھ سمجھتی ہوں تمہیں کیا پتا ایک شہر کی جھولی اور کلہا پلہ کس کی ماری

ہو تم۔“ ”میں سوچ کر رہ گئی۔“

سینکڑ انہر کے ایگز امنز کے بعد لمبی چٹیاں تھیں میں اور فرح تو چٹیلوں میں بھی ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ کبھی بھار ملاقات بھی ہو جاتی مگر ہمیں اور کلاس فیلو کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی ہاں البتہ امیر فرح کے ساتھ رابطے میں تھی۔ میری چونکہ اس کے ساتھ کوئی خاص وابستگی نہ تھی اس لیے میری ڈائریکٹ اس سے ان دنوں میں بات چیت نہ تھی ”فرح ہی کبھی کبھی اس کا ذکر چھیڑتی تھی اور میں سنی ان سنی کرتی۔“

”یار بیلا! تمہیں اس بے چاری سے اتنی چڑکیوں ہے آخر؟“

”چڑکی کی بات نہیں ہے بس مجھے اس کے جھوٹ جج پر غصہ آتا ہے اس کی فضول پیش گوئیاں بڑی لگتی ہیں مجھے دھڑکنے سے وہ سب کو بے خوف بناتی ہے اور ہم سمیت میرا ان تمام لڑکیوں کی شکل پر راجہ کرنے کوئی چاہتا ہے جو اس کی باتوں پر یقین کرے اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔“ ”مجھے امیر اور اس کی حرکتوں پر سننے سرے سے قصہ آنے لگا اور تو اور بات بے بات ٹوسے برائے بیٹھ جاتی ہے یہ بھی اس کے تیار ذہن کا ثبوت ہے بہت حریفے آتے ہیں اسے دوسروں کی ہمدردیاں سمجھنے کے بس اسی لیے مجھے بری لگتی ہے۔“

چٹیلوں کے بعد کالج کھلے تو پھر سے وہی مصوفیات شروع ہو گئیں کئی کلاس فیلو یا دیس مدد حرا چکی تھیں۔ کئی ایک مشتعل شد ہو چکی تھیں میری بھی معنی میرے بچا زادے ہو گئی تھی مگر بچویشن کے بعد شادی ہونا بھی فرح میری معنی میں شریک ہوئی تھی اس نے پہلے ہی دن کلاس میں یہ خبر نشر کر دی تھی لڑکیاں مجھے مبارک باد دے رہی تھیں امیر بھی ان میں شامل تھی اور جب میں سب کے اصرار پر اپنی معنی کی تصویریں کالج لے کر آئی تو امیر نے حارث کی تصویر دیکھ کر کہا

”تم بہت خوش قسمت ہو بیٹا! تمہاری طرح تمہارا منگیتہ بھی بہت پیارا ہے چاند سورج کی جوڑی ہے تم دونوں کی۔“ ہمیں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔

”تم سناؤ تمہارے کیا ارادے ہیں۔ تم ہمیں اپنی منگنی کی منگانی کب کھلا رہی ہو؟“ اس کا چہرہ ایک دم زورور گیا پھر وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولی۔

”میری ایسی قسمت کمال میری شکل دیکھی ہے تم نے تمہارے جیسی حسین ہوتی تو شاید میرے لیے میں بھی کسی کا ساتھ ہوتا میں ایسے خواب ہی نہیں دیکھتی جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔“ وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی مجھے شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے کیوں اس سے یہ سوال کیا۔

”ایسا نہیں سوچتے امیر! بڑی بات! اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے جس نے تمہیں خلق کیا ہے وہ یقیناً ”تم سے محبت بھی کرتا ہے“ اس نے تمہارے لیے ضرور کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا۔ ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“ فرح کی نصیحتوں پر وہ صرف مسکرائی رہی بولی کچھ نہیں۔

ان دونوں ہر طرف نشیوی پر چلنے والے ایک ڈرائے کی بڑی دھوم مچی ”منگیزے“ مٹائی اس ڈرائے کا ہیرو معیذ احسان تھا۔ اس سے پہلے اس کے دو ڈرائے آئن امیر جاچکے تھے وہ نیلی وژن کی دنیا میں ایک خوب صورت اضافہ تھا پر سنائی تو مٹی ہی اس کی زبردست اداکاری بھی بہت جان دار کرتا تھا اس ڈرائے میں اس کا کردار بہت چلن وار تھا جس کی وجہ سے اس کی مقبولیت کا گراف دن بدن بڑھتا جا رہا تھا کلاس ختم ہونے کے بعد ہم لوگ رات کو دکھائی جانے والی قسط پر بھروسہ کر رہے تھے۔ موضوع گفتگو معیذ احسان تھا ہم سب زور شور سے معیذ پر بھروسہ کر رہے تھے۔

”یار! معیذ بہت ہی پینڈ سم بندہ ہے کاش! میں ایک دفعہ اس سے مل سکتی۔“ نائلہ حسرت سے بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو اور ایک ننگ تواتنی شان دار کرتا ہے کہ بالکل حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔“ فرح نے اس کی تائید کی ”تمہیں معیذ کیسا لگتا ہے امیر؟“ جب چاپ سر جھکائے رجرٹر لکیریں کچھنی امیر نے فرح کے پوچھنے پر چونک کر سر اٹھایا تھا۔

”تمیں ڈرائے ہی نہیں دیکھی تو میں کیا باتوں کہ مجھے کیسا لگتا ہے کیا نام بتاتا تم نے؟ اہل یہ معیذ۔“ وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے معیذ کو دیکھا ہی نہیں؟“ فرح حیرت سے بولی۔

”ہاں بھی کمانا نہیں دیکھا۔“

”تو اب دیکھنا اگلے منٹل کو رات آٹھ بجے منگیزے کی اگلی قسط آئے کی ایک مرتبہ دیکھو گی تو پھر چھوڑ نہیں سکو گی معیذ کی پر سنائی بہت سحر انگیز ہے

میرا بھی وہ پسندیدہ اداکار تھا میں کیوں اس کی تعریف کرنے میں پیچھے رہتی ہوں ہم معیذ کی تعریفیں کرتے رہے امیر بے زار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں تو بھی کینٹین جاری ہوں تم لوگوں کو فرصت مل جائے اس موضوع سے تو وہیں آجائے۔“ وہ کلاس سے باہر نکل گئی۔

”ہونہ اس لڑکی کی نہ شکل ہے نہ صورت مگر خود پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے بس ہر وقت ہر کوئی اس کی طرف متوجہ رہتا ہے جانتی ہے یہ اب باہر جا کر اپنی پامسٹری کی دھاک بٹھائے گی احمق لڑکیوں پر مجھے اس کی بے نیازی پر سخت تلو چڑھا تھا۔“

”افو بیٹا۔“ تم تو اس بے چاری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑتی ہو مگر نے دنا جو کرتی ہے تم کیوں اپنا دل جلاتی ہو۔ کام ڈاؤن چلو ہم بھی کینٹین چلتے ہیں۔“



ہم لوگ لیکچر اینڈ کر کے کلاس سے باہر آئے تو

تھرائی ہوئی اسما پر نظر پڑی وہ بھی ہمیں دیکھ کر حیرت خیز چلتی ہوئی ہمارے قریب چلی آئی۔

”کیا ہوا اسماء؟ سب خیریت تو ہے؟“ فرح نے پوچھا۔

”یاروہ تمہاری دوست امیر۔“

”کیا ہوا امیر؟“

”پتا نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے وہ وہاں کینٹین کے پیچھے بیٹھی رو رہی ہے میں تو پوچھ پوچھ کر تھک گئی کچھ بتاتی بھی نہیں ہے بس روئے جا رہی ہے۔“

”تم نے پھر اسے وہی گانا سنایا ہو گا ہے نا؟“ فرح نے پوچھا تو وہ زنج ہو کر بولی۔

”تو کیا کروں میں؟ میں تو ویسے ہی اب اس سے بچتی بچتی ہوں مگر آج اس نے مجھے دیکھ لیا تو نہیں کرنے لگی کہ پلیز ایک بار“ آخری بار سناؤ اور بس جب سے روئے جا رہی ہے اب تم ہی جا کر اسے چپ کرواؤ۔“

”چلو بیٹا دیکھتے ہیں کیا ہوا ہے ستی پاگل ہے یہ امیر بھی۔“

”اور میرا اس پاگل کے ساتھ سر پھوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تم ہی جاؤ میں اب ان ڈرائے بازوں سے پور ہو چکی ہوں۔“ میں نے ٹکسا سا جواب دیا تو فرح مجھے گھور کر آگے بڑھ گئی اور میں اسماء کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔ ہم امیر کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے اسماء کے خیال میں بھی وہ ایک ذہنی مرلینہ تھی جس پر وقتاً فوقتاً ”اس طرح کے دورے پرا کرتے تھے۔“

تھوڑی دیر بعد مجھے دور سے وہ دونوں آتی دکھائی دیں قریب پہنچیں تو میں نے غور سے امیر کا چہرہ دیکھا اس کے چہرے پر ویسے ہی دردناک تاثرات تھے جس کی مجھے توقع تھی غیر متوقع بات یہ تھی کہ فرح کی آنکھیں بھی روتی روتی سی تھیں۔

”کیا ہوا؟“

”ہاں۔۔۔ کک۔۔۔ کچھ نہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔“ میرے پوچھنے پر فرح لرز رہا کر بولی۔

میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور مجھے صاف لگا کہ فرح کچھ چھپا رہی ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے یقیناً ”امیر نے ہی کہا ہو گا ورنہ فرح اور مجھ سے کچھ چھپائے ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لمحے مجھے امیر پر شدید ترین غصہ آیا تھا مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری سب سے اچھی دوست کو مجھ سے چھین رہی ہے اور اسے غصے کا اظہار میں نے یوں کیا کہ وہاں سے پیر پٹ کر چلی آئی فرح پیچھے سے مجھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔



آج دو سرائن تھا میں فرح سے ناراض تھی مگر اس نے مجھے منانے کی کوشش کی تھی مگر میں نہ مانی تھی آخر فرح زنج ہو گئی۔

”پلیز بیٹا! اب تک ناراض رہو گی یا ر! آخر میں نے کیا کیا ہے؟ کچھ بتاتی بھی نہیں ہو اور منہ پھٹائے بھی پھر رہی ہو۔ بتاؤ تو سہی کس بات پر ناراض ہو؟“

”ہاں تمہیں تو جیسے پتا ہی نہیں کہ میں کیوں خفا ہوں۔ وہ سدا لڑکی امیر۔ وہ تمہارے لیے مجھ سے زیادہ اہم ہو گئی ہے نا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے اللہ کی قسم! تمہاری جگہ بھلا اور کوئی لے سکتا ہے؟“

”تو پھر بتاؤ مجھے“ اس دن تم دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟ اور دیکھو جھوٹ مت بولنا مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ کوئی بات تو ضرور ہوئی تھی تم اس دن روتی بھی تھیں امیر نے اگر تمہیں منع کیا ہے مجھے چھانے سے تو ٹھیک ہے مت بتاؤ۔ مگر پھر آئندہ مجھ سے کبھی بات بھی مت کرنا ہمارا دوستی ختم سمجھنا اؤکے۔“ میرے قلعی سے انداز پر فرح چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم اگر اتنی مزید کرتی ہو تو میں تمہیں بتا دوں گی مگر یہاں نہیں کالج میں یہ بات کرنا مناسب نہیں ہے امیر نے دیکھ لیا تو اسے دکھ ہو گا ایسا کرتی ہوں کہ میں شام کو تمہارے گھر آتی ہوں

وہیں بتاؤں گی ٹھیک ہے؟
 "لوگ جسی تمہاری مرضی پھر میں شام کو تمہارا انتظار کروں گی۔"

میں بے چینی سے فرح کی ہنسنے لگی پانچ بجنے والے تھے اس نے کہا تھا کہ وہ پانچ ساڑھے پانچ بجے تک آئے گی اور تقریباً سو پانچ بجے کے قریب وہ آگئی میں اسے لے کر اپنے بندہ روم میں آگئی۔ کوئڈرنگ کا گلاس ختم کر کے فرح سر جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے تھک کر کراہنا گلاس صاف کیا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"بیلا! میں تمہیں بتانے تو لگی ہوں مگر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ تم یہ بات اور کسی کو نہیں بتاؤ گی! امیر نے مجھ پر زور کر کے انا کو مجھ سے شہینہ کیا ہے مگر صرف تمہاری ناراضگی کی وجہ سے میں تمہیں بتا رہی ہوں اس امید پر کہ تم یہ بات اپنے تک رکھو گی وعدہ کرو کہ تم ایسا ہی کرو گی۔" فرح بہت سنجیدہ تھی۔

"فدا ایسی بھی کیا بات ہے؟ بیلا تو سہی ٹھیک ہے میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ اب کچھ منہ سے پھونکو بھی۔"

اور جو کچھ فرح نے بتایا اسے سن کر مجھ پر ہنسی کا جیسے دورہ پڑ گیا فرح الجھن آمیز نظروں سے مجھے ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں پانی آیا تھا۔

"تم بالکل ہو گئی ہو بیلا! کیوں اتنا ہنس رہی ہو؟ میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا ہے۔"

"لطیفہ! یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہے کیا سمجھیں۔" میں اپنی ہنسی پر بہ مشکل قابو پا کر بولی "وہ ایک بار پھر تمہیں سب سے وقفہ بتا رہی ہے اور تم آسانی سے بن بھی گئیں تمہارے پاس کچھ عقل و قل ہے بھی کہ نہیں؟"

"کیا مطلب! تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ جو کچھ امیر نے بتایا ہے اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ یعنی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے؟"

"اور اس کا کام ہی کیا ہے؟ خیر تو اسے بہت آتے ہیں یہ بھی کوئی نیا حربہ ہو گا اور تم مجھ سے شہینہ لگو والو اس نے تمہیں یہ سب کہا ہی اس لیے ہے کہ تمہارے ذریعے یہ بات سارے کالج میں پھیل جائے اور ہر طرف پھیل ہی چکے جائے سب کی زبان پر یہی کی قصہ ہو۔" میں شہینہ بھرے انداز میں بولی رہی تھی۔

"مگر وہ ایسا کیوں چاہے گی؟" کوئڈرنگ وہ مسئلہ سلک ہے شہرت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہے اس کی حرکتوں پر غور نہیں کرتی ہو تم؟ پہلے اس نے پامسٹری کا چکر چلایا پھر بات بے بات روئے کا ڈھونڈ رکھ لیا! اسماء کی جان عذاب میں گرونی ایک سی گانا سن کر اور اس گانے پر یوں ٹوٹ کر روئی یہ سب شہرت حاصل کرنے کی بھونڈی کوششیں نہیں ہیں تو اور کیا ہے؟ اور اب تو سمجھو حد ہی ہو گئی معیض احسان اس کا زہن اور سب سے بڑا شوشہ کہ وہ اس کا منگیتر بھی ہے۔" مجھے پھر سے ہنسی آگئی "معیض احسان تک کسی کی رسائی ہے؟ کون اس سے پوچھے گا جا کر کہ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ؟ ہو گیا فرق پڑتا ہے اس کے نام کے ساتھ اپنا نام منسوب کرنے سے اور امیر جیسی شاعرانہ لڑکی یہی یہ سب کہہ سکتی ہے۔"

"مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ وہ مسئلہ سلک ہے اور اب اسے شاعرانہ کہہ رہی ہو۔" فرح جب سے بولی۔

"بالکل تو یہ بھی ذہنی پرستی کی ہی ایک قسم ہے تمہیں کیوں نہیں ملتی ہو کہ وہ واقعی ایک ذہنی مرض ہے اور تم حد سے زیادہ بے وقوف ہو اس کی ہر بات پر اعتبار کرتی ہو۔" میں اسے قائل کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی اب پتا نہیں وہ قائل ہوئی تھی کہ نہیں؟ مگر اس کے ساتھ ہی سوچ کی گہری لکیریں ضرور نمودار ہو گئی تھیں کچھ دیر کی گہری خاموشی کے بعد فرح مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ہو سکتا ہے بیلا کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر بیلا تم اس بات کو اپنے تک ہی رکھنا اس نے مجھ پر مجھوسہ

کر کے یہ بات مجھ سے شہینہ کی تھی۔ بہت بڑی بات ہو گی کہ اسے یہ پتا چلے کہ میں نے اس کا راز راز نہیں رہنے دیا۔"

"تمہارا بھی کوئی جواب نہیں ہے فرح! آخر تم مجھے کیوں نہیں ہو کہ اس نے تمہیں اسی لیے یہ بات بتائی ہے کہ تم مجھے بتاؤ وہ جانتی ہے کہ تم مجھے ضرور بتاؤ گی اور اسے اچھی طرح پتا ہے کہ میں اسے لپٹ کر لے کر بھونکی بھونکی ہوں اور یہ سب سن کر میرا رد عمل کیا ہو گا یہ بھی وہ اچھی طرح سے جانتی ہے اب جب میرے ذریعے یہ بات اور دنوں تک پہنچے گی تو اسے اس کا مقصد حاصل ہو جائے گا اور اس کا مقصد صرف سستی شہرت حاصل کرنا ہے اور کچھ نہیں۔"

"اے یہ پارچھوڑو اس اگر مگر کو اور دیکھنا جو میں کہہ رہی ہوں یا نہیں یہی ہو گا امیر تم سے گلہ ضرور کرے گی کہ تم نے یہ کیوں کیا مگر اندر ہی اندر وہ خوش ہو گی کہ اس کا بیان کا سبب وہ کہہ لو میری میری یہ بات۔" فرح کی کچھ میں شاید میری بات آگئی تھی اس لیے وہ مزید کچھ نہیں بولی تھی۔



لگے دن میں نے کلاس میں امیر کی موجودگی میں تو ہر لڑکیوں کے سامنے بغیر احسان اور امیر کی نام و نشان مٹکئی کا ہاتھ انداز پھوڑا چند لڑکیوں کے لیے تو جیسے ساری کلاس کو سناپ سو گھٹ گیا اور امیر اس کا چہرہ گویا تدریک پڑ گیا تھا میں بخیر اس کا جائزہ لے رہی تھی گفت اور سر مندی سے اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی کلاس میں جھنجھٹاٹ شروع ہو گئی تھی ہر آنکھ اسی پر لگی ہوئی تھی لڑکیوں نے گویا سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی مگر وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں تھی اس کا جسم واضح طور پر کانپ رہا تھا اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا مجھے وہاں اتنا نظر آئی اس نے فرح کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں شکیہ بھی تھا اور ناراضی بھی فرح نے بلوم ہو کر نظریں جھکا لیں۔

"بیلا! نا امیر تم چپ کیوں ہو؟ تم سب کو بتاؤ کہ معیض احسان کا زہن پس منگیتر ہے پھر کب تم دونوں کی شادی ہو رہی ہے؟" میں بھی بلاؤ گی نا اپنی شادی میں اس ہانے ہم سب معیض احسان سے مل لیں گے اس سے آؤ گراف بھی لے لیں گے دیکھو پلیر ضرور ملانا ہم سب مر رہے ہیں اس سے ملنے کے لیے۔" میں دل کھول کر اس کا ذہن آزاد رہی تھی اور میرا ساتھ کلاس کی اور لڑکیاں بھی دے رہی تھیں ڈرائی ویر میں اس کی مقبولیت کا گراف بہت تیزی سے بچے آکر اٹھا وہ بہ مشکل اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی اپنے لپکاتے ہوئے وجود کو کھینچتی ہوئی وہ کلاس سے باہر نکل گئی فرح نے اس کے پیچھے جانا چاہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اس کے پیچھے جانے کی! اسے یہ پتہ ہی نہ ہو۔"

"تم نے اچھا نہیں کیا بیلا! اس کا تہنا بنانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی میں زور دے کر بولی۔" مگر سچی تھی تو وہی نا ہمارے سوالوں کے جواب۔ یہاں سر اٹھا کر سب کے سامنے کہتی کہ ہاں معیض احسان اس کا منگیتر ہے منہ چھپا کے بھاگ کیوں گئی؟ دیکھا نہیں جھوٹا ہلنے پر اس کا چہرہ کیسا عجیب ہو گیا تھا کسی سے نظر ملا کر بات کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی اس میں اس لیے اسے بھانپا ہوا۔

"پھر بھی بیلا! تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا اس طرح کسی کو ذلیل کرنے کا بہت برا کیا تم نے۔ اب میرے بارے میں پتا نہیں کیا سوچے گی وہ۔" فرح دوبارہ سی ہو گئی تھی۔

"سوچے دو جو بھی سوچتی ہے۔ تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بہت ڈھیٹ ہے وہ ایک آدھ دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی دیکھ لیتا۔" میں بے نیازی سے بولی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ پورے کالج میں یہ بات پھیل گئی امیر کو بہت گھر گئی وہ جہاں سے گزرتی لڑکیاں معیض احسان کا نام لے کر اسے چراتی تھیں وہ آنکھوں میں

پاک سو

ڈاٹ

آنسو لیے سر جھکائے مگر جاتی فرح نے میرے منع کرنے کے باوجود اسے منانے اس سے معافی مانگنے کی کوشش کی تھی مگر اسے جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ پھر اس نے کلج آنا چھوڑ دیا فرح کا خیال تھا کہ وہ اب بھی واپس نہیں آئے گی جبکہ میں سمجھتی تھی کہ کچھ دن بعد جب اس واقعے پر غور پڑ جائے گی تو وہ آجائے گی مگر ایسا نہ ہوا شاید اس نے واقعی ہمیشہ کے لیے کلج چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصے تک اس کا ذکر ہوتا رہا خاص طور پر جب معین احسان کا ذکر ہوتا تو وہ ضرور یاد آتی تھی اور ایسے ہر موقع پر فرح مجھے الزام دینے کی کوشش کرتی کہ میں نے امیر کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی اور میں ہر بار اس الزام کی نفی کرتی اور اسے باور کروانے کی سعی کرتی کہ امیر جیسی فرائیوڑیوں کے ساتھ بالکل یہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا تھا مگر بقول فرح کے وہ چاہے کتنی ہی فرائیوڑی تھی مگر معین کے معاملے میں اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور میرے خیال میں اس کے تمام جھوٹوں میں سب سے بڑا جھوٹ یہی تھا پھر نہ میں کبھی فرح کو قاتل کہلائی اور نہ وہ مجھے کسی وجہ تھی کہ مجھے کبھی بھی امیر پر شدید غصہ آتا کہ اس کی وجہ سے میری اور فرح کی دوستی میں دراڑ سی آگئی تھی۔ اور یہ دراڑ ایک سال اس طرح دور ہوئی جب ہم نے ایک میگزین میں معین احسان کی شادی کی خبر پڑھی منبر کے ساتھ شادی کی تصویریں بھی تھیں اس نے اپنی کسی ساتھی اداکارہ کے ساتھ بہت دھوم دھام سے شادی رچائی تھی اور یہ واقعہ امیر کے کلج چھوڑنے کے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ہوا تھا ہم لوگ بھی فائنل ایگزام سے فارغ ہو چکے تھے اور رزلٹ کے منتظر تھے جس دن میگزین میں یہ خبر چھپی تھی میں نے فوراً فرح کو فون کھلایا تھا۔

”تم نے معین کی شادی کی خبر پڑھ لی فرح؟“
”ہاں۔ پڑھ توئی ہے مگر مجھے یقین نہیں آ رہا بعد تو۔“
”بس پلےز اب دوبارہ سے وہی بات مت کرنا جسے سن کر میرا دل غموم جاتا ہے۔“ میں نے اس کی بات

کٹ دی ”تمہاری سوتلی آج بھی وہیں اٹھی ہوگی ہے آخر تمہیں کب یقین آئے گا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ میں رنج ہو کر رول رہی تھی۔“
”خیر پڑھ کر تو مجھے لگتا ہے جیسے تم واقعی ٹھیک کہتی تھیں کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے معین کو اس سے شادی کرنی پڑے گی کیونکہ نہ صرف یہ کہ ان کا رشتہ بہت بچپن میں بڑھ گیا تھا بلکہ اس کی خالہ جینی معین کی امی اور امیر کی امی آپس میں بہت گھرا ہوا تھا۔ معین کی والدہ ہر صورت اسے اپنی بیوی بنانے کی سعی لے تو وہ اتنی افسردہ رہتی تھی کہ معین اپنی ماں کے مجبور کرنے پر اس سے شادی تو کرے گا مگر وہ اس سے کبھی بھی محبت نہیں کرے گا مگر اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی جھوٹ بولتی تھی خود سے گڑھ کر اس نے یہ کہانی بنائی تھی تم ٹھیک کہتی تھیں بیلا۔ وہ واقعی ایک ذہنی مریضہ تھی۔“ فرح کی آواز سے لگتا تھا کہ جیسے اسے اپنے اندازوں کے خلاف ہونے پر بہت دکھ ہوا ہے۔
”چلو شکر ہے تم نے ملنا تو سہی۔ ہمیں نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔“

آہستہ آہستہ امیر قصہ پارینہ بن گئی معین احسان کا چارم بھی جیسے دم توڑ گیا تھا اس کی جگہ سنے لوگوں نے لے لی تھی وہ اب بہت کم فی وی اسکرین پر نظر آتا تھا بلکہ ایک طرح سے جیسے غائب ہی ہو گیا تھا۔ سو جلد ہی لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو گیا۔
فرح نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی جبکہ میری شادی ہو چکی سب اپنی اپنی زندگیوں میں ایسے مگن ہوئے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ رہی شادی کے دو سال بعد میں جرمنی چلی آئی تھی اس دوران میں ایک بچی کی ماں بن چکی تھی میرے جرمنی آنے کے بعد فرح کی بھی شادی ہو گئی اور ہم دونوں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا امیر کا نقش تو ذہن سے ایسے سنا کہ پھر کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا۔

مگر آتے رہے اور بعد ہی تھی اور سب سے بڑھ کر معبود احسان کو اس کا شہرہ دیکھ کر مجھے ایسا جھکا کا تھا کہ مجھے خاصی کے تمام اوقات ایک کے بعد ایک کر کے یاد آتے چلے گئے۔ آج تک معبود میں خود کو کون سے میں کھڑا محسوس کر رہی تھی نہ امت سی نہ امت تھی جس نے مجھے خود سے بھی نظر مانے کے قاتل نہیں چھوڑا تھا۔ فرح فرح کتنی تھی کہ وہ چاہے کتنی ہی فراخ ہو مگر معبود کے معاملے میں بالکل سچی تھی مجھے بالکل کوئی حق نہیں تھا کہ میں اس کا اس طرح تماشا بناتی آئے اس حد تک رسوا کر لی کہ اسے کانچ تک چھوڑنا پڑا تھا میں اس سے مل کر اپنے لیے کی معافی مانگنا چاہتی تھی مگر خود میں اتنی امت نہ پاتی تھی کہ دوبارہ اس کا سامنا کر سکوں شاید میں اتنی بہادر نہ تھی مجھے اعتراف ہے کہ ہاں میں بربل ہوں یا شاید میری اناہی گوارا نہیں کرتی کہ ابھر جیسی عورت کے سامنے میرا وجود جھک جائے کیونکہ اسے میں نے بیش بہا معافی سمجھا تھا اب بھلا میں کیسے ایک معمولی عورت کے سامنے اپنی شرمندگی کا اعتراف کرتی۔ سو میں نے اس سے ملنے کا ارادہ ہتھی کر لیا اور اس کا ہوا ہوا کارڈ پر اسے پرزے کر کے ڈسٹ بن کی نذر کر دیا مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ نہ امت کا یہ احساس اب شاید ہی میرا چھاپ چھوڑے۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے معبود نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے۔
 ”کیا بات ہے۔ تم بہت خوش اور ریلیکس نظر آ رہی ہو۔“
 ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو ایسا کیوں لگا؟“
 ”مجھے لگ رہا ہے جب ہی تو پوچھ رہا ہوں۔“
 ”بہت غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔“
 ”ملنے اگر آپ کو مل رہا ہے تو ایسا ہی ہو گا ویسے جناب آپ کی عمرانی میں ہمیشہ خوش اور ریلیکس ہی رہتے ہیں۔“ میں نے ناز سے ان کی طرف دیکھا۔

”جو تو ٹھیک ہے مگر آج کچھ خاص بات ہے۔“
 ایک بات بتاؤ یہ وہی خاتون جس نے جتن کی وجہ سے تم نے اپنی پڑھائی اور حوری چھوڑ دی تھی اور میں اسے کمرے میں قید رہی تھی۔“
 ”جی نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کوئی قید وہ نہیں تھی بلکہ قید تو میں نے تب کالی تھی جب آپ نے اس بے ہودہ سی لڑکھارے سے بیاہر چھوڑا تھا۔ میں بھی شوشی سے بولی تھی۔“
 ”بھول جاؤ ان سب پرانی باتوں کو آج کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ میں اور تم ساتھ ہیں اور ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔“ معبود نے گود میں میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا ان کی آنکھوں میں میرے لیے وہی محبت تھی جس کے لیے مجھے میں ترسا کرتی تھی میں نے سکون کے ایک کمرے احساس سے مغلوب ہو کر سوئ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔
 ”تم نے اپنی خوشی کی وجہ اب تک نہیں بتائی۔“
 میں نے آنکھیں کھلی کر ان کی طرف دیکھا مگر نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔
 ”لگتا ہے اپنی پرانی کلاس فیلو سے ملنے کی تمہیں کچھ زیادہ ہی خوشی ہوئی ہے۔ یہی بات ہے نا؟“
 ”ہاں مگر اس خوشی کی وجہ اس سے ملاقات نہیں ہے بلکہ۔“ میں نے جملہ اوحو را پھوڑ دیا۔
 ”اب بتاؤ مجھے دو بات۔“ وہ بہت بے چین ہو رہے تھے۔
 ”آپ کو کیا ہے معبود۔“ میں نے وہ اسکرین کے پار سیاہ کونٹا کی سرنگ پر ہاتھی دوڑتی گاڑیوں پر نظر جمادی۔
 ”آپ سے شادی کے بعد میں نے نہ نہ جانے کتنی مرتبہ دعا مانگی تھی کہ ایک بار صرف ایک بار بیٹا مجھے ل جائے ایک بار مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لے اسے معلوم ہو جائے کہ امیر ویسی اب امیر معبود احسان ہے مسز معبود احسان۔ اور آج اللہ نے میری یہ دعا سن لی آج میں نے بیٹا کی آنکھوں میں وہ کچھ دیکھا ہے جسے دیکھنے کی مجھے بہت حسرت تھی آج سے پہلے میں نے

اپنی آنکھوں میں ہمیشہ اپنے لیے حقارت اور تنہید دیکھی تھی اور دس سال پہلے کلیدوں تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکی مگر آج کو کس بھی کی مگر اپنی ذلت اور رسولی کا وہ تماشا بیش میرے دل میں تروا نہ ہی رہا اور آج وہ کتنا بھی آخر تک ہی گیا اسی لیے میں آپ کو اتنی ریلیکس اور خوش نظر آ رہی ہوں۔“
 ”ہوں۔ تو یہ بات ہے؟“ معبود نے لمبی سی ہوں کی۔

”اچھا ایک بات تو بتاؤ وہ تم سے دوبارہ ملنے آئے گی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔“ میں قطعیت سے بولی یہ تو مجھے اسی وقت بتا چلی گیا تھا کہ اب بھی میرا سامنا نہیں کرنا چاہے گی کیلک دھارے کی کہ اب بھی مجھے اس کا مجھ سے ٹکراؤ نہ ہو اور مجھے بھی اب اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں ہے میں جو جانتی تھی وہ ہو چکا وقت کے اس احساس سے مجھے چھٹکارا مل گیا۔
 اس میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں کرتے کرتے ہم حرج سے مجھے نے مجھے گھر پر اتارا اور خود کسی ضروری کام سے چلے گئے۔

میں اپنے دو سالہ بیٹے کو گود میں لپیٹی دی لاؤنج میں بیٹھی تھی یونہی میری نظر لاؤنج میں دو بار پر لگی اپنا شادی کی اس پر پڑی تصویر پر پڑی تھی یہ تصویر معبود کو بہت پسند تھی اسی لیے انہوں نے فریم کر دیا کہ یہاں لگوائی تھی میری نظر جب بھی اس پر پڑتی تھی مجھے بہت کچھ یاد آتا تھا اور جب سے ملا سے میری ملاقات ہوئی تھی تب سے تو میں بھی یادوں میں گھری تھی پتا نہیں کیا کیا یاد آئے چلا جا رہا تھا اپنی زندگی کے وہ شخص دن جب مجھے خود سے بھی شدید نفرت ہو چکی تھی اور جب اپنا ہی وجود قاتل نظروں سے لگے تو سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے ان دنوں میرا دل چاہتا تھا کہ یا تو میں خود کو ختم کر ڈالوں یا معبود کو مار دوں۔
 معبود مجھے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا جس کی محبت

میری رگوں میں لیون کر دوڑتی تھی وہ ہتھوڑوں میں لگا تھا اتنی ناقابل حصول تھیں جتنی تھی کیونکہ وہ ایک بار نہیں گئی بار میرے سامنے اس رشتے کی نفی کر چکا تھا جو اس کے اور میرے درمیان اس وقت سے جڑا تھا جب ہم اس کا مفہوم بھی نہ جانتے تھے پھر جیسے جیسے شعور آ گیا اس رشتے کی خوب صورتی کا احساس بھی واضح ہو گیا اس کے نام کے ساتھ میرا دل دھڑکا تھا مگر جب آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تھی میرا دل بیٹھ جاتا تھا میں جانتی تھی کہ میرا اور معبود کا کوئی جوڑ نہیں ہے وہ بہت پیارا تھا اس کی شخصیت اتنی دل آویز تھی کہ ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی اسے مل سکتی تھی اور اس بات کا احساس اسے بھی شدت سے تھا تب ہی تو وہ میرے نام سے بھی بدکنا تھا میرے ساتھ اس کا بے زار کن رو بہ مجھے بہت کچھ یاد کرنا تھا اس کے باوجود میرا دل مطمئن تھا کیونکہ ہمارے خاندانوں میں کبھی محبت تھی۔ اس کی اور میری ای۔ نہ صرف یہی نہیں بلکہ آپس میں دیورانی میٹھتی بھی تھیں۔ اس کے والد بھی میرے لیا اور میرے ابو ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔ یہی حال میری امی اور خالہ کا بھی تھا دلوں کی طرح ہمارے گھر بھی ایک تھے اور کبھی کبھی کو میری اس کی منگنی ٹوٹے نہیں رہتی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی معبود کو مجھ سے شادی کرنا تھی اور میرے لیے یہی بہت تھا معبود کے سوا باقی سب مجھے چاہتے تھے اور میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد میری محبت اور خدمت معبود کو بھی میری طرف پھٹنے پر مجبور کر دے گی اسی خام خیالی میں میں کب سے جی رہی تھی میں کالج میں آئی تھی اور معبود یونیورسٹی میں تھا ہمارے گھر والوں کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی ہم تعلیم سے فارغ ہوں گے ہماری شادی کر دی جائے گی۔ لیکن دنوں معبود کا موڈ بیش بگڑا رہی رہتا تھا وہ کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہ کرتا اور خاص طور پر مجھے دیکھ کر تو اس کی آنکھوں سے جیسے پتھر گراؤں سی پھونٹیں ملنا لگتا کہ وہ اندر ہی اندر مجھ سے اٹل رہا ہے۔ میں اس کا سامنا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بناٹا دل	آمنہ وحی	500/-
دروم	راحہ جلیا	600/-
دعائی اکرمی	رعنا نگار رحمان	500/-
توشیحہ کوئی کمرئیں	رعنا نگار رحمان	200/-
شہول کے دروازے	شانیہ چوہری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شانیہ چوہری	250/-
دل ایک شہزادوں	آسیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فاطمہ انور	500/-
بہول بھلائی جی بکریاں	فاطمہ انور	500/-
بھلائی سے رنگ کالے	فاطمہ انور	250/-
بکریاں یہ چاہتے	فاطمہ انور	300/-
شہر سے شہرت	غزلہ حیدر	200/-
دل اسے ڈھونڈ لایا	آسیہ مرزا	350/-
تھر رہا میں خواب	آسیہ مرزا	200/-
دھم دھم کی سہیلی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اناس کا گہر	ہتری سید	200/-
رنگ فریبہ ہوا دل	انصاف آفریدی	450/-
درد کے کھیلے	رضیہ جمیل	500/-
آج کل کی ہمارے	رضیہ جمیل	200/-
دھوکا کھول	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل سے سفر	حیمہ قریشی	300/-
جی رہا میں دل کی	سمونہ شریانی	225/-
شام آواز	ایم سلیمان	400/-

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
شانیہ چوہری
کتاب خانہ ڈائجسٹ 2011-2012
فون: 32216362

”شادی کرنے کو کون کہہ رہا ہے صرف نکاح کرنا ہے کما تو ہے کہ رخصتی بعد میں ہوگی۔“ ”تایا ایسا ہے لپک لپک میں بیٹے۔“
”شادی یا نکاح ایک ہی بات ہے۔ وہ کمزوری آواز میں بولا۔“

”ایک بات ہو یا دو بات جو میں نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔ زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ان کے لپکے میں اتنی قطعیت تھی کہ معجزہ کچھ بیل ہی نہیں سکا اور میری رکی ہوئی دھڑکنیں پھر سے بحال ہو گئیں۔ گھر میں ہمارے نکاح کی باتیں ہونے لگیں میری بیلوں پر ڈھیروں خواب بننے لگے تھے میں خوابوں کے اس دس میں معجزہ کا ہاتھ تھامے جا لے اور کتنا سفر کرتی کہ میرے خواب چمکا چور ہو گئے۔

وہ میرے پاس آیا تھا۔ ابھی میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر پوری طرح سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ اس نے مجھے بالکل ہی بے آسرا کر دیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے سن کر میرے ارد گرد اگ بھڑکنے لگی تھی وہ میرے سامنے اس بات کا اعتراف کر رہا تھا جس سے سب کے سامنے منکر ہو رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے بارے میں چھپنے والی خبریں جھوٹ نہیں تھیں۔ واقعی اس ایک شہر کے عشق میں جلا تھا اور اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

”مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟“ اس کے منہ سے یہ سب سننے کے بعد بھی بتا نہیں مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں سے آیا تھا جو میں مزید سننا چاہتی تھی۔
”تمہاری کچھ کر سکتی ہو۔ پتہ ابھرا تم چاہو تو مجھے اس مشکل سے نکال سکتی ہو۔ ورنہ اپنا تو میری کوئی بھی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“ وہ مجھ سے مدد کا طلب گار تھا عجیب بات تھی نلکہ جو مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ آج میرے سامنے کھڑا التجا کر رہا تھا۔

”کیا چاہتے ہو تم معجزہ؟ کیا کہوں میں؟“
”ہم۔“ ہم اس شادی سے انکار کر رہے۔ اتنی بڑی بات نہ دینی کسلی سے کہہ گیا تھا۔ میں نے اگرچہ پورا

حصول بنا جا رہا تھا میری شدت اور تڑپ بھی بڑھ رہی تھی اس پر سے آئے دن اخباروں میں چھپنے والے اس کے اسٹینڈرڈز میں باتوں نے مجھے ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیا مجھے خود بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ مجھ سے عجیب و غریب حُریتیں سرزد ہو رہی ہیں مثلاً میں پاگل ہو رہی تھی اور میرا یہ پاگل پن لوگوں کی نظروں میں آنے لگا تھا۔ معجزہ کی بے شمار شہرت اور مقبولیت نے میرے اندر بھی مشہور ہونے کی ہوس پیدا کر دی تھی مگر میری یہ اوقات نہیں تھی کہ میں کسی قسم یا ڈرائے کی تہہ کوئن بن سکتی تھیں۔ میں نے پاستی کا سارا لیا اور الٹی سیدھی جھوٹی چٹا پٹن گویاں کر کے اپنی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی۔



ان دنوں معجزہ کا اپنی ایک ساتھی اواکار کے ساتھ بیڑا زبردست انداز میں رہا تھا اور اسے تو اکثر کے ساتھ ان دنوں کے بارے میں خبریں پھیل رہی تھیں کہ گھر میں بھی سب کو خبر ہو چکی ایک بار پھر لیا ابا سے سے پاگل ہو گئے اور اس بار گھر کے کسی بھی فرد سے معجزہ کا ساتھ نہ دیا۔ اس محاذ پر وہ اکیلا ہی تھا اور مسلسل انکاری تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے اخبار والے تو یونی بے پر کی اڑاتے ہیں اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں ہے۔

”ٹھیک ہے اگر اس خبر میں کوئی سچائی نہیں ہے تو پھر تیری کرلو آئندہ آنے والے جمعہ پر تمہارا میرے ساتھ نکاح کر دیتے ہیں۔“ رخصتی ابھر کے لی اسے کرنے کے بعد ہو جائے گی۔ ”تایا لہانے ایک دم ہی فیصلہ منلو تھا۔“

معجزہ کا چہرہ بالکل سفید رہ گیا جبکہ میرا دل جلیبی کی تال پر دھڑکنے لگا تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد میرا دل جیسے کسی نے بے دردی سے مسل ڈالا تھا وہ کہہ رہا تھا۔
”تایا! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں فی الحال شادی نہیں کر سکتا۔“

کرتے سے کھڑے لگی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے اتنی بے زاری اور نفرت دیکھنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی وہ جتنی دیر گھر میں رہتا میں چھپی چھپی پھرتی پھرتی گھر سے غائب رہنے لگا ہونور سٹی کے بعد تھوڑی دیر کے لیے گھر آتا پھر جاتا تو رات گئے گھر میں گھستا بھی نہیں تو پوری رات گھر آتا یہ صورت حال تایا ابا کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی اور ایک دن انہوں نے اسے گھیر لیا اچھی طرح جان کی ڈانٹ اور لعن طعن سننے کے بعد اس نے اپنے گھر سے غائب رہنے کی وجہ بتائی اس نے تایا ابا کے مزاج کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

”غضب نام روشن کیا ہے صاحبزادے نے خاندان کا غضب خدا کا یہ ابل دی پر کام کرے گا پاپ دادا کی عزت کو خاک میں ملائے گا۔ اس سے کہہ دو صبر و بردباری اس گھر میں رہنا ہے تو یہ اپنے سیدھے دھندے چھوڑنا پڑیں گے ورنہ اپنا انتقام کس اور کر لے میرے گھر میں یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔“ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔

”اچھا۔ اچھا بھائی جی میں سمجھاؤں گا آپ پریشان مت ہوں یہ لپک پائی تھیں اور ریلیکس ہو جائیں آپ جیسا چاہیں گے وہی ہو گا۔“

مگر اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوا بلکہ اس نے اتنا گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی کہ وہ تایا ابا کا کلوتا سپوت تھا ان کے بچاؤ کے لیے کئی بھی اس کا سہارا نہیں لے لیا ابا کو جیسے توڑ دیا ہوا ناخوستہ انہیں سمجھو تا کرتا پڑا پھر سب نے انہیں سمجھایا بھی کہ یہ اتنا بڑا کام بھی نہیں ہے اور یوں بھی وہ لڑکا ہے لڑکی ہو تو اور بات بھی لیا ابا کو اس کی ضد اور ہنر حیرت نے بہت حد تک پہنچایا تھا وہ ایک دم ہی بوڑھے اور کمزور دکھائی دینے لگے تھے یہاں تک کہ لی دی پر حاصل ہونے والی اس کی کامیابیاں اور شہرت بھی انہیں خوشی دینے سے قاصر تھی جیسے جیسے اس کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا ویسے ویسے میرا دل سکڑا جا رہا تھا وہ مجھے خود سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑا نظر آتا اور جتنا وہ ناقابل

سارا نہ لے لیا ہوتا تو میں لڑکھرائی ہوتی۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں سب کے سامنے جا کر کہہ دوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی“ تاکہ سب کی توہین کا رخ میری طرف ہو جائے اور تم صاف بچ جاؤ کوئی الزام نہ آئے تم پر۔ یہی چاہتے ہو نا تم؟“ وہ مجرموں کی طرح میرے سامنے سر جھکا کر کھڑا تھا اور اس وقت میرا جی چاہا رہا تھا کہ میں اس کا جی سچا کر دوں لکنا خود غرض تھا وہ اپنے مطلب کے لیے اپنی خوشی کے لیے وہ مجھے سب کی نظموں میں گرانا چاہتا تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے معیذ۔ جیسا تم چاہتے ہو ایسا بھی نہیں ہو گا۔ تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی مت کرو مگر یہ بات سب کے سامنے جا کر خود کوہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی آتم سوری۔“ میں استغاثی رکھائی سے بولی تھی۔

”لو کے۔ تم میری مدد نہیں کر سکتیں؟ کوئی بات نہیں۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ کچھ بھی ہو جائے میں تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گا چاہے اب مجھے ہوش کے لیے اس گھر سے نکال دیں۔ تمہیں تم۔“ وہ مجھے میری ہی نظریں اچھی طرح ذیل کر کے باؤں پختا ہوا وہاں چلا گیا۔ اتنی دیر سے میں خود سنبھالنے لکڑی تھی اس کے جاتے ہی میری ٹانگیں جیسے بے جان ہو گئیں اور دل مروہ ہو جاتے جاتے دل کی ہر اڑکھائی گویا ساتھ لے گیا تھا۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے مجھے کسی بات کی بھی نہ خبر تھی نہ پوچھا میں نے یادی کی چادر اوڑھے محوم پری تھی۔ اسی لمحہ غافلہ لایا اب اس کو چپ سی لگ گئی تھی تیار لہا کے جھکے ہوئے کندھے اور جھک گئے تھے میری ماں کی پلکیں ہر وقت نم رہنے لگی تھیں معیذ نے ہم سب لوگوں کو ایک عجیب مقام پر لکھڑا کیا تھا گھر کی افشا اتنی بو جھل تھی کہ سانس لےنا بھی دشوار لگتا۔

تب میں نے وہی کیا جو معیذ مجھ سے چاہتا تھا۔ میں نے لایا لہا کے سامنے جا کر اس سے لکھ سے انکار کر دیا لایا اب مجھے گلہ لگا کر رو رہے تھے۔

میرے انہوں کے سامنے سر اٹھانے کے بھی لائق نہیں سمجھو ڈا ہے۔“

”پلیز! لایا اب ایسا مت کہیں آپ کا اس میں کیا قصور ہے؟ میں خود منع کر رہی ہوں بلکہ اور معیذ کو بھی کچھ مت کہیے گا مجھے بس اس سے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں“ تم یہ کیوں کہہ رہی ہو۔ اس بد بخت کے دھیتے نے تمہیں یہ کہنے پر مجبور کیا ہے۔ خیر بچھٹائے گا بہت بچھٹائے گا۔ دیکھنا ایک دن ٹھوکر کھا کر وہاں نہیں آئے گا۔“ وہ جتنا نہیں خود کو بلارہے تھے باجھے تکی دینے کی کوشش کر رہے تھے میں سمجھ نہیں سکی تھی۔

پھر اس نے دہلی سے شادی کر لی جس دن اس نے دہلی سے کورٹ میں کی تھی اس روز ہمارے گھر میں یوں لکنا تھا جیسے مرگ ہوئی ہو وحشت سی وحشت تھی سب ایک دوسرے سے نظریں اٹھائے اپنے اپنے آنسو چھپا رہے تھے اور میرا تو سارا وجود ہی جیسے آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا اور یہ وہ آنسو تھے جو میرے دل میں گر رہے تھے۔

کلج جانا تو پہلے ہی موقوف ہو چکا تھا جب بیلانے بھری کلاس میں مجھے معیذ کے حوالے سے تشاہیرا تھا حساب مجھ سے کلج چھوڑنے کی وجہ پوچھ کر تھک گئے تھے مگر میں نے کسی کو اصل بات کی ہوا تک نہ لگتے دی اور گھر پر ہی پرائیویٹ ایگریگیشن کی تیاری کرتی رہی مگر معیذ کے شادی کر لینے کے بعد میرا ہر جہ سے دل اچھٹ ہو گیا فاسل ایگریگیشن سر رہتے اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھی تھی سب وقت تمام وقتوں سے سوا تھی۔ اس نے جس طرح مجھے نامعتر کر دیا تھا اس نے مجھے زندگی کی ہر خوشی سے دور کر دیا تھا۔

تھیں تاکہ کچھ تو میرے چہرے پر رونق آئے اور میں اسی کا دل رکھنے کے لیے ان کی ہر بات سنانے ہی چلی جاتی مگر سب بے سود رہا نہ میرا اس رشتہ بڑھکا اور نہ میرے چہرے کی بے رونقی میں کوئی کی واقع ہوئی اسی کی فکر اور تشویش برحق جاری تھی۔ جبکہ میرے لیے صورت جیل باعث تسکین تھی میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی بس اسی کی خوشی کی خاطر خاموش رہتی تھی میرا پاگل دل تو اب بھی اس دشمن جان کے نام پر سکڑا سمٹا تھا حالانکہ اسے دیکھتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہیں۔

دہلی کے ساتھ شادی کے بعد وہ یہاں بہت کم آتا تھا اور جب کبھی آتا تو میں اپنے کمرے میں قید ہو جاتی دل ہلک ہلک کر اسے دیکھنے کی ضد کرتا مگر میں دل کو ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھاتی وہ مسمانوں کی طرح تھوڑی دیر کے لیے آتا پھر غیر معینہ مدت تک کے لیے غائب ہو جاتا۔ یہی مدت تھا کہ لایا لہا نے اسے کبھی کبھار کچھ دیکھنے کے لیے آئے کی اجازت دے دی تھی ورنہ وہ تو اس کی شکل دیکھنے کے بھی دروازہ نہ تھے وہ جب بھی آتا لکھا آتا دہلی کو اس گھر کی دہلیز پار کرنے کی اجازت نہ تھی ایک بار غافلہ اسی کو تار رہی تھیں کہ دہلی نے اس بات پر بہت دوا دیا بھی کیا تھا کہ اس کے سر اٹھانے والے اسے منہ لگانے کو تیار نہ تھے اس بات پر وہ معیذ سے بہت لڑی تھی دونوں میں شدید قسم کا جھگڑا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ سن کر میرے دل میں عجیب سی ٹھنڈک اتر گئی تھی۔

برسات کا موسم تھا صبح سے بجلی بجلی بارش ہو رہی تھی سردی کی شدت میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا تھا دسمبر کی اس برجستہ دوسرے میری اداسی کو اور بڑھا دیا تھا۔ تنہائی کا احساس انتہا شدید تھا کہ مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی دل کی دیر انیاں جب حد سے بڑھنے لگیں تو میں گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی ہر طرف سامنے کا راج تھا سب اپنے اپنے بستروں میں دبے

ہوئے تھے گرم گرم کپڑے کی چاہ میں میں بکتن میں چلی آئی اپنے لیے کٹی تیار کر کے میں وہیں اسٹول پر بیٹھ کر ٹکے ٹکے سب لے رہی تھی کسی کی نظموں کا ارتکاز محسوس کرتے میں نے مڑ کر دیکھا اور میرے ہاتھ سے کٹی کا کپ کرتے کرتے بچاؤ دیکھ کر دوڑنے کے پتھوں بچ کھڑا تھا اور مجھے ہی دیکھ رہا تھا میرے ہاتھوں میں ابھی تک لڑا ہٹ تھی۔ وہ دھڑکتے دھڑکتے چلتی تھیں کے اندر آ گیا۔

”تھمت۔ تم کب آئے؟“ میری آواز بھی کلپ رہی تھی کتنے عرصے کے بعد میرا اور اس کا اس طرح سامنا ہوا تھا۔

”میں تو رات سے آیا ہوا ہوں۔ کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں کچھ چاہیے؟“

”اگر ایک کپ کافی مل جائے تو سردی بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ گرا گرم کافی سے شاید گرا بہت آجائے۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو آئیں میں دگر کر بولا۔

”میں بناؤں گی ہوں تم اپنے کمرے میں چلو۔“

”نہیں۔ میں ٹھیک ہے۔“ وہ اس اسٹول پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے میں ٹھکی ہوئی تھی مجھے اس کی موجودگی سے ابھرن سی ہو رہی تھی اس بات کی بھی حیرانی تھی کہ وہ رات سے یہاں تھا اور مجھے خبر تک نہ ہوئی مگر وہ پوری رات یہاں ٹھہر کیسے گیا؟ جب سے اس نے شادی کی تھی پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ رات اس نے یہاں گزار دی تھی۔ اس کی بیوی نے اس بات کی اجازت کیسے دے دی تھی؟ کیا پھر دونوں میں لڑائی ہوئی تھی؟ اور لڑائی کیا اتنی شدید نوعیت کی تھی کہ اسے رات یہاں گزارنی پڑی تھی؟ سوالات کا ایک بیجوم تھا اور جواب ایک کا بھی نہیں معلوم تھا اسے کافی کا کپ پکڑا کر میں ان ہی سوالات میں گھری اپنے کمرے میں آئی تھی۔

پھر ایک ایک کر کے سب سوالوں کے جواب مل گئے وہ ہمیشہ کے لیے آیا تھا۔ اس نے دہلی کو طلاق دے دی تھی جس سے محبت کا وہ دھوئے دار تھا وہ صرف دو سال کے بعد ہی اسے چھوڑ کر کسی اور کے

ہماری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں اب بھی اس کی محبت روز ازل کی طرح تازہ ہے اور ان چار سالوں میں میرے دل نے کئی بار شدت سے تمنائی کی تھی کہ یہاں ایک بار مجھے معجزہ کے مراد دیکھ لے۔

میں اپنی زندگی کی تمام گھنٹیاں بھول گئی تھی مگر ذلت کے اس احساس سے کبھی چمکا رہا حاصل نہیں کر پائی تھی جس سے پہلے مجھے لاچار کیا تھا آج وہ تنہا بھی پوری ہوئی تھی مجھے معجزہ کے ساتھ دیکھ کر اس کی جو حالت ہوئی تھی اس نے مجھے تسکین کا ایک گہرا احساس بخشا تھا میرے دل میں رسول سے گزارش کا نکل گیا تھا۔ میں خوش تھی بے حساب خوش اور خوشی کے اس خوب صورت احساس سے مغلوب ہو کر میں نے آنکھیں موند لی تھیں۔



خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ذرد موم

راحت جبین



قیمت - 600 روپے

پتہ: 32735021 لاہور

جان کی بات پر غور کرو نہیں صحیح کا بھولا اب لوٹ آیا ہوں کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟ وہ سیدھا میری آنکھوں میں چھانک رہا تھا اس کی آنکھوں میں اس کے لیے میں وہ کچھ تھا جسے سننے، سمجھنے کی میں نے بار بار خواہش کی تھی اس کے بارے میں میرے منہ سے نکلا تو یہ "مہم" معجزہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تو پھر شادی؟ وہ کرسی سے کود پڑ گیا آہستہ آہستہ چلا ہوا میرے نزدیک آ گیا اس کی اتنی قربت نے مجھے بدحواس سا کر دیا تھا میری بدحواسی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب اس نے میرے کپکپاتے ہوئے ہاتھ تھامے تھے۔

"محبت کا میں دعو نہیں کرتا امیرا مگر تم سے ایک وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کی گئی تمام زاداتوں کا ازالہ کروں گا اور سنا ہے نکاح کے مقدس بولوں میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ اجنبیوں کے دل میں بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے ہم تو پھر اجنبی نہیں ہیں۔ مجھے خود تو ایک بار ثابت تو کرنے دو۔ کیا تم مجھے ایک موقع نہیں دو گی؟" وہ اتنے خوب صورت اور گنیمت لیے میں بات کر رہا تھا کہ میرے لیے بلیکس اٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ چل پھرے اسی پرانے سائز پر دھڑک رہا تھا جس پر پہلے کبھی دھڑکا کر تھا۔



پھر میرے سارے خدشات سارے وہم اور دوسے بلبلیوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے مجھے تو بیش سے ہی اس سے محبت تھی مگر نکاح کے بولوں نے اسے بھی میری محبت کی ڈور سے باندھ دیا وہ میری طرف پلٹا تھا مکمل میرا ہو کر اور بس یہی بات تھی اچھی میرے ہر جانی کی وہ میرا تھا میرے پاس تھا۔

وہی معجزہ احسان جو بھی ناقابل حصول تھا جسے پانا میری بدترسی سے دور تھا اسے اللہ نے شاید میرے صبر کے انعام کے طور پر مجھے لوٹا دیا تھا اور کچھ اس طرح سے کہ اس کی محبت پادشہ بن کر دن رات مجھ پر برکتی

میرے ساتھ اس کا رویہ بہت دوستانہ اور مصفاہانہ ہو گیا تھا۔ اجنبیت کی جو دیوار ہم دونوں کے درمیان بیش سے تھی اپنی کوششوں سے اس نے گرا دی تھی وہ مجھے میرے کمرے کی محدود فضا سے باہر نکال لیا تھا میں ایک بار پھر سے زندگی جینے لگی تھی اس کے سمجھانے اور مجبور کرنے پر میں نے اپنی تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑا تھا لی اس کے امتحان سے فارغ ہوئی تو پھر میں پھر سے میری اور اس کی شادی کی باتیں ہونے لگیں مگر اب میں کوئی اور ذمہ کھانے کو تیار نہ تھی۔ ٹھیک ہے اپنی غلطیوں کے ازالے کے لیے معجزہ نے میرے ساتھ اپنا رویہ بہتر کر لیا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ مجھ سے شادی بھی کر لیتا تب بھی میرے اور اس کے درمیان ایک عمر کی مسافت تھی اس سے پہلے کہ وہ پھر سے میرے وجود کی نفی کرتا میں نے شادی سے انکار کر دیا اس کے سامنے جب میں نے انکار کیا تو چند لمحوں تک وہ گنگ سی ہو گئی تھیں۔

حیرت کے اس ابتداء میں مجھے سے ابھی سنبھلے بھی نہیں پائی تھی کہ معجزہ چلا آیا اسے دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر سم گرا شاید وہ پھر پہلے کی طرح مجھ سے کوئی مطالبہ کرنے لگا تھا میں نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ میرے سے مسکرایا اور کرسی حیرت کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" اتنی پریشان کیوں ہو؟
"تم۔ تم کیوں آئے معجزہ؟" میں نے اسی سے کہہ دیا ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تم بے فکر ہو۔"

"ہاں کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا دل اب تو نہیں چل گیا؟ تم نے خالہ جان کو شادی کے لیے منع کر دیا؟ چھوہہ تم نے بہت برا کیا اب بے چاری خالہ جان کا بی بی ہانی ہو جائے گا۔" صاف لگ رہا تھا کہ وہ انتہائی غیر سنجیدہ موڈ میں ہے اور اس کی یہ غیر سنجیدگی میری آنکھوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

"لڑنا مت سوچو امیرا اور یوں مجھ سے بدگمان بھی مت ہو کہ تمہاری بدگمانی بچا ہے مگر پھر بھی خالہ

ساتھ بی بی کی تھی۔ وہی سارے دلی عورت تھی ہی نہیں وہ جس سوسائٹی میں سودا گری تھی وہاں گھر شوہر بچے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہی ساری باتیں اسی نے بتائی تھیں دو سال کا ازدواجی عرصہ معجزہ نے ایک عذاب میں گزارا تھا بہت جلد وہی کی اصلیت اس کے سامنے آئی تھی محبت کا نشہ جتنی تیزی سے چڑھا تھا اتنی ہی جلدی اتر بھی گیا۔ وہی تو کب کا اسے چھوڑ چکی ہوئی معجزہ ہی نہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا مگر کب تک؟ وہی ایک اڑیل گھوڑی تھی اسے لگام دینا جب معجزہ کے بس سے باہر ہو گیا تو اس نے سارے بان کی فکرت خورہ سایہ معجزہ اس معجزہ سے بالکل مختلف تھا جو وہی کی محبت میں سب کو ٹھوکر مار گیا تھا اب نہ وہ محبت تھی نہ شہرت و کامیابی کا وہ نکتہ۔ اس کی شخصیت کو کہ اب بھی پہلے کی طرح چل تویر تھی مگر پھر بھی کچھ ایسا تھا جس نے اسے بدل ڈالا تھا۔ تایا یا کے پیر چول پر سر رکھ کر وہ کس قدر دیر تھا اپنی غلطیوں کی کو تابیوں کی معافی مانگ رہا تھا "فرما" سب سے ہی اس نے معافی طلب کی تھی جن میں بھی شامل تھی اور جب وہ میرے سامنے ہاتھ بندھے کھڑا تھا تو خوشی کے بجائے مجھے افسوس نے گھیر لیا تھا۔

"پلیز معجزہ۔ ایسے مت کرو مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔"

"مگر مجھے اچھا لگ رہا ہے بہت عرصے بعد مجھے کچھ اچھا لگے۔ تم جب تک مجھے معاف نہیں کرو گی میں اسی طرح کھڑا رہوں گا۔ پلیز میری زاداتوں کے لیے مجھے معاف کرو۔ میں نے تمہارا منت دل دکھایا ہے۔ شاید یہ تمہارا دل دکھانے کی ہی سزا ہے جو میں ہر طرف سے مشکلات میں گھرا گیا ہوں۔" وہ سر جھکائے تا دم تا دم سا اپنی غلطیوں کا اعتراف کر رہا تھا اس کا جھکا ہوا سر بندھے ہاتھ اور نہ امت سے چور لہجہ مجھے افسردہ کر گیا تھا۔

وہ لوٹا تھا تو جیسے گھر کی رو بھی خوشیاں بھی لوٹ آئی تھیں بہت عرصے بعد اس آگن کی رونق بچاں ہوئی تھی اور ایک بات میں نے شدت سے نوٹ کی تھی کہ

[illegible]

قد نلنا: کہ جسے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ جسے کی کہانی بھارت کو بہار سے مزین و نادر اور دلچسپ کہانی ہے۔ فائدہ
القول: العید وادھو نول میں کسی نئی ہی قوت کے گھراں اعلان کے بہار سے مزین و نادر اور دلچسپ کہانی ہے۔ فائدہ



وہاں نانی ستارہ کے محلے میں جہاں دھلتی ہوئی رات میں ایک ساتھ اتنی ساری روٹیاں بکھری رہتیں کہ آسمان کا سیاہی مائل رنگ بھی مدھم مدھم ہوتا تھا۔ ستاروں کا وجود معدوم رہتا مگر کبھی کبھی جب ایک ایک آواز چلی جاتی یا کسی مذہبی شہوار کی رعایت سے یہاں کی سرگرمیاں بند ہوتیں اور پورا محلہ تیم تارکی میں ڈوبا ہوا ریت تباہ نکلی سارا منظر ایک میل چلتا۔

چوہا رے پر کھٹنے والے اس کے کمرے کے دروازے اور کھلی کھڑکیوں پر رات کا فوس پوری طرح جاگتا اور آسمان پر اتنے ذخیرے ستارے ایک ساتھ جگمگاتے نظر آتے کہ شمار کرنا بھی چاہو تو ناممکن۔

لگتی ساری پرصائی و ڈھائی بھول کر حیرت سے ہوئی دروازے کی چو کھٹ میں کھڑی رہتی اور وہ اس وقت کتنا بے زار ہوتا تھا۔

لگا ہٹا کر بھی نہ اس کی طرف دیکھتا اور نہ۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے خیام نے سر کے نیچے رکھے تکیے کو ٹھیک کیا۔

میر جویوں پر قدموں کی آہٹ ابھری تھی۔

اسے پتا تھا کہ کون ہے سواٹھے کا تکلف کیے بغیر یوں ہی چپ چاپ لیٹا رہا۔

سامنے میر جویوں پر سے ساجد کا سر نمودار ہو رہا تھا۔

”کھانا کھائیں خیام بھائی!“ وہ خوشبو آتی تھی لے سیدھا اس کی طرف آیا۔

”آج تو کافی دیر ہوئی تیرس روٹیاں کھا گیا تھا“ آپ کے لیے پائے لیے“ آج املا نے صرف مسور کی وال پکائی تھی ساتھ چاول بھی نہیں میں نے سوچا۔“

”کیا حرج تھا؟ دل روٹی سے اچھا بھی کوئی اور کھانا ہے کیا؟ اور عیرو رات کو اتنی دور جانا۔ پوچھ تو لیتے تھے۔“

خیام اٹھ کر بیٹھنے ہوئے ناراض ہوئے لگا۔

”آپ سے پوچھتا تو آپ کبھی نہ جانتے دیتے۔“ وہ تکیے سے ہنس پڑا۔ ”آئیں شروع کریں۔“

”کھانا کا مطلب پیٹ بھرنا ہوتا ہے اور حلال روٹی کی چٹنی روٹی بھی بہت بڑی نعمت ہے۔“ لقمہ توڑنے سے پہلے اس نے ایک مزید نصیحت کی۔

اس بار ساجد کی مسکراہٹ پھٹکی پڑی۔

”ساری عمر سے چٹنی روٹی ہی تو کھا رہے ہیں خیام بھائی! وہ بھی اپنے گھر کی نہیں املا گھروں میں کام کر کے جو بچا ہوا کھانا لاتی تھیں ہم نے تو آنکھ کھول کر وہی کھایا توگوں کا جھوٹا ہاسی۔ کبھی کبھی تو خراب بھی ہوتا تھا مگر املا ہلکا پھل کر کھلاتی تھیں مجھے یاد ہے ایک بار اتنے زور کا پیٹ میں درد ہوا تھا میرے کہ اسپتال کے جانچا ہوا تھا جس جب سے ضرور املا نے احتیاط کر لی تھی کہ خراب ہوئی چیز نہ بند کر دی تھی ورنہ۔“

خیام کو اپنی کئی بات کا واقعی افسوس سا ہوا کوئی بھی بات لگتی ہی اچھی اور سچی ہو کبھی کبھی سیاق و سباق میں فٹ نہیں بیٹھ پاتی۔

”زبردست بڑے ہیں مرنو آگیا۔“ تندوری روٹی کے نوالے کو شور بے میں اچھی طرح سے ڈبو کر منہ میں رکھتے ہوئے اس نے اپنی بات کا ڈالہ کرنا چاہا۔

”مجھے پتا تھا کہ آپ کو پسند آئیں گے۔“ ساجد خوش ہو گیا۔

”سب کے لیے لائے ہوتا؟“

”اور کیا املا کی دال خرقہ میں رکھ دی ہے کل دھپہ کو اس کے ساتھ چاول نکالیں گی۔“ اس نے مزید اطمینان

”وہیے خیام بھائی! ایک بات کہوں، بڑا ملت مانیے گا۔“

”ہوں گے۔“

چھوٹا سا نوالہ توڑتے ہوئے اس نے فراخ دلی سے اجازت دی تو ساجد کی ہمت بندھ گئی۔

”آپ کی نیت اتنی بھری ہوئی ہے کچھ عجیب سا نہیں لگتا۔ میرا مطلب ہے کہ نہ آپ کو کھانے سے فرق پڑتا ہے نہ بستر سے نہ سڑی گرمی سے عجیب سا نہیں لگتا میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس بار اس نے ساجد کے چہرے پر نگاہ جمائی۔

”یہی کہ۔“

وہ کچھ چپ سا ہوا شاید فیصلہ نہیں کیا رہا تھا کہ کچھ کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔

”وہ ضروری بات تکلیف دیتی ہے جب تک مکمل نہ ہو اور ہم تم میرا خیال ہے دوست بھی ہیں۔“

خیام نے تکیے سے مسکرا کر اسے جتنا چاہا تو اس کا چہرہ مکمل اٹھا۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔“

”نہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے؟“ تم جیسا محبت کرنے والا دوست ملا چھوٹا بھائی اس لیے نہیں کہتا کیونکہ رشتوں میں املا اہم اہم اچھا چھوٹا چھوٹا گیایا ہے اصل۔۔۔“

”یہی سچی سچی جو آپ گھما گئے پھرے!“ ساجد نے تکیے سے منہ پٹایا۔ ”تقی بے حس کمال سے آئی ہے خیام بھائی! اگر انسان کا کسی بھی چیز کے لیے دل نہ چاہے یہ تو بے ہی ہو سکتا ہے تاکہ یا تو انسان نے کوئی بلکا سا بھی سیکھ لی محبت نہ دیکھی ہو اسے ذرا نقد ہی نہیں پتا ہواں باتوں کا۔ تب ہی اسے طلب بھی نہیں ہوتی یا پھر اس نے اتنا کچھ دیکھ لیا ہو کہ زندگی بھر کے لیے لکھ بھر گیا ہو حالانکہ یہ بھی بڑی ناممکن سی بات ہے۔“

”تم نے اتنی بڑی باتیں کمال سے سیکھیں؟“ خیام کا نوالہ ہاتھ میں ہی رہا تھا۔

”یہ تو میری املا ہی کہتی ہیں کہ جب تک کسی چیز کا مزہ ہی نہیں پتا ہوتا تب ہی تک خبر ہے جو ایک بار منہ کو چاٹ لگ جائے تو پھر توندنے کی خبر نہیں اسی لیے تو انہیں میری بھی فکر ہو جاتی ہے کبھی کبھی کہ میرے منہ کو پیسے کی چاٹ لگ گئی ہے۔“

وہ لا پرواہی سے کہتے ہوئے کھانا کھاتا رہا۔

”لیکن میرا شمار دوسرے گروپ میں ہوتا ہے وہ جنہیں نہ مزے کی جانکاری نہ طلب۔ تسلی ہو گئی تمہاری۔“

خیام نے دوسرے سے کہتے ہوئے اپنے آگے سے پیٹ سرکا لی۔

”نہیں۔ کیونکہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن میں آپ سے سچ کہنے پر اصرار نہیں کروں گا میرے لیے صرف آپ اہم ہیں آپ کا کچھ جھوٹ نہیں۔“

وہ برتن سمیٹ کر تنبیہ کی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جائے لے کر آنا ہوا۔“

خیام کی اگلی بات سے بغیر وہ نیچے اترتا چلا گیا۔

اپنی سیاہ جوتی کے کمرے کے کچھ بھی ختم نہ ہونے والے یقین کے باوجود ایک بات تو مافی ہی پڑتی تھی کہ ان تاریک سسٹن رائیوں میں سب سے چھوٹا سا سی کسی نہ کسی کوئی دلچسپ روشن ہو ہی جاتا تھا۔

اس غریب الوطنی میں پہلے پو شوکت اور اب۔۔۔ ساجد!

ایک گرمی سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا خیال تھا کہ تھوڑا سا مثل ہی لے، لیکن یہاں گھر اتنے چھوٹے اور
تکس میں اتنے ملے ہوئے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں اپنی حد ختم ہو کر دوسرے کی شروع ہو جاتی ہے
ساری چھتیں پوری طرح آباد تھیں۔
عورتیں ٹولیاں نیچے

اب موسم بدل رہا تھا، بچے کے کمروں میں ٹھنڈے پڑنے لگی تھی، سواب لگے اٹھ لہویدی سلسلہ رہتا تھا۔
وہ دو تین منٹ بعد ہی تنگ کر واپس پلنگ پر آ بیٹھا۔ بچے ایک دبا دبا سا شور اٹھاتا شروع ہو گیا تھا۔ شاید ساجد کا
ایا گھر آچکا تھا۔
”دو میل سے پیدل چل کر آ رہا ہوں، جیب میں کچھ نہیں جو کوئی بس ہی پکڑ لوں، یہاں گھر میں دعوتیں اڑانی
جا رہی ہیں، بے غیرت اولاد ہے ساری کی ساری، باپ کو دیتے ہوئے جان نکلتی ہے، دوسروں کا بڑا لڑا لھتا ہے
خیشوں کو۔“

خیام نہ چاہتے ہوئے بھی کان لگانے پر مجبور ہوا۔
”سارے پیسے دیتا ہوں لہا تمہیں، بھوت مت بولو اور اگر خیام بھائی کے لیے ایک لفظ بھی کہا تو میں کہہ چکا
ہوں کہ ان کے ساتھ میں بھی کھرچھوڑ کر چلا جاؤں گا کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا تم لوگوں سے۔ یاد رکھنا۔“ اوپر
موجود خیام کے خیال سے ہی ساجد بچی آواز میں کہہ رہا تھا۔
خیام نے نیچے ٹونٹ کو سختی سے دانتوں تلے دبایا۔
آج یہاں آئے چھٹا دن تھا۔

اور ساجد کے ابا کی ناراضی کوئی دھکی چھپی بات بھی نہیں تھی، پہلے ہی دن سے وہ اپنی ناراضی کا اظہار کرتا آ رہا
تھا اور خیام کو اچھی طرح انداز ہو چکا تھا کہ وہ اسے زیادہ دیر برداشت کرنے والا بھی نہیں ہے۔
”شاید اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا اور اب آگیا ہے تو رکن میں چاہیے۔“
کتی ہی بار اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا مگر ساجد کی محبت پر راہ نہ دیکھتے رہے تھے۔
”اگر آپ میرے ساتھ نہیں رہیں گے تو پھر میں آپ کے ساتھ رہوں گا، چاہے سڑک کے کنارے ہی
ہو۔“ بیڑھیوں پر ساجد کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ سو وہ کچھ سنبھل کر بیٹھا۔
ساجد کو سمجھایا بھی جاسکتا تھا اور اگر وہ نہیں سمجھتا چاہتا تھا تو بھی کیا مشکل تھی۔
اتنا بڑا بڑا گمہ شہر۔
یہاں جو جانا کیا مشکل تھا؟

اور وہ تو ویسے بھی اس کام میں مہارت حاصل کر چکا تھا، ایک تنہی مسکراہٹ خیام کے چہرے پر آئی تھی۔

موسم میں روز بہ روز جدت بڑھ رہی تھی۔ چھوٹا سا بچن کھلے مچن میں تھا، سارا دن دھوپ سے بھر رہے لگتا تھا
ایسے میں سارے صبر و شکر کے باوجود اسے لالہ لالہ جیسے کھلنے والا بڑا بچن نہ چاہتے ہوئے بھی یاد آتا جہاں بڑی بڑی
دعوتیں بھی با آسانی منٹ جاتی تھیں۔
آسانوں اور آسانوں سے بھر پور۔
وہم و گمان سے دور رہے بھی کبھی ایسا کچھ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ سب جو یہ انٹی جن کی طرح حاصل ہے اس

طرح چھن جائے گا کہ خواب و خیال بن کر رہ جائے گا۔
آخری دفعی بات بات میں بند کرتے ہوئے جویا نے دل میں ایک بار پھر توبہ کی۔
بے شک انسان گنہگار ترین درجہ پر ہے۔
اس نے باپ پر نکلے ہوئے خود کو یاد دلایا اور اندر کمرے میں چلی آئی۔
”پچھنے میں اگر بیٹھ جاؤ بیٹا، بچن تو سارا دن تھکتا ہے۔“ شاگرہ بیگم نے رحم کھاتی نگاہوں سے اس کی طرف
دیکھا اور سرک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔ ”مکھڑیوں ہی کھڑی رہی۔“
”کھانا لے آؤں آپ لوگوں کے لیے۔“
”کیا کیا ہے؟“

بچے کے ٹھیک نیچے کرسی ڈال کر بیٹھی آپاگل نے پہلے پوچھ لیا مناسب سمجھا۔
”بیگن کا بھرتہ اور موٹیک کی دال۔“
”کل تم نے لوکی پکائی تھی اور پر سوں۔“
”بھنڈی کی بھجیا۔“

وہ سوچ میں پڑنے لگیں تو جویا نے ان کی مشکل آسان کی۔ آپاگل کے ماتھے پر آئی شکنوں میں ایک اور کا
اشافہ کیا۔
”کم از کم ابو کے لیے تو کچھ اچھا کیا کو، کتنے دن بعد گھر آئے ہیں خیر، صحت کتنی گزرتی ہے ان کی اور یہ
دال سبزیاں تو انہوں نے بھی شوق سے کھائیں بھی نہیں ہیں۔“
”تو اب کہاں سے لائیں مرغ مسلم ان کے لیے، ہمیں اتنی محبت آ رہی ہے باپ کی تو پکا کر کیوں نہیں لے
آئیں اپنے گھر سے، کس چیز کی کمی ہے وہاں۔“ شاگرہ بیگم بری طرح جھنجھلائیں۔
”میں سسرال میں رہتی ہوں امی، وہاں سے کھانے پکانے کو لاؤں گی تو دس بائیس بیٹیں گی، پہلے ہی کیا کسر رہتی ہے
ہماری بے عزتی میں اور ویسے بھی جب اس دن لائی تھی تو آپ لوگوں کو کتنا برا لگ گیا تھا جویا نے تو صاف منع کر دیا
تھا پوچھ میں اس سے۔“ نسوں نے اپنی اس دن کی دیر دلی یاد دلانی۔
جویا نے افسردگی سے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”پنہ دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے گل، اہم نے اپنے اچھے دنوں میں کوئی کسر چھوڑی تیری خاطر واری میں سوہنے
لینے میں جواب میں کیا لگا اور آج جو وقت پر آئے تو کیا۔“

آپاگل نے ہاتھ کے اشارے سے اس بوقت یاد دہانی کو بچ میں ہی روکا۔
”برامت مائے امی، سب ہی لوگ بیٹیوں کے لیے کرتے ہیں، لیکن آپ لوگوں کی طرح جرات نہیں ہیں، پہلے
تو صرف دویا اور زویا کا منہ بننا تھا، مگر اب تو آپ بھی طعنے دینے لگی ہیں، صاف کہہ دیں کہ میں نہ آیا کروں یہاں۔
میں سمجھ لوں گی میرا مہکمہ ختم ہوا۔“

خود پر رقت جاری کر کے وہ اپنی چادر سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں تو شاگرہ بیگم اور جویا دونوں ہی نے بوکھلا کر ان
کی طرف دیکھا۔

”امی کلیہ مطلب نہیں تھا، آپا“ جویا نے ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا تو انہوں نے ایک جھٹکے سے اس سے ہاتھ
پھڑکایا۔

”رہے دو بس، بیٹھے کیا پتا نہیں کہ تمہیں اور زویا کو کبھی شکایتیں ہی رہی ہیں مجھ سے، میرے خلاف بیٹھ امی

کے کان بھرتی رہی ہو یہ تو میں ہی ہوں جواب بھی تمہاری بھلائی کے لیے بلکان ہوتی پھر رہی ہوں مگر سب احسان مانا کون ہے۔

معلوم نہیں وہ کس احسان کی بات کر رہی تھیں۔ جو یا کوڑا بن پر زور دینے کے باوجود بھی یاد نہ آیا۔
 ”اور اسی لیے جو سب آپ مجھے جتنا ہی احسان کو کیوں نہیں سمجھیں، میں اسے اکلوتا سب سے پہلے تو اس کا فرض ہے“ اتنے بڑے بگڑے میں رہتا ہے ساتھ لے جا کر رکھنا چاہیے تھا اسے نہیں رہنے دیتی اس کی بیوی تب بھی خرچہ تو دینا چاہیے تاسے آپ کو گول کالہ“ اپنی رونا انگی ملتی کر کے وہ دوبارہ میٹھیں۔
 شاکرہ بیگم نے ایک مختصر سی سانس لی۔ ”مجبور ہے وہ غریب۔“

”مرد ذات اور مجبور۔ اور نہ۔ بیوی کا غلام ہے سلمان۔ جو تے کی لوک پر رکھے ہوئے ہے وہ آپ کے اکلوتے لاڈ لے کو ذلیل ہو کر رہ رہا ہے، تو یہ کے ساتھ۔“

ایک کھلی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے وہ اور بھی بے رحم ہوئیں۔
 ”اب ہم کیا کر سکتے ہیں، جو قسمت میں لکھا ہے سب ہی کو بھگتنا ہے، میری تو خرچ کی فکر میں غنڈازی ہے، پاس رکھا ہوا کتنے مہینے کھائیں گے، کرایہ الگ دینا پڑا رہا ہے، اوپر سے تمہارے ابا کا مقدمہ، ہر تین چار میل کی فحش گرم کرنا پڑتی ہے اس نے بھی ڈرا ڈرا کر جان نکال رہی ہے۔“
 ذرا رک کر انہوں نے پاس رکھے گلاس میں سے پانی کا ٹھونٹ لیا۔

”پانی بھی گرم“ ٹھٹھے پانی کو بھی دل ترس کر رہ گیا ہے۔“ انہوں نے برا سا منہ دیا۔ ”کسی سے برف ہی منگوائی ہوتی۔“ محرومی کی فہرست طویل تر ہوئی جا رہی تھی۔
 اس علاقے میں بار بار ٹھٹھے کی آواز سننے لگ جاتی تھی، تو طبع آتا ہی تو برائے نام۔
 ”لوئیں کیوں ڈرا رہا ہے؟ آخر اتنی بھاری حفاظت تو ادا کر دی ہے، اب اور کیا رہ گیا ہے باقی۔“
 کپاٹل کو پانی پاتوں میں دھپسی نہیں تھی۔

یہ پانی پانی ٹھٹھا لیا جاتا ہے یا گرم پٹکھا چلتا ہے یا نہیں یہ مسائل تو سارا شرفیں کرتا ہے، کون سی بات ہے۔

شاکرہ بیگم نے طنز سے نگاہ کیا گل پر ڈالی۔
 ”حفاظت ہوئی ہے، کیس توڑی ختم ہوا ہے، وکیل کتا ہے جب تک تاریخیں لیتے رہیں گے بچت ہے، ورنہ کچھ سال کی قید تو جرم نامے کے باوجود بھی ہو کر رہی رہے گی۔“

”ہائے میرے اللہ!“ آپاگل نے دل کر سنے پر ماتھہ رکھا۔ ”اب یہ ذلت بھی باقی ہے، میں نے تو سب میں کہہ دیا ہے کہ اب یہ مجھ پر لازم تھا، ثابت نہیں ہوا تو عدالت نے معافی مانگی ہے ان سے۔“
 ”آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے، لوگوں کو سب عقل ہے، صحیح غلط کا فیصلہ وہ خود بھی کر سکتے ہیں۔ اتنا بڑا کیس تھا؟ اخبار میں بھی تفصیل آچکی ہے۔“ جو یا کوان کے اس طرح جن جن کربات کرنے سے اور بھی کوفت ہوئی تھی۔
 آپاگل نے کھا جانے والی نگاہوں سے جو یا کی طرف دیکھا۔

”نیپلو ہم مجھ سے ہی سہی، عزت کی خاطر تو انسان کو کیا نہیں کرنا پڑتا، تم بھی اگر سسرال میں رہتیں تو بتا چکا کہ کیا کیا سنتا پڑتا ہے، تم لوگ تو یہاں ایک طرف منہ دے کر بیٹھ گئے ہو مگر مجھے تو سارے خاندان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کسی کو اس نے پہنچنے کی خبر نہیں دی ہے، یہی ہی کہا ہے کہ۔“

”اے دو! کس نے منع کیا ہے اور کون یہاں بہت عورت دار ہے جو ہم انکیاں اٹھائے گا، سارا کاسرا افسیوں کا خاندان، ساری عمر میرے دواؤں پر بیٹھ کر کھائے والے، تنگ حرام کوئی کچھ کہہ کر تو کھائے، اوقات یاد دل دوں گا سالوں کی۔“

”اظہار ہوتا تو زور سے بولتے ہوئے اندر چلے آئے، ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا اور لمبے میں الفاظ میں کہیں بھی اپنے کیے پر کوئی ندامت احساس تک نہیں جا رہا تھا۔

وہی غور وہی رعونت۔

بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی۔

جوانے بہت شرمندگی سے شاکر بیگم اور کیا گل کے چہروں پر چھائے ہوئے اطمینان کو دیکھا، انہیں ایسی باتوں سے بڑی سہولت حاصل ہوتی تھی۔

”میں تو خود چاہتا ہوں کہ وہ سب لوگ آئیں، آج اگر کچھ عرصے کے لیے یہاں رہنا پڑ رہا ہے تو کوئی قیامت نہیں آئی، میں تو خواب گھر بدلنے کی فکر میں تھا، دیکھنا بہت جلد ڈینس میں گھر نہ سہی اپنا رٹمنٹ تو ضرور ہی لے لوں گا۔“

”ابن شہداء اللہ! کیا گل اور شاکرہ امی دونوں ہی نے بڑی عقیدت سے ان کی کسی بات پر سو فیصد یقین کیا۔
”کمانے کا کوئی یہی ایک طریقہ نہیں رہا، الفت، بیچ دی اس تو کوری پر بھی اور اس جگہ پر بھی، اظہار احمد کو سمجھا کیا ہے، اس غیبت خاندان ہے۔“

آج بہت دن بعد وہ اپنی اپنی فارم میں تھے، ورنہ جیل سے مٹاوت پر رہائی کے بعد دونوں انہیں چپ نگہ رہتی تھی، دواؤں سے مر کھتا بھی ہو، تاہم یہی طرح چونک چوک بڑھتے۔

”جنا ہے اب تو آج کل خاندان والوں کا قبیلہ تو اسلام پٹچا گا گھر بنا ہوا ہے، انہیں سلام کرنے پہنچتے ہیں سارے کے سارے، حالانکہ وہ تو کسی کو منہ بھی نہیں لگاتے ہیں نہ پہلے اور نہ اب۔۔۔“

کیا گل کا جوش و خروش بڑھنے لگا۔

جوا چپ چاپ نگہ کر رہا تھا۔

کمرے کے آگے نکلے، کچھ کے نیچے ذرا سا ساہ تھا۔ کرسی گھسیٹ کر وہاں بیٹھی رہی، گواندہ سے آتی آوازوں کو یہاں تک پہنچنے میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی، مگر یہ ہکا سارہ بھی غیبت تھا۔
”کسی کو کھانے پلانے کے لیے بل بھی چاہیے، اسلام بھائی کے ہاں ہے، کیا خالی خول باتیں نہ ہو، پر آجائے گا یہ مطلب نہیں کہ جب میں مل بھی آگیا ہو گا، ساری عمر تو شائستہ نے سلائی کر کے وال دینی چلائی ہے، سیپ، مٹے، دونوں تختے میں سدا کے۔“

ماحول میں دھکی دھکی گری۔ جو گزرے دونوں کا خاصا تھی۔ جوانے نے اظہار سے پہلو دلا۔

”حالات تو سنا ہے بہتر ہو گئے ہیں اب گھر میں کل ٹائم ملازمہ تنگ رکھ لی گئی ہے، سارا گھر سنبھال رہی ہے، ریحہ ایم اے کر رہی ہے، کل تک تو اتنی بڑھتی والی نہیں تھی۔“ اس بار کیا گل کی کواڑ جھمی گئی۔
”تمہیں کس نے دی ہے اتنی اندر کی خبر؟“

”اچھن ماموں آگے تھے کہیں سے پھرتے پھرتے میرے گھر۔ اتنی دیر بیٹھے، دو دفعہ فرمائش کر کے چائے پانی میں نے باتیں سننے کے شوق میں ٹھوڑی دیر بٹھایا، مگر کھانے سے پہلے رخصت کر دیا، وہ تو سدا کے مفت خورے ہیں، جانتی ہوں۔“

”ضرورت نہیں ہے اس اچھن بد بخت کو منہ نہ لگانے کی۔ اور وہ اسلام بھائی بھی کیا کھا کر ملازمہ رکھیں گے۔“

یوں ہی کوئی آواز لڑکی پکڑ لایا ہو گا، ان کا لہجہ بیٹنا۔ بہت شرافت نے جوش مارا تو نکاح پر دھاوا بھگا، کوئی ایسے خاندان کی لڑکی تو ملنے سے رہی اس بد بخت۔۔۔“
”ٹھک سے کوئی پھر جسے اس کے ساتھ پر آکر لگا۔
جوانے نے بے ساختہ ہی اپنے ساتے کو چھوا۔
کچھ بھی نہیں تھا۔



کمرہ شم تارک اور لٹنہ تھا۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دواؤں کے کپڑے لگے، سوچ پورے برٹن دیا، تو ایک دم ہی پورا کمرہ روشن ہوتا چلا گیا۔
”بیکار کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے، سالار نے ایک دم ہی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔
”کیسے ہو؟“ وہ آگے بڑھ آئے۔
”آپ!“

”ہاں اور تھل ہونے پر ہرگز بھی معذرت نہیں کروں گا، کیونکہ اتنا تو حق ہے، ہر حال مجھے۔ تم مانو نہ مانو۔“ وہ اس کے بالکل قریب آگئے ہوئے۔
سالار ہلکے سے مسکرایا۔

”بیٹھے، تاکہ کمرے کیوں ہیں۔“

وہ ایسے لگا تھا گھر انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دوبارہ بیٹھے پر مجبور کیا۔

”مہارے درمیان اس طرح کے تعلقات، مجھے غیرت کا احساس دلاتے ہیں، سالار دیکھ کر ناست کیا گواہ ہے۔“

”آپ کی محبت سے کمال صاحب!“

”پھر وہی اگر انکل کو ملے تو کوئی نقصان نہیں ہو گا، تمہیں اور میں تھوڑا سا خوش ہو جاؤں گا۔“ اس بار وہ ہلکے سے ہنس پڑا۔

”طیلس، آئندہ انکل ہی کوں گا۔“ بہت دن سے وہ جس خلوص سے اس کے ساتھ ساتھ تھے، اس کے بعد لحاظ، موت خود ہی آؤں گے لگا تھا، ورنہ رشتوں کے سلسلے میں اس کی زندگی پر جو مفلسی بیشہ سے طاری تھی، وہ اب اپنا نیت بھرے الفاظ سے عجیب سی غیرانوسیت کا احساس دلاتی تھی۔
”کیا سوچتے تھے؟“ وہ اس کے قریب بڑی کرسی پر آرام سے بیٹھے۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی! اصل میں تو اب کمرے میں بند رہتے ہوئے گھبراہٹ ہونے لگی ہے، سوچ رہا ہوں واپس لاؤں اور چلا جاؤں، جلد سے جلد۔“

اس کے لیے کئی بے تابی اور چہرے پر لاہور کے نام پر پھیلی روشنی، دونوں ہی نمایاں ہوئیں۔

کمال صاحب نے ایک دلی دلی سی آہ اندر ہی کہیں دہائی۔

کیا تھا اس شہرے، مثال میں خود رو کر بھی کسی کو اپنی طرف اس قوت سے کھینچتا تھا۔

”آپ جاتے ہیں لاہور ویسے ہی، کبھی کسی کام سے؟“ وہ ان ہی سے پوچھ رہا تھا۔

کمال صاحب نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔

”اس لیے نہیں جاتا، کسی زمانے میں ضرور گیا، بلکہ رہا ہوں وہیں، مگر اب نہیں، چوبیس سال کو ہو ہی گئے ہوں گے، آخری بار گئے ہوئے۔“

بات کرتے کرتے ان کی آواز قدرے نیچی ہوئی تھی۔
 "انتا عرصہ! مصروف رہتے ہیں شاید اس لیے۔" اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی دھونڈ لیا۔
 یوسف کمال نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔
 "فرصت تو کبھی ٹھہرکتی نہیں تھی اب بھی نہیں ہے۔" ان کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا تھا۔ سالار نے کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔
 اس درجہ غلطی۔
 اتنی ٹوٹ پھوٹ اور وجہ نامعلوم۔
 وہی عجیب پٹنایا۔
 "مہرجال تم ابھی کہیں جانے کا پروگرام مت بنانا، ڈاکٹروں نے جیسے چلنے پھرنے کی اجازت نہیں دی ہے ہم اراکم دو ہفتے کا دور رسٹ ہے۔"
 وہ اس ایک کمزور سے گزر کر اب سالار کا اگلا پروگرام سیٹ کر رہے تھے۔
 "اور سب سے اہم بات یہ کہ فی الحال تمہارا یہاں سے جانا بالکل ہی مفصلحت کے خلاف ہے حمید صاحب کا قاتل ابھی پکڑا نہیں گیا ہے تم چلے گئے تو یہ کیس بول ہی اتنا کا شکار ہو جائے گا۔"
 "یہاں نہیں ہو سکتا انکل! میں ہونے نہیں دوں گا اگر کسی نے چاہا بھی ایسے۔"
 سالار نے مضطرب سا ہوا کر یہ بول دیا۔
 "جو چاہتے ہیں وہ اصل میں انتظار ہی صرف تمہارے جانے کا کر رہے ہیں۔ تم گئے اور معاملہ ختم۔" انہوں نے بڑی بے ضرورتی ملک میلنگ شروع کر رکھی تھی جو سالار کو آسانی سے روکتی تھی۔
 "اور سے تم نے کسی پر شک کا بھی اظہار نہیں کیا ہے، پولیس کے سامنے اب جب ثبوت ملیں گے تب ہی کچھ آگے بڑھنے کی امید ہوگی ورنہ تو۔"
 دروازے پر بڑی بے تالی سے دستک ہوئی تھی۔
 "آجائیں۔" وہ غصہ لگے ہوں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ زرتاج بڑی تیزی سے اندر آئی تھیں۔
 "تم نے خیال کو ہر آتش سے الگ کر دیا ہے گاؤں زلزلے گیت پر دوک رہے ہیں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟" اس نے بات کرتے ہوئے یوسف کمال کو قطعی نظر انداز کیا تھا۔
 "نہیں" میں نے انہیں سب قفسے سے الگ نہیں کیا ہے، آپ کے آفس کو ابھی بھی وہی چارے ہیں اور چلاتے رہیں گے جب تک خدا نے چاہا۔"
 "میں مالی کی کمپنی کی بات کر رہی ہوں میں ماں ہوں اس کی اور میرا قانونی، شرعی ہر لحاظ سے حق ہے اس کی ہر چیز پر۔" زرتاج کی آواز قدرے اونچی تھی "اور میں جیسے چاہوں اس کو شیئر کر سکتی ہوں اسے اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ آفس کو سنبھالے۔"
 "غلط قسمی ہے آپ کی، کسی ایسے شخص کو جو خود قانون کی نگاہ میں مشکوک ہے، آپ کیسے میرے مالی یا باپ کے لیے کا تحسین بنا سکتی ہیں وہ بھی میری موجودگی میں۔" وہ نہ غصے میں آیا نہ ہی اس کی آواز اونچی ہوئی۔
 پھر بھی بیگم زرتاج کو اس کے لیے کی مضبوطی خوف زدہ کرنے لگی تھی۔
 "خیال کسی طرح بھی مشکوک نہیں ہے حمیدی صاحب جب مارے گئے تو وہ کراچی میں قادی نہیں ان کے انتقال کے بھی کئی دن بعد آیا۔"
 سالار نے کچھ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

میں نے حمیدی صاحب کا تو نام بھی نہیں لیا ہے، آپ کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں یہ تو خیال پر مختلف لوگوں اور اداروں کی طرف سے چھوٹے سونے دھوکہ دینے کے کیس ہیں جنہوں نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے، آپ کے علم میں بھی ہوں گے۔ جیسے جیسے اس کی بات مکمل ہوئی زرتاج نے چہرے کی آڑی ہوئی رنگت بحال ہوئی۔
 "وہ سب بول ہی جھوٹے قصے ہیں، خیال کو کیا ضرورت ہے ایسی حرکتیں کرنے کی، ہمیں کوئی کمی نہیں ہے۔"
 پیسہ کسی کے بھی پاس ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا یا اور کھینچے گا ضرورت کنجاش سے آگے ہی چلتی ہے زیادہ تر۔"
 "مہرجال میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" وہ جھنجھلا کر اس کے بالکل قریب آکھڑی ہوئیں۔
 سالار نے نظر پھر کر اس زہریلی بھیجی عورت کی طرف دیکھا۔
 "انہی انرقی ویت مت کریں بھانجرا، ہمیں ہمت جلد آپ کو اس کی ضرورت پڑنے والی ہے۔"
 "وہ تمہیں کیسے دے رہے ہو۔"
 "نہیں مشورہ۔"
 "مجھے بتا ہے کہ یہ سب کس کی شہ پر ہو رہا ہے، تمہاری پشت پناہی کرنے والے مجھ سے اپنے پرانے حساب چکانے کی کوششوں میں ہیں اسٹین کے سانپ۔"
 "تو خیر جلد انہوں نے بڑے واضح طور پر یوسف کمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔
 جس کے جواب میں انہوں نے محض کندھوں کو ہلکی سی جنبش دی اور مسکرا دیے۔
 "سانپ آپ کی اسٹین میں نہیں ہے سر پر بیٹھا ہے، کب کہاں آپ کو بھی ڈس لے اس وقت سے اور میں آپ بھی۔" سالار نے بڑے سرسری سے انداز میں وارننگ جاری کی اور کمال صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔
 "انکل! لڑا آپ انہیں میں میری مدد کریں گے میں دو چار قدم چلنا چاہتا ہوں۔"
 "ہاں کیوں نہیں، تمہیں دو چار قدم اس سے زیادہ نہیں۔" کمال صاحب تیزی سے آگے بڑھے تھے۔
 "فول پر نو روہتے ہوئے سالار اٹھ کر کھڑا ہوا۔
 "مجھے اس کھڑکی تک لے چلیں میں کلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔"
 "تمہارے لیے اچھا بھی ہے، کو تو میں وہیں کر ہی بیٹھا ہوں۔" تھوڑی دیر وہاں بیٹھو گے تو اچھا فیل کرو گے۔"
 سالار بیتے ہوئے وہ اسے اس طرف لے جاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
 چند لمحوں کے لیے تو زرتاج کو ایسا لگا جیسے وہ یہاں ہی ہی نہیں۔
 کمال اور سالار دونوں ہی شاید انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔
 انہیں زرتاج کیسے کہہ رہے تھے۔
 "کتنی عجیب سی بات تھی کہ وہ بھی اس طرح نظر انداز کی جاسکتی تھیں۔
 اور وہ بھی کون کہا تھا۔"
 ایک دوسرے کو قانع و مسلمانی کی طرح ٹھوکر لگا کر پیش پڑے کیا اور دوسرا۔
 ان کی نفرت پھر ہی نگاہ یوسف کمال پر جا کر رہی۔
 "چلی لکیں۔" چند لمحوں بعد سالار نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا تو یوسف کمال نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔
 "ہاں مگر اس سے ہوشیار نہ سالار اور دست کی نہ پرور عورت ہے، بڑا پکا حساب کتاب ہے اس کا۔"
 وہ ہلکے سے مسکرایا۔ "آپ مجھے بتا رہے ہیں۔"

”یاد دلایا ہوں۔“
 ”بے فکر رہیے میں کہتے ہو تو نہیں، لیکن یادداشت ضرور اچھی ہے اور یادوں میں اگر تمخیاں ہی رقم ہوں
 صرف تو وہ کچھ زیادہ ہی اچھی رہتی ہے۔“
 سامنے لان میں مجھے موسم بہار کے پھولوں پر نگاہ جھاتے ہوئے وہ آہستہ سے بولا۔
 ”ایک بات پوچھوں انکل!“
 ”ہوں!“

”وہ آپ کی بہن ہیں، سگی بہن اور میں ہمیشہ یہ ہی سمجھتا رہا کہ آپ دونوں کے تعلقات بہت ہی زیادہ اچھے ہیں
 اور ظاہر ہے یہ بڑی فطری سی بات ہے، میری بھی کوئی بہن ہوتی تو شاید میں اسے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا۔“
 ذرا دیر کے لیے بوجھل سی خاموشی کمرے میں آکر رک کر سالار کی کئی ساہی بات تھوڑی سی غور سے
 ”شاید میں کچھ زیادہ پر سل ہو رہا ہوں۔“ اس نے معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈنے چاہے تھے مگر وہ اپنا بیت
 سے مسکرا دیے۔
 ”پھر وہی تکلف والی باتیں۔“

”اچھا کیا جو پوچھا، اب بتائیں میں تمہیں اپنی بات سمجھا بھی پاؤں یا نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ خون کے
 رشتے اگر اپنی کشش کھودیں تو اس سے زیادہ بے رنگ اور تکلیف دہ رشتے کوئی اور نہیں ہو سکتے، یہ دشمنی سے بھی
 زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں، میرا اور ذرا تاج کا بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔“ اپنی بات کرتے کرتے وہ کچھ جو تک
 سے گئے۔
 ”اگر یہ یہ نہیں ہے اب تک۔“

”کون؟“ ان کی نگاہ کے تعاقب میں سالار نے بھی نظروں ڈالی۔
 ”یہ ذرا نیو رہتا نہیں کیا نام ہے اس کا؟“
 ”راجو! سالار نے انہیں یاد کرنے کی زحمت سے بچایا۔
 ”ہاں، ’راجو‘ پرانا ڈرا نیو ہے ذرا تاج کا، لیکن اب تو بہت کم کام کرتا ہے، بلکہ شاید گاڑی لے لی ہے اس نے
 اس سے۔“ انہوں نے کیاری کے پاس گم سمم بیٹھے راجو کو دیکھتے ہوئے سالار سے تھوڑی سی چٹائی۔
 ”شاید سوئیے بھی ذہنی طور پر بے چارہ بہت ہی طبعی ڈسٹرب سے گاڑی روڑ پر نکلے گا بھی تو نقصان ہو سکتا
 ہے، خاص آوی ہے ان لوگوں کا اس لیے شاید غلامی و غیو کر رہے ہوں۔“
 ”تم اب بھی ان لوگوں کے لیے خوش گمانی رکھتے ہو، یہ حیرت کی بات ہے۔“ وہ بہت کم ہنستے تھے مگر اس وقت
 جس پر بڑے۔

”مطلب!“ سالار نے اچھے ہوئے انداز میں یوسف کمال کی طرف دیکھا۔
 ”اس لڑکی کے غائب ہونے کے بعد سے اس کا حال خراب ہوا ہے، شادی ہونے والی تھی اس کے ساتھ۔
 روزی یاد ہے تمہیں بہت چھوٹی سی آئی تھی یہاں!“
 ”نہیں لی تھی، عظمت ہوا کے پاس میں بہت کم آتا تھا یہاں، مگر اس وقت وہی دونوں تھیں جو میرے آنے پر
 خوش ہوئی تھیں، ان دونوں کے جانے کے بعد تو اس گھر میں صرف وہی رہا ہے۔ یہ نہیں کیوں چھوڑ دیا دونوں نے
 یہ گھر میری تو ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی ہے، اتنے سے پہلے ہی چاچلی تھیں۔“
 سالار نے شہرت سے اس وقت ان دونوں کو یاد کیا تھا۔
 یوسف کمال کے چہرے پر تذبذب کے سے آثار ابھرے۔

NEW TOUCHTIME
Minto
Calcium fluoride toothpaste

بدل دے زندگی کا ہر انداز



چچی
منٹو
ٹوٹھ پیسٹ



- ✓ کیلشیم اور فلوئورائیڈ سے وائٹ منیپوٹ
- ✓ Extra Whitening سے
- ✓ دانتوں پر انوکھی چمک اور سفیدی
- ✓ تھن Tartar کنٹرول
- ✓ سب سے زیادہ دانتوں سے چمکی رہا



Extra Whitening

”کیا ہے؟“ وہ بھی اٹھنے کے موڑ میں نہیں تھی رات کی سستی ابھی تک سوار تھی۔
”اٹھ جاؤ دیکھو کتنا دن چڑھ گیا ہے۔“
”کون سی نئی بات ہے دن تو روزی چڑھتا اور ڈوتا ہے۔“
اٹھتے اٹھتے اس نے دوبارہ تکیہ میں منہ دینا چاہا تو شانائے اس بار پہلے سے بھی زیادہ زور سے آواز دی۔
”کیٹی! اٹھ جاؤ دیکھو کتنا دن چڑھ گیا ہے! اٹھ جاؤ دیکھو کتنا دن چڑھ گیا ہے! اٹھ جاؤ دیکھو کتنا دن چڑھ گیا ہے۔“
اس کی آواز میں بڑی واضح گھبراہٹ تھی۔
”کیٹی نے ایک دم ہی آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھی۔“
”خیر تو بے ناشائے!“

”ہاں! مژدرا تیار ہو جاؤ جلدی سے یہ کپڑے میں نے نکال کر رکھ دیے ہیں۔“
جلدی جلدی گتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی کیٹی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیا۔
”کیوں تیار ہو جاؤ؟ کہاں جانا ہے صبح ہی صبح؟“ ای اور ناشائے نے کیا پروگرام بنالیا اچانک رات کو تو کچھ نہیں کہا تھا۔

شام کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا جو معمول سے ہٹ کر تھا۔
”رات کو تباہ تھا کہ وہ لوگ یہاں آجائیں گے منگرو تو بس آدھ گھنٹے کا نوٹس دے کر سر پر آچھپے اب اتنے بڑے لوگ۔ منع تو نہیں کیا جاسکتا تھا نا!“
کیٹی کی نگاہ سامنے صوفے پر رکے کپڑوں پر پڑی اور وہیں ساکت ہو گئی۔
جو کچھ شام کے تیز تیز ہونے میں سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ اس ذوق برق جوڑے نے سمجھایا تھا۔ منگرو پھر بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔
”کیا بکواس ہے شام! تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟“ پھر زیادہ ہی بد قیاس ہو گئی ہو۔
”کی بارہ اتنی زور سے شام چینی۔ شام کے چہرے کا رنگ سمجھ بھر کے لیے یہ کیا سا پڑا۔“
”غصہ نہ کر کیٹی! شام پاش کپڑے بدل لے اور زور سے نہیں بیٹا! اندر ہال میں گوازا جائے گی۔ بے کار میں تاثر خراب ہو گا۔“

اس کے انداز میں ذرا سا بھی شائبہ نہیں تھا کہ وہ کیٹی کی بد قیاسی پر رہائی ہو۔
”الٹا خوشامد محبت چالپوسی!“
”دیکھو تو کتنا پیارا سوٹ ہے! پھن کر بالکل شہزادی لگے گی جلدی سے منہ دھو لے میں تیار میں مدد کروں گی“
”دس منٹ بھی نہیں لگیں گے۔“
کیٹی نے خالی خالی نگاہوں سے شام کو دیکھا۔
یہ سارے جملے بڑے ہی مالتوس تھے۔
ہزار بار کہتے ہوئے!
یہاں کے درو دیوار میں ان جملوں کی بازگشت بلند آواز کو مچتی تھی۔
خاص تاریاں!
حسین گتے کی خواہش اور حسین تر دکھائی دینے کی جستجو! بازیر واریاں خوشامد۔۔۔
کون سی لڑکی بھی جوان باتوں سے مالتوس بھی منکر ایک دہ نہیں۔



سکلیہ زینتین



بدلتے موسم کی ہلکی ہلکی ٹنک ہوائے سب سے پہلے ارشاد ملی کے کنوڑ پھیپھڑوں کو متاثر کیا۔ دن بھر کی شدید گرمی کے بعد شام کی ٹھنڈی ہوائے اس کے ناکوں جسم کی پسیلوں میں وہ معمولی سی خنکی بھی چھپنے لگی۔ اسی لیے اس روز اس نے کینڑ کو گرم کپڑے اور ریشمیاں لٹکانے کے لیے کہہ دیا تھا۔
تھکے پراٹھے کینڑ نے کچھ لاپرواہ انداز میں اس کی بات سن کر تال دی اور آسمان کی گہری گہری بدیلیوں میں بھانٹنے لگی جیسے ان میں چھپے اسرار کو کھوجنا چاہتی ہو۔ اس کے لیے تو اس موسم میں وہ دل فریبی اور رعنائی تھی۔ کھلتے پھول، چمکتے پرندے اور اڑتی نقلیں من کو بھالی تھیں۔ پڑوا کے سرو جھونکے اس کے چہرے سے بدن کو چھوتے ہوئے اسے بڑے نوبے سے جذبوں سے سرشار کر رہے تھے۔ ان جذبوں کی

کچھ چونک کر وہ جیسے اپنے آپ میں واپس آئی۔
”اس شام کا یقیناً کون ہی خراب ہوا ہے، معلوم نہیں کس کے لیے تانی نے کہا ہو گا؟“ آخر بیٹہ سیرال لڑکیاں پر فارم کرنے آئی رہی ہیں، ان ہی میں سے کسی نے پھر رکھ لیا ہو گا اپنا پروگرام یہ بے چاری کچھ انسانی سمجھ بیٹھی ہے۔
وہ پورے یقین کے ساتھ اٹھ کر واش روم چلی گئی واپس آئی تو شام کیڑوں کے پاس کھڑی تھی۔
”لو جلدی سے پن لو، ہلکا سا بھی میک اپ کر لو، تو وہ پلک بھپکا بنا ہنسل جائیں گے، مٹاؤں میں یہ پن لو، خاص تانی کے ہیں۔“
شام نے اس کے نکتے ہی بدایت دینا شروع کی تو بار بار وہ کوشش کے وہ اپنا ضبط کھو بیٹھی۔
”جسٹ شاپ شام! سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں، جا کر پوچھ کر تو، تمہیں کے کپڑے ہیں یہ، امی کہاں ہیں انہیں بلو، ہو کیا رہا ہے سیرال آخر؟“
تیز تیز ہونے لگے وہ کمرے سے نکل کر رتوے میں آئی۔
”امی! امی! کہاں ہیں سب لوگ؟“ وہ چند قدم آگے بڑھتی چلی آئی۔
تب ہی اس نے آخری کمرے پر ہال میں سے گھینڈ کو آتے دیکھا۔
”کیوں شور مچا رہا ہے بیتی! اممان آئے بیٹھے ہیں۔ اندر تک آواز آرہی ہے۔“
دب دب سے بچے میں خفا ہوتی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر آگیا۔ ”سمجھتے ہوئے اسے کمرے تک لے گئی۔“
”اور اب تک تیار بھی نہیں ہوئی ہو شام! کیا تمہا تجھ سے کہ شقی کو جلدی سے تیار کروا دے۔ اتنی لاپرواہی تو تجھ میں بھی نہیں رہی، کب سے انتظار کر رہے ہیں ملک صاحب، سارا دن بیٹیں تو تمہیں بیٹھنے رہیں گے بڑے آدمی ہزار کام لگے ہیں جان کو! اس سب عادت ایک ہی سانس میں دس معاملات پر اظہار خیال۔“
بیتی نے صاف ٹوٹ کیا تھا کہ وہ اتنی دیر میں اسے ایک بھی لفظ کہنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔
”میں کسی کے سامنے نہیں جاؤں گی اور کیوں جاؤں! ایسے ہی خواہ مخواہ۔“
ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کیا۔
گھینڈ نے مت غور ہے اس کے چہرے کو دیکھا، بھال پکی بار عاقوت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔
سو کون سی نئی بات تھی۔

سیرال بڑے بڑے اوڑھل سدھارے تھے، یہ تو پھر اپنی ہی بیٹی تھی اور کون سا وہ اس کے لیے کچھ برا کرے جاری تھی۔
”ساری زندگی میری شکر گزار رہے گی، عزت کی زندگی چاہیے تھی نا تجھے، وہی مل رہی ہے، بیتی! ملک صاحب باقاعدہ رشتہ مانگنے لال کے پاس آئے ہیں، ابھی سوچا بھی نہیں تھا میں نے، گناہ برا آدمی میرا دام بٹے گا۔“
گھینڈ کے چہرے پر بڑی روشنی سی تھی۔
”میرا سودا امی! بیتی کے لب کھلے اور بند ہوئے۔“
”کناج کر رہے ہیں تیرا، شادی ہوگی، سارے حقوق دیں گے، آگے تیرے بچوں کو بھی شناخت ملے گی اور کیا چاہیے تجھے۔“ گھینڈ کو مکمل اطمینان قلب حاصل ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

گرم گرم پٹیں اس کے گرد کسی گرم دوشالے کی طرح لپیٹیں کہ اسے بدلتے موسم کا بالکل بھی احساس نہ ہو رہا تھا۔

”کینز۔ دی کینز۔ سخی کیوں نہیں۔ اٹھ جا۔۔۔ اس ٹھنڈی ہوا سے میرا بدن اگڑنے لگا ہے۔ جلدی سے مجھے میری ہنڈی نکال دے۔“ ارشدابی بی نے سرودی سے سگڑتے ہوئے اسے بدایت دی۔

”اوموں۔۔۔ کینز نے بے چینی سے پہلو ہلا۔ اس کاٹنے کا بالکل بھی موڈ نہ ہو رہا تھا۔ یہ موسم تو دل کو بھلنے والا تھا اور ارشدابی بی کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ موسم میں ابھی اتنی شدت نہ تھی لیکن ارشادابی بی خراب صحت اور ناگہانی وجہ سے دہلی دے رہی تھی۔ اس کی کمزور ہڈیاں اتنے بیٹھے چنچو چنچو لیتی تھیں۔ جو ٹول کے وردے اسے بے کار کر دیا تھا۔ سخت حالات نے اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔

اڑتیس برس کی عمر میں ہی وہ پچاس سالہ اور عرصہ عمر عورت دکھائی دیتی تھی۔ لیکن یہ بات ابھی کینز نہ سمجھتی تھی۔ وقت نے اس کی سوجھ بوجھ کو مدیدہ کر دیا تھا مگر اس کے شعور میں وہ گہرائی اور چٹکنی نہ آئی تھی کہ وہ نہ اچانک رنجش مال اور اپنے خستہ حالات پر زیادہ غور کرتی۔

اس کے پاس اس کی عمر اور دلچسپی کے لحاظ سے بڑے رنگین اور نت نئے موضوعات تھے وہ زیادہ تر ان ہی میں مگھلی روتی تھی یا پھر اس کی توجہ اپنے لباس اور آرائش پر زیادہ رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کنار آکھوں میں کاجل کی لکیر بھیجتی تو اس کے مدد بھرے ننوں سے جوالی کا شمار چھلک چھلک پڑتا اور شمالی رنگت کچھ اور بھی دیکھ لیتی۔ ایسے میں یا سر کا خیال اسے کچھ اور بھی مدھوش کر دیتا۔

”ہائے۔۔۔ آئے۔“ ارشدابی بی نے کچھ اور زور سے کراہنا شروع کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ جلدی سے اٹھی اور اپنی تھوڑا قیس کو ٹھیک کرتے ہوئے سدھما ارشدابی بی کے پاس چلی آئی۔ وہ تکی سی

چادر میں لپیٹ کر اوڑھ لی تھی۔

وہ بیزار سی سے کوٹھڑی میں بیٹھ گئی۔ جہاں ارشدابی بی اپنے پیچھے پرانے اور ٹوٹے ہوئے سازو سامان کو کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھال کر رکھتی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ دو عدد اوچڑی تو اڑوالے پنک بھی وہاں دیوار کے سارے کھڑے تھے۔ ایک طرف لکڑی کے بکسوں میں کچھ گرم کپڑے تھے اور اس سے نیچے والے بجے میں رضائیاں اور حصے بے کپل اور توشکھیں تھیں وہ بد رنگ اور پرانے بستر اور کپل ہی سرد راتوں میں حرارت دیا کرتے تھے۔ وہ جیسے بھی تھے بذر رنگ اور پختے ہوئے لیکن ارشدابی بی کو متاع حیات کی طرح عزیز تھے۔ ایک طرف اوپر تھے رکھے ایک دوسرے پر لڑھے خلی مریمان اور برتیاں تھیں جو کبھی بھاری اوپر تک بھرتے تھے۔ ان میں ارشدابی بی اناج کو سنبھال کر رکھتی تھی۔ کبھی اور آٹے کے ڈبے بھی وہیں رکھے جاتے تھے مختلف انواع کے سامان کی عجیب سی دھال اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں دیکھیں گی کبھی اور کینز کے دل پر چڑھ رہی تھی۔

اس نے لوہو والا یکساں کھول کر ارشدابی بی کا کپل اور خاص طور پر ہنڈی نکال لی۔ دہلی کے آسٹروالے اس سینہ بند کی ظاہری حالت بہت چیکٹ اور خستہ تھی مگر ارشدابی بی کے پاس ایک صرف یہی واحد ہنڈی تھی جو اس کے کمزور تن پر ڈھال بن کر موسم کی ریشہ داندیوں سے اس کا قلع کرتی تھی۔

وہ فطرتاً ”نجوس نہ تھی“ حالات نے اسے بہت محتاط اور کھلتے شعار بنا دیا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کینز کی بھی فکر تھی۔ کل کو اس کا شادی بیاہ بھی کرنا تھا اسی لیے وہ جمع جوڑ میں لگی رہتی تھی۔ اس کا شوہر فضل واوا ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی اتنی گفنی نہ تھی کہ ارشدابی بی عیش و نشاط سے رہ پائی۔ سو وہ بہت چھوٹک پھوٹک قدم اٹھاتی تھی۔

کینز نے ارشدابی بی کا کپل اور ہنڈی نکالنے کے بعد دیگر سامان بھی باہر نکال لیا کہ وہ دن کی روشنی میں

اتیس دھوپ دے سکے اور اسی سامان میں اپنی بد رنگ سی نیو زی رنگ کی گرم شال کو کچھ کر اس کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔ مدت ہوئی وہی شال ہر سڑی میں اس کے کپل آئی تھی لیکن اب اس پر لٹی شال ہے اس کا دل آٹا گیا تھا۔ اس کا رنگ مایہ زار کیا تھا اور ہڈوں پر بنا ہوا کام بھی خاصا بد رنگ ہو گیا تھا۔ اس کا تکی چاہتا تھا کہ وہ نئی شال لوٹھے اور جب وہ شال اوڑھ کر یا سر کے سامنے جائے تو یا سر اسے دکھتا رہ جائے۔

اس نے جلدی سے کام فرمایا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلتی اس کی نظر کونے میں رکھی پتی پر جا کر روک گئی۔ عرصہ ہوا وہ پتی بھی وہاں اسی کونے میں اسی طرح بند رکھی رہتی تھی۔ ہر سال ارشدابی بی اس کی بھال پونچھ کر کے اور اس کا سامان آگے پیچھے کر کے اسی طرح بند کر کے رکھ دیا کرتی تھی۔ اس پتی میں کینز کے بست سے خواب، ارمان اور خواہشیں دفن تھیں وہ چاہتے کے باوجود بھی اپنی حسرتوں اور آرزوؤں کی تکمیل نہ کر سکتی تھی کیونکہ اسے اس پتی کے سامان کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہ تھی۔

دراصل اس پتی میں اس کا سامان اسل سے جمع ہونے والا چیز رکھا ہوا تھا جسے ارشدابی بی نے اپنی بہت سی خواہشوں اور ضرورتوں کو مار کر بنایا تھا۔ ہر سال وہ خود اس پتی کی صفائی کرتی تھی لیکن پچھلے دو سالوں سے مستقل بیماری نے اسے کسی کام کاج کے قہیل نہ چھوڑا تھا۔ وہ ذرا سا کام کر کے ہی ہانپنے لگتی تھی۔ اسی لیے اس پتی کو بھی نہ دیکھ پاری تھی اور پتی کی اوپری دھکڑ سے الٹی پڑی تھی۔

اس نے لاکھ خود کو روکا مگر پھر بے اختیار ہو کر پتی کھول ہی ڈالی۔ بہت سے رنگین، چمکتے دیکھنے سے کپڑوں کا عکس اس کی خواب ناک آنکھوں میں جھلکانے لگا۔ گلابی، ہرے، اور گولنی اور جامنی کپڑوں پر وضع وضع کے سنہری دھبلی نمداں اور رنگی دھالوں کے ساتھ موتی اور ستاروں کی بھاری اثر آئی۔ ان کی جھلکاہٹ نے کینز کی آنکھوں میں بے لومور سے سپنوں کو خیر کر دیا۔ ارشدابی بی نے اپنے

ہاتھوں سے اس کے پرانے پٹے تھے۔ بستر کا چادرول پریشے لگا کر کڑھائی کی تھی۔ ان سب کپڑوں کے پاس ہی سبز اور نیلے رنگ کی نئی غور شال پر سبز پونیاں جیسے کچھ اور بھی نمائیاں ہو رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی کینز کا دل ہلنے لگا۔

جب غموار کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی تب وہ شال خاص طور پر ارشدابی بی کو ملی تھی۔ اس وقت اس شال کے لیے اس کا بڑا بچا چلا تھا لیکن ارشدابی بی نے اس کی ایک نہ ملنی۔ عمر کے چودھویں برس میں ہی اس کا یا سر سے نکاح ہو گیا تھا۔ اب صرف رخصتی باقی تھی۔ لیکن یا سر سے پہلے اس کی بڑی بہن کی رخصتی ہوئی تھی اس کے بعد ہی یا سر سے رخصت کر کے لے جا سکتا تھا کیونکہ یہ ان کی برادری کی رسم تھی کہ اگر بہنوں کی شادیوں کی عمر ہو تو بھائیوں سے پہلے انہیں رخصت کیا جائے یا تھا اور ابھی تو یا سر کی بہن کی کہیں بات بھی کی نہ ہوئی تھی۔

کچھ دیر کی ٹھیک ٹھاک کے بعد یا سر اس نے دل کے فضلے کو مان لیا۔ چلے کوٹھڑی سے باہر جھانک کر اپنی تسلی کر لی۔ ارشدابی بی ابھی تک پنک پر سٹری پڑی تھی۔ اس نے جیسے وہ شال نکال لی اور اسے دوپٹے کی شکل میں پچھا کر کن اکھیل سے ارشدابی بی کو دیکھتی ہوئی سیدھی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور شال کو اپنے بکیر کے نیچے رکھ دیا۔ پھر جلدی سے جا کر بے حال دے سدھما ارشدابی بی پر کپل ڈال دیا۔ ہنڈی اس کے سر پہنے رکھ دی اور خود وہی کے لیے حشر نے لگی۔

”کھل جا رہی ہے کینز! پہلے مجھے گرم قہوہ پتا دے۔“ ماں کی آواز اس کے قدموں سے لیٹ گئی۔ پہلی بار تو اسے دل کی مراد پوری کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ارشدابی بی کو قہوہ بنا کر دیا۔ قہوہ پی کر اس کے گھبرے ہوئے اعضا کو اتار سکون ملا کہ وہ کپل میں دیک کر غولنی میں چلی گئی۔ قہوہ پینے کے دوران وہ ہنڈی بھی ہنچ گئی تھی۔

کینز جلدی سے دوسرے کمرے میں آگئی جہاں اس

نے تیسے تھے شہری پھولوں والی شال چھپا رکھی تھی۔
 نیکے کے نیچے سے شال نکال کر چند لمحے تک وہ بے
 خودی میں اسے نگے لگی۔ آج چوری چھپے وہ اپنا ارمان
 پورا کر سکتی تھی اس نے شال کی ترہ کھول ڈالی مہینہ
 اور نئی شال کے ذریعہ ان میں شہری پھولوں کا انکار اس
 ہوا۔ اس نے شال اپنے سر سے لے کر اپنے گرد لپیٹ
 لی اور شال کے ہالے میں اس کا معصوم سا رمانوں بھرا
 چہرہ کچھ اور بھی لودہ پڑ گیا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس نے نرم ملائم پروں
 کی ہلکی پھلکی چادر اوڑھ لی ہے۔ چشم زدن میں ہی اس
 نے خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا۔ وہ ریٹیم کی چادر
 اس کے بدن پر پھولوں کی طرح سرسرا رہی تھی۔ آپ
 ہی آپ مسکراہٹ اس کے لہاس چہرے پر پھیل گئی۔
 چشم تصور میں یا سر چلا آیا تو وہ اور بھی لیا گئی۔ نچ ج کے
 وقت وہ چوہ کے سن میں تھی مگر اب اٹھارہ بھی یاد کر
 چکی تھی اور اپنے جینز کے جوڑے تو وہ اس سے بھی
 بہت پہلے سے دیکھتی آ رہی تھی۔ ارشاد بی بی نے وہ
 جوڑے اس کی پیٹنج سے دور رکھے تھے مگر آج وہ کسی
 طرح ان تک رسائی میں کامیاب ہو رہی تھی۔
 وہ سرشاری کیفیت میں کھولی جیسے خود کو بھی بھول
 سی گئی تھی۔ اسی وقت ماں کی کراہی سی دھول سر پر
 پڑی تو سارا فتنہ ہرن ہو گیا۔

”تیرا استیاس نہ ہو تو سہ یہ کیا کر دیا تو نے“ درج کا
 سامان پہلے ہی سے بہت لیا۔ ادنیٰ نامزد رکھ اسے
 بد شگونی نہ کر۔ ارشاد بی بی نے جانے کب چنگ سے
 اٹھ کر اس کے سر پر پہنچی اسے معلوم ہی نہ ہوا۔
 وہ کچھ دیر پہلے تو کھیل میں دیکھی پڑی تھی اور اس کی
 حالت بڑی اتر گئی مگر شاید گرم قوسے کی تاثیر بھی یا پھر
 روٹی دار بندی کا مکمل تھا کہ بڑی جلدی اس کے جسم
 میں حرارت دوڑ گئی اور اس نے بہرہ چھو ڈیا۔ اس نے
 آگے بڑھ کر سرعت سے اس کے وجود پر سے شال کو
 نوج لیا۔ لوں پکڑے جلنے سے زیادہ کثیر کو اس بری
 طرح شال چھینے جلنے پر دکھ ہوا تھا۔ وہ شال اسی کے

لیے تھی مگر وہ اسے استعمال نہ کر سکتی تھی۔ اس کے
 علاوہ بھی چند ایک جوڑے تھے جو اسے بہت پسند تھے
 مگر انہیں بھی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔
 تاروں بھرا دینہ تو ہر وقت اس کی نظروں میں لہراتا تھا
 تھا۔ لیکن کی کڑھال والا سوٹ بھی اسے بے حد پسند تھا
 مگر وہ بھی اس کی دسترس میں نہ تھے۔

اس روز اسے یا سر پر جی بھر کر غصہ کیا جو اسے
 رخصت کرا کر لے جایا نہ رہا تھا۔ کوٹھڑی کے
 بچہ واٹسے اکیلی بیٹھ کر وہ خوب روٹی اور روٹے کے
 ساتھ ساتھ یا سر پر بھی غصہ کرتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں
 تھکا ہارا فضل داؤد اپنا چھکڑا لیے چلا آیا۔ اس کا کام اس
 چھکڑے پر ایک جگہ سے دو سری جگہ سلان پھینکا تھا۔
 روز کی باڈی اتنی ہو جاتی تھی کہ گزارا ہو ہی رہا تھا
 جب بھی اسے گاؤں سے باہر جانا پڑتا تو وہ دو گنی باڈی
 وصول تھا۔ اس روز فضل داؤد پرے گھر لوٹا تھا مگر اس
 کی جیب میں اضافی کمالی ہوئی جس کی جگہ اس کے
 گھٹے ماندے چہرے کو شگفتہ کر دیا کرتی تھی۔ فضل داؤ
 اس روز بھی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ ارشاد بی بی نے کھانا
 گرم کرنے کے لیے اسے کواڑ دی تو وہ روٹھی سی چلی
 گئی۔

”مگر حرقہ قسی مہارانی...؟“ اسے دیکھو تو سہی میری
 دن رات کی محنت سے جوڑے ہوئے جینز کو یہ مٹی
 کرنے پر تکی ہے کیسے کیسے خون پیسہ ایک کر کے
 دھجی دھجی کر کے اس کا جینز جوڑی ہوں اور یہ ہے کہ
 اسے سینے پر تکی ہوئی ہے۔ اسے دیکھا تو ارشاد بی بی کا
 قصہ پھر نمودر آیا اور وہ اسے اتنی سناتے لگی۔
 ”کیا فائدہ۔ میرے لیے ہے تو میں اسے پہن تو
 نہیں سکتی تھ۔“ اس نے ٹوٹے دل سے کہا۔
 ”اری بھولی آبیوں بھلی ہو رہی ہے۔ وہ سب تیرا
 ہی ہے تو نے ہی برتا ہے اسے۔ ماں کی بات کا برا نہ
 مان وہ تیرے بھلے کی بات کر رہی ہے۔“
 فضل داؤد نے دھڑکے سے سمجھایا۔ ارشاد بی بی کے
 مقابلے میں وہ زبان کا نرم تھا۔

”اس سال میں اس کی رخصتی کی بات کر لوں گا۔“
 اس نے ارشاد بی بی کو اطمینان دیا۔
 ”کمال... وہ کتنے سے پہلے اپنی ذہرہ کو بیاہیں گے پھر
 اس کی ڈولی اٹھائیں گے۔ ابھی تو مجھے کچھ آثار نہیں
 دکھ رہے۔“ ارشاد بی بی مایوسی سے بولی۔
 اس کے ساتھ ہی کثیر کا دل بھی چپا کمال میں کہیں
 ڈوبتا چلا گیا۔

اسے ان فضول رسم و رواج پر غصہ آنے لگا۔
 ساتھ ہی یا سر کے لیے بھی دل میں مزید غصے کے
 جذبات بھڑکنے لگے۔ اس نے اپنے وجود پر بوسیدہ
 لباس کو دیکھا تو غصہ اور بھی سوا ہو گیا۔ گھر میں پہننے کے
 کپڑے تو اس ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ گھسے ہوئے
 بدرنگ سے جن میں جا بجا پیوند اور سوراخ ہوا کرتے
 تھے۔

فضل داؤد ارشاد بی بی کی آپس کی باتوں سے بد دل
 ہو کر وہ سوئی میں آکر کھانا گرم کرنے لگی۔
 وہ ساری رات ایسے ہی بے چین ہی تھری۔ سارا
 وقت وہ کسی ان دیکھی جھلملی کے پیچھے بھاگتی رہی۔
 ”ابھی تو وہی کیفیت برقرار تھی۔ ارشاد بی بی اب چاق
 وچند ہو گئی تھی اور کوٹھڑی میں گھس کر اس کے جینز
 کی پٹی کو کھول کر کھنڈ پر کڑی تھی۔ اس نے چور
 نظروں سے کوٹھڑی کی طرف دیکھا جہاں وہ سارا سامان
 جمع تھا جو صرف اسی کے لیے تھا مگر وہ ابھی اسے استعمال
 نہ کر سکتی تھی۔ اسے شدت سے اس وقت کا انتظار تھا
 کہ جب وہ آزادی سے سب کچھ برتے گی۔

اسے درد اڑے پر پڑی تھی میں ناکا لگا تھا اور نہ
 وہاں اور بھی بڑا سوراخ ہو جائے۔ اس نے کٹڑے میں
 پڑی ہوئی جین نکال لی۔ جین اترتے ہی جیسے اس کے
 سامنے چاندنی سی بھڑکی۔ سامنے ہی یا سر کھڑا تھا۔ سدا
 کے ہتے مسکراتے اور ترو تارہ سے یا سر کو دیکھ کر خلاف
 معمول اس کا چہرہ نہیں کھلا کیونکہ وہاں پر نیا صدمہ ابھی
 تازہ ہی تھا۔ کل ہی کا تو واقعہ تھا کہ جب ارشاد بی بی نے
 سہ رنجی سے اس کے جینز کی شال اس پر سے گھسیٹ

لی تھی اور خوب باتیں سنائی تھیں اس لیے اسے یا سر کی
 غصہ تھا۔

”خیر تو ہے منزل کیوں خراب ہے؟“ اس کے
 گھڑے گھڑے سے تھوڑا سا سے چھپنے نہ رہے۔ اس کا
 پوچھنا غصہ ہو گیا۔ وہ تو جیسے اس پر الٹ بڑی کل کی
 ساری چٹا آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ کہہ سنائی
 اور اس ساری بات کا ذمہ دار یا سر کو قرار دیا۔ اس کی
 اس معصوم سی ادھر وہ مسکرایا۔ صرف جینز کے چپکے
 دیکھے کپڑوں کو پہننے کے لیے وہ رخصتی چادر ہی تھی اور
 لڑکی ہو کر اپنے منہ سے رخصتی کا تقاضا کر رہی تھی۔
 اپنے غصہ میں وہ ساری شرم بھلا کر نکلتی تھی۔

”اگر یہ بات ہے تو میں تجھے خود چاچا سے چوری
 چوری اچھی اچھی جینز چس لادیا کروں گا۔ تم اسے جینز کی
 جینی میں نہ رکھنا بلکہ استعمال کر لینا۔“ اس نے افسردہ
 سی کینز کے آنسو پونچھے۔

اس نے اپنا وعدہ وفا بھی کیا۔ جب اس نے اسے
 رنگین موشیوں اور گھنٹہ دھوک سے آراستہ پراندہ لا کر
 دیا تو وہ خوش ہو گئی۔

پھر ایک دن یا سر اسے یہ خوش خبری سناتے آئی گیا
 کہ ذہرہ کی بات ملی ہو گئی ہے۔ یہ سندھ سے سن کر اس پر
 دھواں سے طاری مایوسی اور پشیمانی از خود ہی زائل ہو
 گئی۔

”بس اب تو بھی اپنی رخصتی کی تیاری کر۔“ یا سر کی
 سرگوشی اس کے من میں اترتی گئی۔
 ارشاد بی بی نے بھی فضل داؤد کو اس کی رخصتی کے
 انتظامات کے لیے پہلے آگاہ کر دیا۔

ذہرہ کی شادی گھر پر طرہ سے انجام پائی اور ذہرہ
 کی شادی کے بعد یا سر کی ماں نے بھی کینز کی رخصتی
 کے لیے کہہ دیا۔ سب کام از خود ہی طے ہوتے گئے
 اگلے ماہ کی رخصتی طے پاتے ہی ارشاد بی بی میں بھڑاتی
 بھڑتی اور طالت آئی۔ اس بند بختی میں سے تا ممل اور
 احوال سے کپڑے باہر نکل آئے۔ کچھ نئے سوٹ بھی
 آئے تھے کینز میں تا معلوم تک کہ لیے یہ سب



ایک طبیعت



وہ بڑے آسودہ قلبی کیڑے۔

چھٹی کی کھٹی مٹی تو وجہ نے تمام بچوں کو لائن میں کھڑا کرنا شروع کر دیا۔ وہ روزانہ دوواڑے کی چو کھٹ پہ کھڑی ہو کر ایک ایک کر کے بچوں سے شیک ہینڈ کرتی اور باہر نکلتی جاتی یہی اس کا معمول تھا۔ اس وقت بھی تمام بچے باری باری اپنی میم سے شیک ہینڈ کرتے جا رہے تھے اور باہر نکل کر ایک سائیڈ پہ کھڑے

”سوہیوی آر“ چاک کا چھوٹا سا کھڑاؤ سٹین میں اچھال کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے وجہ نے مڑ کر اپنی کلاس کے بچوں پہ اک نظر ڈالی اور مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اس کی شخصیت کا خاصا حصہ تھی۔

”لو کے ناؤ ہری آپ“ ایک آپ یور یوگجو۔ کل اس جیٹو کے لاسٹ ٹھری کو لپیٹنے کا ٹیسٹ لوں گی۔ یہ میچو آپ کے ان ٹیسٹ کے مارکس آپ کے فائنل ایگزامز میں آئیں ہوں گے“ اور اب جلدی سے روز کی طرح لاسٹ فائیو منٹ سکشن ہو جائے اپنے یوگجو بیک کرتے اسٹوڈنٹس کے ہاتھ تھم چکے تھے انہیں اپنی مس وجہ کی کلاس کے آخری پانچ منٹ بہت اکیسا کھینچ کر تھے۔ ان پانچ منٹوں میں وہ لوگ کوئی باری بات، کوئی چھوٹی سی سبکی یا کوئی براہیم اگر کسی بچے کے ساتھ ہوتا تو اس کو ڈسکس کرتے اور پھر اگلے دن ضرور بتاتے کہ انہوں نے اپنی میم کے کتنے گون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

بچوں کو چھٹی چھٹی ٹیکوں کے لیے دی جانے والی ترفیب جہاں ان میں اچھلی کا ماکہ پیدا کرنے کا سبب تھیں وہیں وجہ کو اپنے اندر بھی تسکین اور اطمینان کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔

کلاس میں بچے بے چین ہونا شروع ہو گئے تھے، کیونکہ کلاس سے باہر دوسری کلاس کی کیوڈنٹی شروع ہو گئی تھیں۔ بچوں میں جھگڑت اور بے چینی کا تاثر پاتے ہی وجہ نے خود ہی بات کا آغاز کیا۔

”لو کے لو کے سائنلس پلیز“ ابھی آف ہونے میں تھیں منٹ بلی ہی سو پلیز سکون سے بیٹھے، بلی بات تو ہم کل کریں گے، آج کے لیے صرف اتنا کہ اپنے ارد گرد رہنے والوں کا خیال رکھیے، ان کی چھوٹے چھوٹے کانوں میں مدد کیجیے، گھر کے بیروں کا مکالمہ اپنے خاص طور پر اپنے گھر میں موجود سروٹس کا خیال رکھا کیجیے، کیونکہ وہ غریب لوگ آپ کے آرام کی خاطر مشقت کرتے ہیں۔ آپ کے آئیر کنڈیشنرز روڑ میں آرام کے دوران باہر لاون چکن اور لائن کی چٹی کرنی میں دھیروں کام چلتے ہیں۔ سو نیک کیئر آف ویٹم

قرب آ رہے تھے۔ وہ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ دن بڑے خوش گوار سے ہو گئے تھے۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب فضل داو بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے سر کا صفحہ نکل گیا تھا جواب اس کے ساتھ میں تھا اور وہ بار بار اس سے اپنے چہرے کا پینڈ پونچھ رہا تھا، اس کے انداز میں گھبراہٹ اور وحشت نمایاں تھی۔

”غضب ہو گیا ارشادی بی سیلابی ریا اب پنجاب اور بلوچستان سے نکل کر سندھ میں داخل ہو چکا ہے۔ بس تو جلدی سے تیاری پکڑ۔ یہ سرنے سارے موسیٰ اور ڈگر ٹرک میں سوار کر کر شہر روانہ کر دیے ہیں اب ہمیں بھی لکھنا ہو گا یہ سرائے نظام میں لگا ہے۔“

فضل داو کی اطلاع نے ارشادی بی کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ کیتھر کے دیکتے رنگ میں ہندی سی گھل گئی اور سیاہ آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ تباہی چند قدم کے فاصلے پر ہی نظر آ رہی تھی۔

”ہائے بے۔ میں سلمان تو اکٹھا کر لوں۔ ارے میرے برتن۔ اور۔“ ارشادی بی داو لے کرنے کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار کر سلمان اکٹھا کرنے لگی۔ کیتھر بھی سلمان سمیٹنے میں لگ گئی۔

”فکر کی بات نہیں۔ ابھی ہم سیلاب کی زد سے باہر ہیں ٹیما سرکہ رہا تھا کہ ہم اس سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ سو ابھی آتا ہی ہو گا تب تک تم ضروری سلمان پانچہ رکھو۔ فضل داو خود بھی گھبرا ہوا تھا مگر اسے تسلی دے رہا تھا۔

لیکن انہیں بہت مختصر مصلحت ملی تھی۔ تیز طوفانی بارش کی بو جھاڑ کے ساتھ ساتھ بے رحم سیلابی ریا گلوں میں داخل ہو گیا اور آٹا فٹا سب طرف پھینکا گیا۔ کیتھر سم کر ارشادی بی سے چٹ گئی۔ سارے گھر میں پانی پانی تھا اور مستقل بڑھتا اور اونچا ہوتا جا رہا تھا۔

یا سر یہ نہیں کہاں رہ گیا تھا۔ اب تو فضل داو کے چہرے سے بھی پریشانی جھلک رہی تھی وہ اوسنے

جس پر اسے اس کی موت باطل سامنے ہی نظر آ رہی تھی سیلابی ان کے گھٹنوں سے بھی اوپر ہو گیا تھا اور پندرہ رتبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ارشادی بی ڈر اور خوف کے علاوہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے بھی ٹھنڈی پانی جا رہی تھی۔ اب پانی ان کے دھڑکے آگیا تھا اور گھر کا سامان پانی کے ساتھ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے جینز کی پٹنی بھی لہروں پر ڈھل رہی تھی۔ کیتھر کا دل جیسے مٹی میں آ رہا۔

اسی وقت یا سر اپنے خاندان کے ساتھ کشتی پر سوار چلا آیا۔

”جلدی آؤ۔ جلدی کرو۔ فوراً آؤ۔“ وہ سر تا سر پانی میں شرابور دواندہ وار چیخا۔

”ارے میری بیٹی۔ ارے میرا لگن۔ ارے وہ کیتھر۔“ ارشادی بی دہلیز دہلیز روٹی۔ فضل داو نے اسے زبردستی کشتی کی طرف دھکیلا۔

کیتھر بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ مستقل پانی میں رہنے کی وجہ سے اسے سوزی لگ رہی تھی اور چہرہ شل ہو رہے تھے اس کے تمام دھڑکے برف اترتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پچھلے کپڑوں کو سینے سے لپیٹ کر چلی گئی اور کشتی کا بیٹھی اور کشتی کا بیٹھی منہ کی جانب دو لہ ہو گئی۔

چلتے وقت آخری بار اس نے اپنی جینز کی پٹنی کو لہروں کے رحم و کرم پر مخالف سمت میں بہتے ہوئے ڈھیلی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس سے دور۔

بہت دور ہوئی جا رہی تھی اور اپنے سنگ اس کی بچی عمر کے خواب، محسوس سی خوابوں اور امانوں کو بھی بسائے لیے جا رہی تھی۔ لیکن اب اس کے لیے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے برابر میں اس کے سر کا سامان یا سر سب سلامت بیٹھا ہوا تھا جس کے سنگ وہ رخصت ہو رہی تھی۔

آسمان سے بھی پانی آ رہا تھا اور زمین پر بھی تاحد نظر پانی ہی پانی تھا۔ کیتھر کی آنکھوں میں بھی ٹھنڈی پانی بھر گیا۔ طریہ آسور تشکر کے تھے اپنے دل کی ساری حسرتوں اور ملال کو بھلا کر اس نے خود کو یہ سمجھا لیا تھا کہ اس کی رخصتی ایسے ہی ہونا تھی۔

”جلدی آؤ۔ جلدی کرو۔ فوراً آؤ۔“ وہ سر تا سر پانی میں شرابور دواندہ وار چیخا۔

”ارے میری بیٹی۔ ارے میرا لگن۔ ارے وہ کیتھر۔“ ارشادی بی دہلیز دہلیز روٹی۔ فضل داو نے اسے زبردستی کشتی کی طرف دھکیلا۔

کیتھر بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ مستقل پانی میں رہنے کی وجہ سے اسے سوزی لگ رہی تھی اور چہرہ شل ہو رہے تھے اس کے تمام دھڑکے برف اترتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پچھلے کپڑوں کو سینے سے لپیٹ کر چلی گئی اور کشتی کا بیٹھی اور کشتی کا بیٹھی منہ کی جانب دو لہ ہو گئی۔

چلتے وقت آخری بار اس نے اپنی جینز کی پٹنی کو لہروں کے رحم و کرم پر مخالف سمت میں بہتے ہوئے ڈھیلی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس سے دور۔

بہت دور ہوئی جا رہی تھی اور اپنے سنگ اس کی بچی عمر کے خواب، محسوس سی خوابوں اور امانوں کو بھی بسائے لیے جا رہی تھی۔ لیکن اب اس کے لیے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے برابر میں اس کے سر کا سامان یا سر سب سلامت بیٹھا ہوا تھا جس کے سنگ وہ رخصت ہو رہی تھی۔

آسمان سے بھی پانی آ رہا تھا اور زمین پر بھی تاحد نظر پانی ہی پانی تھا۔ کیتھر کی آنکھوں میں بھی ٹھنڈی پانی بھر گیا۔ طریہ آسور تشکر کے تھے اپنے دل کی ساری حسرتوں اور ملال کو بھلا کر اس نے خود کو یہ سمجھا لیا تھا کہ اس کی رخصتی ایسے ہی ہونا تھی۔

اسی وقت یا سر اپنے خاندان کے ساتھ کشتی پر سوار چلا آیا۔

”جلدی آؤ۔ جلدی کرو۔ فوراً آؤ۔“ وہ سر تا سر پانی میں شرابور دواندہ وار چیخا۔

”ارے میری بیٹی۔ ارے میرا لگن۔ ارے وہ کیتھر۔“ ارشادی بی دہلیز دہلیز روٹی۔ فضل داو نے اسے زبردستی کشتی کی طرف دھکیلا۔

کیتھر بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ مستقل پانی میں رہنے کی وجہ سے اسے سوزی لگ رہی تھی اور چہرہ شل ہو رہے تھے اس کے تمام دھڑکے برف اترتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پچھلے کپڑوں کو سینے سے لپیٹ کر چلی گئی اور کشتی کا بیٹھی اور کشتی کا بیٹھی منہ کی جانب دو لہ ہو گئی۔

چلتے وقت آخری بار اس نے اپنی جینز کی پٹنی کو لہروں کے رحم و کرم پر مخالف سمت میں بہتے ہوئے ڈھیلی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس سے دور۔

بہت دور ہوئی جا رہی تھی اور اپنے سنگ اس کی بچی عمر کے خواب، محسوس سی خوابوں اور امانوں کو بھی بسائے لیے جا رہی تھی۔ لیکن اب اس کے لیے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے برابر میں اس کے سر کا سامان یا سر سب سلامت بیٹھا ہوا تھا جس کے سنگ وہ رخصت ہو رہی تھی۔

آسمان سے بھی پانی آ رہا تھا اور زمین پر بھی تاحد نظر پانی ہی پانی تھا۔ کیتھر کی آنکھوں میں بھی ٹھنڈی پانی بھر گیا۔ طریہ آسور تشکر کے تھے اپنے دل کی ساری حسرتوں اور ملال کو بھلا کر اس نے خود کو یہ سمجھا لیا تھا کہ اس کی رخصتی ایسے ہی ہونا تھی۔

اسی وقت یا سر اپنے خاندان کے ساتھ کشتی پر سوار چلا آیا۔

”جلدی آؤ۔ جلدی کرو۔ فوراً آؤ۔“ وہ سر تا سر پانی میں شرابور دواندہ وار چیخا۔

”ارے میری بیٹی۔ ارے میرا لگن۔ ارے وہ کیتھر۔“ ارشادی بی دہلیز دہلیز روٹی۔ فضل داو نے اسے زبردستی کشتی کی طرف دھکیلا۔

کیتھر بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ مستقل پانی میں رہنے کی وجہ سے اسے سوزی لگ رہی تھی اور چہرہ شل ہو رہے تھے اس کے تمام دھڑکے برف اترتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پچھلے کپڑوں کو سینے سے لپیٹ کر چلی گئی اور کشتی کا بیٹھی اور کشتی کا بیٹھی منہ کی جانب دو لہ ہو گئی۔

چلتے وقت آخری بار اس نے اپنی جینز کی پٹنی کو لہروں کے رحم و کرم پر مخالف سمت میں بہتے ہوئے ڈھیلی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس سے دور۔

ہاتھ جارہے تھے۔

آج بھی عبدالباری سب سے آخر میں تھا اور یہ عبدالباری کا معمول تھا۔ عبدالباری فوج کی ان فٹ تھا۔ بچپن میں کسی حادثے میں ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ نما ہو چکا تھا۔ چہرے کی جلد جھلس کر چھج جانے کی وجہ سے گردن کے ساتھ بڑ چکی تھی۔ بالیاں بازو اور ہاتھ بھی نامول حالت میں نہیں تھے۔ وجہ یہ وہی طرح کوشت کا شکار ہو گئی۔

وہ لاکھ کوشش کرتی کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھے جو عبدالباری کا چہرہ دیکھتے ہی ایک گھبراہٹ اور کراہت کی صورت اس کے اندر اٹھ اٹھتے تھے۔ اس کی روزانہ کوشش ہوتی کہ عبدالباری کے اٹھے ہوئے خستہ حال ہاتھ کو نظر انداز کر سکے۔ مگر وہ بھی ایک ڈھنچ تھا۔ جب تک وجہ اس سے شیک ہونڈ نہ کرتی وہ اپنی جگہ ڈٹ کر کھڑا رہتا۔ سو مجبوراً اس وقت بھی وجہ کو وہ انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس کرتی رہیں کہ پورا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کی وہ بھی جی چاہتی تھی۔

یہ اوجھڑا سا شیک ہونڈ بھی عبدالباری کو اپنی ہی نظروں میں معجز کر دیتا تھا۔ اسے لگا کہ مس وجہ اسے بھی دوسرے بچوں کی طرح اہمیت دیتی ہیں۔ حالانکہ وہ بچہ ہونے کے باوجود پورے ہاتھ اور دو انگلیوں کے فرق کو بخوبی سمجھتا تھا۔ مگر کیا کیجیے کہ کچھ لوگ ہر حال میں بہت اچھے لگتے ہیں۔

ان کا اچھا بہت اچھا اور ان کا برا بھی بہترین لگتا ہے اور اس جذبے کو محسوس کرنے کے لیے چھوٹے بڑے کی تشخیص نہیں ہوتی۔

جو نئی معصوم عبدالباری کلاس سے باہر نکلا، لاشعوری طور پر وجہ نے اپنا ہاتھ اپنے دوپٹے کے پلو سے رکھا تھا۔

کبھی جو اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا کہ وہ ایک استاد ہے اور بچوں کو اچھا برائی کا فرق سمجھانا اس پر فرض ہے، لہذا اسے تمام بچوں سے مساوی سلوک کرنا چاہیے، مگر پھر تھوڑی سی دیر بعد وہ اس احساس

سے نکل آتی تھی کہ آخر وہی تو تھی جس نے عبدالباری کو کلاس میں ایک مقام دے رکھا تھا۔ مگر نہ بچے تو عبدالباری سے خوفزدہ ہو کر دور درجے تھے۔ یہاں تک کہ بچے زبردستی عبدالباری کے لیے نرم گوشہ نہیں رکھتی تھیں۔

ان کا خیال تھا کہ اس جیسے ہینڈ کی جیڈ اسٹوڈنٹس کو کسی ایجنٹل اسکول میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ بچے اس کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں اور اس طرح ان کی پڑھائی میں خلل پڑتا ہے۔

جبکہ وجہ نے پورے اسٹاف کے سامنے اس بات کی رُخسار کر لی تھی کہ عبدالباری بھی ایک متمول قبیلے کا بچہ ہے، اس کا حق ہے اس اسکول میں تعلیم حاصل کرے۔ ویسے بھی وہ مینٹلی ان فٹ نہیں ہے کہ اسٹیشنل اسکول میں داخل کر دیا جائے۔

وجہ یہ کہ یہی وسیع انگری اسے پرہیز اور بہت سی بچپن کی دل پسند شاعری تھی اور اسٹوڈنٹس میں وہ وہ مقبول تھی۔



”اف عمر کے بچے اندھروں میں گم ہو جائے“ وہ بڑی دیر سے اسکول گیٹ کے اندر بیٹھی تھی۔ اسے نصیب پہنچی مگر نہ نظریں جملے اپنے بھائی کی منتظر تھی۔ کچھ منٹ مزید انتظار کے بعد وہ اٹھی اور گیٹ سے باہر آگئی۔ سوچا گوئی رکش پکڑے اور گھر کی راہ لے۔ آخر تک ایک انتظار کرتی۔

یقیناً ”موریا“ کا آج کوئی بریکنگ تھا۔ جب یہی وہ لپٹ ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا اور گیٹ سے باہر نکلتے کا انتظار کرنے لگی۔ یکدم اس کی نظر عبدالباری پر پڑی جو اسکول کی باؤڈری وال کے باہر بیٹھی ایک چھوٹی سی تھری۔ مینٹل ڈرائیور کا انتظار کر رہا تھا۔

وجہ سے تقریباً ”دس فٹ کی دوری“ پہ بیٹھا عبدالباری اسے ہی دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ موریا وہ بھی مسکرائی مگر ساتھ ہی رخ پھیر لیا۔ ”موریا“ وہ اس کے پاس ہی نہ آکر کھڑا ہو جائے کہ اسے میں کوئی

اس کے دائیں جانب آکر کھڑا ہوا۔ وجہ نے پلٹ کر دیکھا تو خوف کے مارے جی ٹھٹھکتے رہ گئی۔

ایک عورت جس کے چہرے پر یائیں جانب ایک بڑا سا پھوڑا تھا اور اس سے ہرے رنگ کا موار مٹا ہوا اس کی ٹھوڑی تک آ رہا تھا۔ جسے وہ ہاتھ میں پکڑے ایک گندے کپڑے سے بار بار صاف کر رہی تھی۔ اوپر سے کالی سیاہ رنگت اور بھدے نقوش، آنکھوں سے اندھنی دکھتی تھی۔ کیونکہ سفید پتیلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ بے اختیار وجہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہو گئی۔

”جیسے سڑک پار کروادو۔ آٹھ سے دیکھنا نہیں پڑی دیر سے کھڑی ہوں مگر کوئی بھی سڑک کراس نہیں کروا رہا۔ مجھے وہ سامنے والے دو اخلے جانا ہے۔ میرے چہرے کا زخم مسلسل گرو غبار میں کھڑے رہنے کی وجہ سے رستے لگ گیا ہے۔ مہولی کرو اور مجھے سڑک پار کروادو۔“ وہ عورت پری جلاحت سے بولی۔

لہو صاف تھا۔ غور کیا تو باقی جلد بھی قاتل قبیل تھا۔ مگر چہرے نے کہیں اور دیکھنے کی مہلت ہی کہاں دی تھی۔

وجہ شدید شش و پنج میں پڑ گئی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے سڑک پار کروادے کہ اس عورت کے زخم پر اسٹیم دو تین گھنٹیں آکر بندھ گئیں۔ وجہ کو گھبراہٹ اور کراہت سے یک دم لٹکائی آنے لگی اور وہ جلدی سے اس سے فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس عورت نے اپنا زخم ایک بار پھر صاف کیا اور سامنے ہاتھ مار کے وجہ کو ٹوٹنے کی کوشش کی۔ مگر اسے نہ پار پاس ہی سے پس کھڑی ہو گئی۔ اچانک عبدالباری اپنی جگہ سے اٹھا اور اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر سڑک کراس کرانے لگا۔

ایک آدھ گاڑی کو اس ننھے بچے نے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور گزرنے کی جگہ بنانا دو اخلے کے باہر تک اسے چھوڑ کر واپس آ گیا۔

اس عورت کے دماغ یہ گھمات کتنے لب وجہ کو دور سے بھی دکھ رہے تھے۔ وہ شش و پنج میں اسی سمت دیکھ

رہی تھی کہ عبدالباری کے مخاطب کرنے پہ چونک گئی۔

”مس! آپ میرا نائل لے رہی تھیں نا؟“ عبدالباری کی آواز میں جوش تھا۔ ”آپ یہ ہی دیکھ رہی تھیں تاکہ آج جو اینڈنگ لیسن آپ نے کلاس میں دیا تھا اس کا کچھ پر کیا اثر ہوا۔ آپ نے کہا تھا کہ کوئی ایک اچھا کام کرو، خاص طور پر غریب کے لیے۔ سو آئی ہوؤں ہم اور ایسا میں صرف آپ کی وجہ سے کر پایا ہوں۔“

تب ہی عبدالباری کو اس کے ڈرائیور نے آواز دی تھی جو ابھی ابھی پانچا تھا۔ جبکہ وجہ سن ہی کھڑی تھی۔ جاتے جاتے عبدالباری ایک دفعہ پھر مڑا اور اس کے پاس آیا۔

”مس! آپ مجھ سے پورا شیک ہونڈ کریں گی نا؟“ اس کے بے بس نہ جانے بیسی اس تھی۔ وہ آٹھ سال کا بچہ آج نہ جانے کیسے سبق پڑھا رہا تھا اسے۔ ”مور! مس! میں کل سے کھڑی ہیں گے آؤں گا میری داد دے رہی ہیں ہمیں کسی کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ اللہ حافظ!“ اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ پڑھایا تھا اور آج پہلی بار وجہ نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر پوری گرم جوشی سے دبا کر چھوڑ دیا تھا۔

عبدالباری جاچکا تھا اور اس بچے کے چہرے پہ پھوٹنے والی روشنی وجہ کے اندر کی ساری کو باہر آنے لگی تھی۔ جانے کیسا اسم عبدالباری نے پھوٹا تھا جس نے پل بھر میں اس کی ساری شخصیت کو ہوا میں تحلیل کر کے حوال بنا دیا تھا۔

وہ یہ سمجھ بھی نہ سکتی تھی کہ قدرت خود اس کا نائل بھی لے سکتی ہے جس میں وہ یکسر ناکام رہی تھی اور عبدالباری کا میاں بے۔

اک دیا ضروری ہے،

خامشی کے جنگل میں

اک صدا ضروری ہے

راکھ ہوتے لمحوں میں

اک دُعا ضروری ہے

آگہی کے اندر بھی

اک غلا ضروری ہے

بے چسراغ بستی میں

اک دیا ضروری ہے

جانے کون پتکے سے

کان میں یہ کہتا ہے

کس ادھیڑ میں میں ہو

قریہ خرابی میں

کون جان پایا ہے

کیا یہاں اضافی ہے

کیا یہاں ضروری ہے

ارشد نعیم

غنا

خلوص سجدہ، سجود غنا

محبتوں کا وجود غنا

وہ سچے جنہے ہنسنے والے

خوشی کے بھی چپکنے والے

جواب تو نایاب ہو گئے ہیں

اندھیری لائوں میں

کھو گئے ہیں

وہ آندھریں دستک میں پٹی

وہ صورتیں پاندنی میں سمی

انا پرستی کی زد میں اگر

مناجات کی سناں کے نیچے

ہر ایک لڑ

سک رہی ہیں

تمام سوچیں

دیکھ رہی ہیں

سوکا شش کوئی

پیام لائے

مختبر کے سلام لائے

کہیں سے یادہ و جام لائے

کوئی سہانی سی شام لائے

تو پھر سفاکتہ وجود لائے

بنام پاکیزت دوام لائے

مگر یہ ممکن نہیں ہے شاید

کہ دودھ حاضر کی فضا نفسی میں

معجزہ دین کا ظہور غنا

بتوں کی صورت میں: نود غنا

اعجاز بخاری

بھیجتی ہیں جو پیام روشنی تاروں کے نام

رات میں لے اک غزل لکھی ہے لکھو کے نام

گل کے انباروں میں چپ جلنے گی یہ تازہ خبر

کشتیاں، ساحل کا منظر، ڈوبنے والوں کے نام

جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہیں اس کی چرتیں

میرا بچہ پوچھتا ہے رات کو تاروں کے نام

جانے اس گھر کے مکین کس دیکھ بیچے کیا ہوئے

وہ گئے دیوار پر لکھے ہوئے بچوں کے نام

رنگ و بول کے کتے مردہ تجربے زندہ ہوئے

یاد آئے دیکھ کر تجھ کو کئی پھولوں کے نام

اس نے دریا میں بہائے جل گئے سوتے دیے

کچھ تری صبحوں کے نام اور کچھ تری شاموں کے نام

سلیم احمد

ہم سلاوہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی

جس بار خزاں آئی، سب سے کہ بہار آئی

آشوبِ نظر سے کی ہم نے چمن آرائی

جو شے بھی نظر آئی، گل رنگ نظر آئی

امیدِ تطف میں رنجیدہ رہے دونوں

تو اور تری محفل، میں اور میری تنہائی

یک جان نہ ہو سکے، انجانِ ذہن یکے

یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیرِ شناسائی

اس تن کی طرف دیکھو تو قل گہل ہے

کیا رکھا ہے قتل میں اے چشمِ تماشا سائی!

فیض احمد فیض



حیرانی

مالکین گن میں پہنچی تو اس نے خاندان کو بٹے
مڑے سے برو سنتا ڈالتے اور کوئلہ ڈونک پیٹتے دکھا۔
مالکین حیرت سے بولی۔
”تم جیپ جیپ کر رہے سب جیسے نہیں کھاتے ہو؟
مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔“
”آپ نے بھی مجھے حیران کر دیا ہے صاحب! ان لالہ
سنبھل کر بولا۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ باہر گئی ہوئی ہیں۔“
نمرہ، اقرار کراچی

سبے روزگار

ایک صاحب کے گھر میں نئی ملازمراتی تو اس
نے دیکھا کہ صاحب اور کمری منزل پر ایک الگ تنگ
کمرے میں میز پر سر جھکائے بیٹھے کچھ لکھتے رہتے ہیں
یا نہایت برائی بوسیدہ اور ضحہ حال کتا لول کو جھاڑ
بولچہ کرائٹ پلیٹ کر دیکھتے رہتے ہیں۔ کئی روز تک
ملازم اور سے مجھے آتے جاتے ان کے معاملات کا جائزہ
لیتی رہی۔ پھر ایک روز وہ بیگ صاحب کے پاس جا کر
بولی۔
”بیگ صاحب! آپ نے مجھے تیرہ سو روپے مہینے پر
ملازم رکھا تھا نا؟“
”ہاں بھئی۔ اس سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔“
بیگ صاحب نے جلدی سے کہا۔ اٹلیں اندیشہ بولا کہ
ملازم ابھی سے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کرے گی۔
”میں زیادہ کی بات کب کر رہی ہوں بیگ صاحب؟“
ملازم ترن امین نے بولی۔ ”میں تو یہ کہہ رہی تھی
کہ جب تک صاحب کو نوکری نہیں مل جاتی، تب تک

آپ مجھے تیرہ سو روپے بجائے ہزار دو سو روپے مہینہ دے
دیا کریں۔“

صائمہ جی سکرچی

آسان علاج

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔
”میں جیپ بھی کافی پیتا ہوں تو آنگھ میں بہت تیز
اور شدید تکلیف پہنچانے والا اور محسوس ہوتا ہے۔
اس کا کیا علاج ہے؟“
”بہت آسان علاج ہے۔ بس یہ بات یاد رکھو
کہ کافی پینے سے پہلے جیپ سے نکال دینا ہے۔“
ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
مہوش یوسف۔ شیخوپورہ

قلبی بیرو

ایک صاحب اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔
”پاکستانی فلم میں بیرو دھنی ہوا تو اسے اسلحے کی
گازی میں ڈال کر لے جایا گیا۔“
”نہیں غلط تھی ہوئی ہوگی؟“ دوست نے تعجب کو
کی کوشش کی۔ ”وہ اسلحے کی گازی نہیں، ایجوکیشن
ہوگی۔“
”نہیں بھئی، وہ اسلحے کی گازی ہی تھی۔ ان طلب
نے یقین سے کہا۔ ”دراصل بیرو کے جسم میں اتنی گولیاں
ہو گئیں کہ اسے اسلحے کی گازی میں لے جانا ہی
مناسب تھا۔“
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

ملاو شاہ

مشکیل کے شہ پر نیسل اور دوہم دیکھ کر محسن نے
پوچھا۔
”تھوڑے جیسے کو کیا ہوا؟“
”نرسل کے ملک ملاو شاہ کے سسلے میں میرا ایک
آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ مشکل سے بتایا۔
”تو تم نے کسی پولیس والے کو کیوں نہیں بلایا؟“
محسن نے دریا فست کیا۔
”وہ پولیس والا اتنی تھا۔“ مشکلیں نے ٹھنڈی
سائرس لے کر جواب دیا۔
نندا، نضر۔ فیصل آباد

برتری کا شوق

ایک شخص ہاتھ میں کتاب لیے بازار میں خود
دور سے ہنس رہا تھا۔
”کیوں نہیں رہے ہو بھائی؟“ راہ گیر نے پوچھا۔
”کیا لکھنے کی کتاب پڑھ رہے ہو؟“
”میں امریکیوں کی بے وقوفی پر ہنس رہا ہوں۔“
وہ شخص بولا۔
”امریکیوں کی بے وقوفی؟“ کئی آدمی ایک دم چیخے
”مگر کوئی کی بے وقوفی پر؟“ لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔
وہ شخص بولا۔ ”یہ امریکی اتنے بے وقوف ہوتے
ہیں کہ اگر کوئی مذاقاً یہ بات کہہ دے کہ وہ اپنا آدمی
جہنم میں بھیجنے والے ہیں تو امریکی اسی وقت ایک کشتی
آتشیں دین گئے، جس کا کام یہ ہوتا ہوگا کہ وہ جلد از جلد
ان سے جہنم واپس لے سکتے ہیں۔“
خدیجہ سلیم۔ کراچی

تلاش

مری میں شدید برف باری کے بعد ایک شخص
اپنی چھتری کو مگڑ مگڑ لٹکا ہوا جا رہا تھا۔ اس حالت میں
دیکھ کر ایک نوجوان اس کی طرف بڑھا اور اپنی خدمات
پیش کر کے ہوئے بولا۔
”جناب! اگر آپ کو راستہ تلاش کرنے میں وقت

کا سامنا ہے تو میں آپ کو قریبی مرکز تک پہنچا
سکتا ہوں۔“
”نہیں! اس شخص نے خواب دیا۔ مجھے مرکز
تک نہیں جانا۔ میں تو اپنی کار تلاش کر رہا ہوں جسے
دو گھنٹے پہلے میں یہاں کھڑی کر گیا تھا۔“
کرن، نیش۔ فیصل آباد

خضر

امتحان میں بیٹے کا مسیالہ برباب پھولا نہیں
سہارا تھا۔ کھانے کی میسر پر اس نے بیوی کی طرف دیکھا
اور خضر انداز میں بولا۔
”جانتی ہو، بھنگا میرے بیٹے کو میرا دماغ مٹا ہے؟“
”خزود ملا ہوگا یا بھنگے تو مجھے مڑے جواب دیا۔
”میں بہت دوروں سے تمہاری نائب دماغی سے پریشان
تھی۔“
صدیقہ، مریم۔ کراچی

گری

جیک نام کا ایک پادری کو لندن سے ایک
افریقی ملک میں بھیجا گیا۔ وہاں پہنچنے ہی اس نے
لندن میں اپنی بیوی کو تار بچھا۔ اتفاقاً سے اسی علاقے
میں ایک اور مسٹر جیک رہتی تھیں جن کے شوہر کا
اسی روز انتقال ہوا تھا۔ ڈاکٹر غلطی سے پادری جیک
کا تار اسی دوسری مسٹر جیک کو دے آیا۔
تار کا مضمون پڑھتے ہی مسٹر جیک حیران و پریشان
رہ گئے کیونکہ اس میں لکھا تھا۔
”میں کوئی خیریت سے پہنچ گیا۔ میں گری جلد لے دے
رہی ہے۔“

زمین یوسف۔ ڈالیاہ کراچی

جو کبھی ملے

پریس کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔
”تمہیں کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔ بس نقصان
دو کو میٹر پریسل مٹا کر دے۔“

شکفتہ جاہ



اگر ہر زبان، با فرمان اور بدلیل ہو تو خورست ہے۔ اسی طرح گھوڑا اگر تندہ ست، تیز رفتار اور مالک کا حکم ماننے والا ہو تو یہ بابرکت ہے۔ اگر اڑیں اور مندی ہو تو حبیبیت ہے۔ گھر کشادہ ہو، ہمسائے اچھے ہوں تو بابرکت ہے، قدرہ تکلیف کا باعث ہے۔ اس انداز سے راحت یا مشکل کسی بھی چیز میں ہو سکتی ہے لیکن ان میں چیزوں سے چونکہ زیادہ کام پر رہتے ہیں لہذا ان کی خوبی اور غامی انسان کی راحت اور پریشانی کا سبب بنتی ہے۔

قریش کے لوگوں کا تحفظ کر قرآن سننا

مردمان قریش مخالفت نہ کرتے تھے لیکن قرآن سنانے سے عجب لڑائی کی تھی۔ اسی سے اسے متاثر تھے۔ کچھ کچھ خود بھی چھپ کر قرآن سننے تھے۔ نوسخہ ابن عباس نے نقل کیا ہے کہ "سرداران قریش ابو سفیان بن حرب، ابوہل بن ہشام، انس بن شریح اور ابن ابی النضر یہ چاروں ایک رات ایک ایک نیکے آکر چھپ کر قرآن کی تلاوت نہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غار کے دوران اپنے گھر میں کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے لیے ایک جگہ مقرر کر لی اور پھر گراہ علی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سننے لگا۔ ہر شخص دوسرے کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اسی طرح انہوں نے ساری رات گزاری اور پھر اپنی اپنی دہلی۔ راستے میں سب جمع ہوئے۔ سب ایک دوسرے کو طاعت کرنے لگے۔ ہر ایک نے دوسرے سے کہا

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حضرت مخیر بن عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے۔ "خوش کچھ نہیں۔ اور برکت بعض اوقات تین چیزوں میں ہوتی ہے۔ عورت، میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم (ابن ماجہ)

۱۔ خوشی کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے بارے میں یہ تصور کر لیا جائے کہ اس سے فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ نقصان ہی نقصان کا خطہ ہے۔ یہ ایک غلط تصور ہے۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں۔ جب سے اس عورت سے شادی کی ہے کاروبار میں نقصان ہی ہو رہا ہے۔ یا جب سے اس گھر میں رہائش اختیار کی ہے کوئی نہ کوئی بیمار ہی رہتا ہے۔ بعض دفعہ ایسی چیز یا شخص کو نقصان یا تکلیف کا سبب سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ تو ہمارے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص یا چیز میں انسان کے لیے فائدہ رکھ دے تو یہ برکت اور اللہ کی رحمت ہے۔ ۳۔ خوشی یا برکت سے مراد کسی چیز یا شخص سے حاصل ہونے والی نفع یا راحت بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً عورت اگر نیک میرٹ، اطاعت گزار اور تیز رفتاری ہو تو یہ رحمت اور برکت ہے۔

میں ہنر کا آدمی۔ اسے بھلنے کے لیے مجھے اس پر مانتا دانتا پڑتا۔ ابھی بیوی کی داستان طم جاری تھی کہ عابد ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ٹھیک سے ٹھیک ہے۔ میں استاد اور مفتی کا کہہ رہی گزارہ کر لوں گا" نادیدہ۔ بکرات

سچا پیارا صاحب میرے شام تک سخت محنت اور کام کے بعد جب بٹا گھر گیا تو باپ سے پوچھا۔ "کیا کیا؟" بیوی نے پوچھا۔ "کیا کیا؟" اولاد نے پوچھا۔ "کیا کیا؟" صرف ماں نے پوچھا۔ "دن میں۔ کچھ کیا؟" سعدیہ، مریم، شریف آباد

بذریعہ ایک صاحب جیسے ہی میزورم میں داخل ہوئے محافلے انہیں روک لیا اور کہا۔ "ماہیچن یا لائبریری گارڈ روم میں چھوڑ جائیے۔" لیکن میرے پاس ماہیچن یا لائبریری نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ ان صاحب نے جواب دیا۔ "تب پھر آپ اندر نہیں جا سکتے" محافلے بولا۔ "ہمیں بھی سے ہدایت کی تھی ہے کہ سگریٹ یا لائبریری گارڈ روم میں چھوڑے بغیر کوئی شخص اندر داخل نہیں ہو سکتا۔"

غیمہ، غل، کرچی وجہ ۶ کھلاڑی انٹر ویو دیتے ہوئے "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ریشا رمنٹ کا اعلان کر دوں" صحافی، "اس اچانک فیصلے کی وجہ؟" کھلاڑی، "دوا میں میرے بچانے سلیش بورڈ سے استعفیٰ دے دی ہے" مسرت طارق۔ آزاد شیر

میرین کراہ کر بولا۔ اولکنا چلوں ڈاکٹرا صاحب! میں چوکیدار ہوں۔ ساری طرے غلاتے میں گشت کرتا ہوں۔" تحویم، عائشہ۔ گوہرہ

نمبر ترتیب۔ سوئنگ کلب کے ذریعہ تمام نوجوان کو غلط فہمی کی تربیت دی جا رہی تھی اس دوران انٹر کلب کے دیگر کلب کے کسی کام سے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ تمام نوجوان غلط فہمی کی مشق کرنے کے بجائے بیٹھے ہوئے جموں کے ساتھ کلب کی طرے میں بیٹھے بی بی دیکھ رہے ہیں۔ "م لوگوں نے غلط فہمی کی مشق کیوں بند کر دی؟" انٹر کلب نے تدریس غلط سے پوچھا۔ "بابر بادش ہو رہی ہے نا۔ اس لیے ایک نوجوان نے مصروفیت سے جواب دیا۔ یاسین شفیق۔ ربی

پہلی بار ۶ غامد کی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس روز اس کی بیوی نے اسے دستہ فون کر کے بتایا تھا کہ وہ پہلی بار کھانا بنا رہے گی۔ لیکن جب عابد گھر پہنچا تو اس کی بیوی کچھ مایوسی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے ہاتھ اور چہرہ مریح مسالوں اور پکائی میں تھڑے ہوئے تھے۔ مردہ سے لگے ہیں اس نے بتایا کہ کھانے میں سلاہ اور پختی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ تم دو تین ڈشیں تیار کرو گی اور گھر میں تمام سوا سلف موجود تھا؟" عابد نے جیسے پوچھا۔

"ہں۔ ڈشیں تو میں نے تقریباً تیار کر ہی لی تھیں۔ بیوی نے بتایا۔ "لیکن جب میں گوشت بھجوں۔ بی بی تو بونہل میں آگ لگ گئی۔ آگ بجھانے کے لیے میں نے انہیں ٹیکن کے قور سے میں ڈبو دیا۔ لیکن قورم سویرٹ ڈش میں گر گیا اور سویرٹ ڈش کا باؤل فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اس دوران جب لے کی آگ بھی بری

”دیکھ دو بارہ ایسا کرنا۔ اگر کم عقل لوگوں نے دیکھ لیا تو وہ کیا خیال کوں گئے؟“

دوسری رات کوئی تو غیر سب تلاوت قرآن کرنے لگے اور دوا لپی پر ایک دوسرے کو ملاست کرتے گھروں کو روٹ گئے۔

لیکن جب تیسری رات ہوئی تو پھر وہ اسی پر اپنے دوا لپی پر اسی طرح باجم مل گئے۔ تب انہوں نے کہا۔ ”جاری۔ عادت نہیں چھوڑنے کی۔ جب تک ہم یہ عہد کر لیں کہ ہم دوبارہ ایسا نہیں کریں گے۔“ اور پھر باجمی عہد کر کے منتشر ہو گئے۔

شاہدہ جمیرہ لانا۔ رحمان گڑھ

آسان حل

ایک شخص ایک ہم صاحب کے پاس گیا۔ اس کے پاس ایک دیکھ تھا۔ اس نے ذہن کو لے کر ایک زیور نکالا اور کہا۔

”یہ خالص سونے کا زیور ہے۔ اس کی قیمت دیکھنا۔“ سے کم نہیں ہے۔ اسی وقت بھوری سے آپ اس کو دکھ کر اپنی ہزار بجھے دے دیجئے۔ میں ایک ماہ میں روپے دے کر اسے واپس لے جاؤں گا۔“

حکیم صاحب نے کہا۔ ”میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔“ مگر آدمی نے اپنی بھوری کچھ اس انداز میں دکھائی کہ حکیم صاحب کو ترس آگیا۔ ادا ہونے سے پہلے دے کر زیور لے لیا۔

اس کے بعد زیور کو لوہے کی الماری میں رکھ دیا۔ بیسویں گزر گئے لیکن آدمی واپس نہیں آیا۔ آپ نے ایک آدمی کو زیور دینے کے لیے بلایا لیکن نہ اس نے بتایا کہ زیور کون ہے۔ حکیم صاحب کو غم و غم ہوا۔ تاہم وہ یہ کہنے کے بعد وہ اپنے آپ کو کھانا نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اس کو پھل دیا۔ صرف یہ کیا کہ زیور کو سونے کے خالص سے نکال کر دینے کے نالے میں رکھ دیا۔

انسانوں کے معاملات کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے انسانوں کے درمیان اکثر نفی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ایک آدمی سے جو ہم نے امید قائم کر رکھی تھی، اس پر وہ پورا نہیں اترتا۔ اس لیے جو قلع پر بہترین طریقہ ہے کہ آدمی کو اس نالے سے نکال کر دھڑکاتے ہیں۔

لکھ دیا جائے۔

(مولانا حبیب الدین خان کی واریات سے اقتباس) رضوانہ شکیل راولہ۔ کوہرا

کامیابی

کامیابی کے محل میں داخل ہونے کے لیے کوئی بڑا راستہ نہیں ہے۔ جو شخص اس محل میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنے لیے دروازہ خود بنا تاکہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ دروازہ خود بند ہو جاتا ہے۔ کسی اور کو اس میں سے گزرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی امداد بھی اس دروازے سے داخل نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک کو اپنی کامیابی کے لیے اپنے دروازہ خود بنانا پڑتا ہے۔

شائستہ اکبر۔ ڈگری کالج گدو

خود اعتمادی

احسان برتاری میں مبتلا شخص دوسرے لوگوں کے

لیے غائب جاں اور اذیت کا باعث ہوتا ہے تو احسان برتاری میں مبتلا شخص اپنے لیے غائب جاں اور نفی اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔ خود اعتمادی وراصل احسان برتاری اور احسان برتاری کے درمیان کا ایک راستہ ہے۔

عظیم انسان وہ ہے جس کے عزائم جلیل ہوں مگر خواہشات قلیل ہوں۔ (مکرم محمد سعید) شبلا فیصل۔ نوشہرہ گیار

امتحان

زندگی کا امتحان دہکڑے امتحان ہیں جن میں ثابت قدم ہونا نہیں چھلانگ لگانے کے برابر ہے اور ثابت قدم وہی رہنے میں ہیں بہترین چھلانگ لگانے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا وہ ایک اور گڑے امتحان کے لیے تیار ہیں۔

انسیلا بخاری۔ لاہور

موتی چنے ہیں

صابر کامیابی ضابطہ نہیں کرتا یا ہے کتنا ہی غم نہ گزرا جائے۔

مجھے غیب ہوتا ہے جب کوئی شخص استغفار کے ہوتے ہوتے مایوس نظر آتا ہے۔ غم۔ اقرار۔ کراہی

حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایک مجذوبہ اللہ تعالیٰ کا عاشق حلاق بکریاں چراتا تھا۔ یہ بکریاں کھانسی میں معلق تھیں۔ وہ وحشیانہ میں جاگ بکریاں دوتا پھرتا اور حق تعالیٰ سے درخواست کرتا پھرتا۔

”اے اللہ! اے میرے اللہ! آپ مجھ کو کہاں ملیں گے؟“ آپ کی گندی سہارا اور آپ کے سر میں لٹکی ہوئی کراہی اور آپ کو بھی بھاری پشیمانی تو آپ کی غیب غم خدائی کرتا۔ اے اللہ! اگر میں آپ کا گھر دیکھ لیتا تو مجھ و شام آپ کے لیے گئی اور وہ لایا کرتا۔

اور آپ کے ہاتھ کو دوسرے اور آپ کے جگر میں کی مالش کرتا اور جب آپ کے سونے کا وقت ہوتا تو آپ کے سونے کی جگہ کو تھڑے سے غروب صاف کرتا۔ اے اللہ! آپ کے اور میری تمام بکریاں قربان ہوں۔ اے اللہ! بکریوں کے تھکانے کے لیے میرا الفاظ۔ ”ہاتھ ہاتھ کرتا ہوں۔ وہ وہ حاصل آپ کی محبت کی تڑپ میں کرتا ہوں بکریاں تو صرف بیہوش ہیں۔“

الغرض وہ چرواہا حق تعالیٰ سے اپنا اضطراب پیش اس مرد سالک کو دیتا تھا کہ ایک حکایت حضرت موسیٰ کا اس وقت سے شروع ہوا جب انہوں نے یہ باتیں سنیں تو رشک فرمایا۔

”اے چرواہے! کیا حق تعالیٰ کو تو کی ضرورت ہے یا اس کا سر ہے؟ تو بکریوں میں کھانسی کرے گا۔ یا حق تعالیٰ کو بھوک لگتی ہے؟ تو اس کو بکریوں کا دودھ پلائے گا۔ وہ کیا بیمار ہوتا ہے؟ تو اس کی غم خدائی کرے گا۔ اے جاہل! حق تعالیٰ کی ذات نقصان و

اصلاح کی تمام باتوں سے پاک اور منزہ ہے تو جلد ٹوٹ کر تیری باتوں سے موزوں آتا ہے۔ بے عقل کی دوستی میں دشمنی ہے۔ حق تعالیٰ تیری ان عداوت سے بے نیاز ہے۔“

اس چرواہے نے حضرت موسیٰ کی۔ باتیں سنیں تو بہت شرمندہ ہوا اور غلبہ خوف و یاس اور شدت حزن و اضطراب سے گریبان بھار ڈالا اور دوتا ہوا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

ترجمہ۔ ”اے موسیٰ! تم نے میرے بندے کو بچے پیدا کیوں کر دیا؟ تم کو میں نے بندوں کا کوئی طرف متوجہ کرنے کے لیے بھیجا ہے نہ کہ خدا کرنے کے لیے۔ تمہارا کام وحل کا تھا نہ کہ وصال کا۔“

سیدہ لبیبہ ذہرا کبر و پٹنا

حقائق

”زندگی کے حقائق سے بہت زیادہ سنجیدہ اور بہت زیادہ دیکھو نہ ہو۔ ایک بات ہے وہ یہ کہ کم زندگی سے نکل کر جاگ نہیں سکتے۔“

گزیلا شاہ۔ کبر و پٹنا

بات ہے سمجھنے کی

وہ طنز و تیر سے جو شہد میں لٹک کر بھی مایا جانے مگر پھر بھی اس کی جھینم نہ ہوگی۔ وہ اگر زبان نہ ہوتی تو کوئی نہ گار نہ ہوتا۔ اس لیے رشک سمجھے لوگوں پر۔

وہ بے وقوفوں سے آپ دھوکے بھرت موت منار سکتے ہیں۔

وہ لوگ چاند پر پہنچنے کے لیے ہزاروں جتن کریں گے مگر دل تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی نہیں کریں گے۔

وہ اگر آپ اپنے گھر کے باہر تھی یہ عبادت کھولیں کہ مجھ سے ملنے والے چھوٹے کے پاؤں در قیمت کے جیسے باہر چھوڑ کر اس کو آپ سے ملنے کوئی نہیں لے گا۔

تحالہ خیالی



شہناز شازن سے سوال
یہ کون لوگ اندھروں کی بات کرتے ہیں
ابھی تو چاند تیری بازو کے دھلے بھی نہیں
خفا اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اس کے
وہ برہمی ہے کہ ہم سے انہیں مجھے بھی نہیں

یاسین کنول
یہ کیوں رک گئے کارواں چلتے چلتے
پلوں دیکھتے ہیں نشان چلتے چلتے
زمین کی کوئی بات من کو لگی گیا
جو لوں رک گیا آسمان چلتے چلتے

مررت الطاف احمد
بہت ادا اس ہوں تمہارے دل چپ ہر ملنے سے
ہوس کے قربت کرو کسی بھی پہلنے سے
تم لاکھ جفا سہی پر اتنا تو دیکھو
کوئی ٹوٹ گیا ہے تمہارے دھڑکنے سے

صافہ سلیم سندھو
کوئی شہنشاہ سے نالاغی ہے میری زندگی
دوستی کی محتاج ہے میری زندگی
ہنس لیتی ہوں لوگوں کو دکھانے کے لیے
دور دور کی کتاب ہے میری زندگی

سمر بشری انقل بٹ
لوگ بھی تو ہنسنے ہوا کرتے ہیں
سبز دکھو تو دھما دیتے ہیں
یہ کوثر
یہ عجیب محبت ہے کہ زمانہ جانتا ہے
نہیں اس کی مانتی ہوں وہ میری مانتا ہے
کوئی اس جگہ کے پوچھے کہ مہاسبے کیا ہے
میں ہی ناک چھائی ہوں وہ ہی ناک چھانکے

سمیرا حیات
میری محبت کے دولوں عالم غلام روشن تمام حکم
میں یاد کرنا بھی جانتا ہوں میں یاد آ بھی جانتا ہوں
نظر نظر میں سے کمالی قدم قدم پہ ہے لایا
مگر کوئی سکھانے دیکھے تو بارہا بھی جانتا ہوں
ذکر کو مل ستارہ

ہوس کے ملاوٹ نہ کیاری سے اکھاڑو لودے
دھوپ آئی ہے تو سواں بھی یہاں برسے گا
نیک بخت راحت
آدمی کرتے لگا سے جب سے من مانی بہت
اس نے خود ہی پال رکھی ہے پریشانی بہت
پیار دل میں ہم لہجہ رنگہ بلند رکھو
اسے بھی ہو جائے گی پیسے میں آسانی بہت

ثمینہ اکرم
بہت محسوسا منہ اجاب ہے میرا
نقہ تباہیاں، دواہیاں، ناہنیاں اور میں
سیدہ نسبت زہرا
سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانے میں ہیں
وقت لے آیا ہیں گردے زانوں میں ہیں
گم بھی ہو سکتے ہیں تاروں کے اداں میں
ن میں سکتے ہیں مگر تارہ فضاں میں کہیں

غفر مجید
خدا کے اس سے مجھ کو کہا اب سکر بھی دو
میں نہیں دیا تو سوال اس کی خوشی کا تھا
میں نے کھو یا وہ جو میرا تھا ہی نہیں
اس نے کھو یا وہ جو صرف اسی کا تھا

نرواقرا
میرے وقت کوئی لمحہ فرصت ہو دیا
میں بھی خود کو سیر نہیں کرتے رہا

بعد تحفہ حکومت پر پٹھا تو اس نے حاجت مندوں کی
امداد کے لیے اپنے خزانوں کے سکہ کھول دیے۔ جو
تخص بھی سوالی بن کر آتا، شہناز اس کی ضرورت کے
مطابق اس کی امداد کرتا۔ شہناز بادشاہ کا یہ رویہ دیکھا
تو ایک دفعہ وزیر نے مناسب موقع دیکھ کر خراجی
جٹانے کے انداز میں کہا۔

”حضور والا! پہلے بادشاہوں نے یہ خزانہ بہت
توجہ اور دانش مندی سے جمع کیا ہے۔ اسے یوں لٹا دینا
مناسب نہیں۔ بادشاہ کو کسی وقت بھی خطرات سے
غافل نہیں ہونا چاہیے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ کیا
واقعات پیش آئیں۔ اگر حضور والا اپنا سارا خزانہ تقسیم
کروں تو رعایا کے حصے میں ایک ایک جو کچھ بڑا آئے گا۔
لیکن اگر حضور رعایا کے لوگوں سے ایک ایک جو کچھ برابر
سوائیں تو حضور کا خزانہ بھر جائے گا۔“

نظارہ یہ بات بہت خیر خواہی کی تھی لیکن شہناز نے
کو بالکل پسند نہ آئی۔ اس نے کہا۔
”خدا نے مجھ پر فضل سے ایک بڑی سلطنت کا
وارث بنالیا ہے۔ میرا یہ کام نہیں کہ مال جمع کر کے کی
دھن میں تک جاؤں۔ بادشاہ کا فرض رعایا کو خوش مال
بنانا ہے۔ خزانے پر سائب بن کر بیٹھنا نہیں۔“
نظارہ، نفعہ نہ کراچی

ناممکن

ایک دانائے کسی نے پوچھا۔
”تم ایسا کیا کرو گے کہ سب کی نظروں میں اچھے
بن جاؤ؟“
دانائے جواب دیا۔ ”اسی دنیا میں اگر کوئی خوش
بھی بن جائے تب بھی اسے برا کہنے والے لوگ موجود
ہوتے ہیں۔“
ابن آبی جر۔ شمس لود۔



وہ جو محبتیں وقت بردار نہ ہو سکیں وہ قرض کی طرح
شود و سود جز چھٹی جلی باقی ہیں۔
وہ مسائل بڑھ کر دماغ کا دونا دونا بنے وقت کی ہے۔
وہ لفظ کھٹے پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ احساس کی
شدت انہیں بڑا تر بنا دیتی ہے۔

وہ جس گھر میں محبت لکھی رہتی ہے، اس گھر میں
خوشی کی پہاں کی طرح دستک دے کر آتی ہیں۔
جنہیں نہ پھینکا جاسکتا ہے نہ اپنا یا جاسکتا ہے۔
وہ کچھ لوگوں کے ساتھ پلنا دو جہاڑی تلوار پر چلنے
کے برابر ہوتا ہے۔ ساتھ میں تو چلنے کی تھکن
ہمارے قدم روک لیتی ہے۔ رک جائیں تو بدلتی
کاظم نہیں رکھنے نہیں دیتا۔
سارہ شیخ کراچی

رونی کی جگہ اون،

بیان کیا جاتا ہے کہ ہر مومن الرشید عباسی نے جب
ملک مصر کا انتظام سنبھالا تو اسے خیال آیا کہ یہی وہ
ملک ہے جس کے تحت ہر مومن قرآن نے فدا ہونے
کا دعوں کیا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ غلام پر نایا کر مصر کی
حکومت کوئی بڑی چیز نہیں اور اپنے غلام کو مصر
کا سب سے بڑا مالک بنا دیا۔

یہ صورت تھا۔ اس غلام کا نام خضیب تھا۔
وہ کیسا م عقل اور جاہل تھا۔ اس کا اندازہ اس
بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار جب مصر کے کافروں
نے اس کے دربار میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ دریا نے تیل
میں سیلاب آجائے کی وجہ سے ان کے کپاس کے مارے
کھیت برباد ہو گئے ہیں تو اس نے کہا کہ تم لوگوں کو چاہیے
تھا کہ روٹی کے پودوں کی نگہ داری کیے بغیر
اون پانی میں غراب نہیں ہوتی۔

یہ واقعہ ایک دانش مند نے سنا تو کہا۔ ”سچ ہے
اللہ بڑے نیاز ہے۔ عزت اور رزق کا اٹھلے عقل
پر نہیں بلکہ صرف اللہ کی ہدایت پر ہے۔“

عقل مند شہناز ما

کہتے ہیں، ایک شہناز اپنے باپ کے مرنے کے

شاعری سچ بولتی ہے

انعم شاعریہ

مجدد دل کے کبوتر کون پر دھڑے بڑی لڑنے
یہ نام دھرم کا ہے بس اس کوں چھڑاتی جا

توہم عشق میں مل کر اس تن کوں کیا کاہل
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگا لگا جا

ن۔ م۔ راشد کی شاعری ہمیشہ ہی متاثر کرتی ہے۔
ان کی شاعری میں مغفیل ادا استادوں کا ایک جہاں
آباد ہے بغیر انش۔
عزیز کہتے ہیں، ہم چند گھر آباد کرتے ہیں
موراس کی ایک ایسی ہی نظر دیکھتے ہیں جس میں
وہ زندگی کی اصلیت کو سنتے اور خوب صورت بریل بنوں
سے آواز لے رہے ہوتے ہیں۔

زندگی ایک پیرو زن!
جمع کرنی ہے کلی کو جوئی میں دودھ و شب بولانی و جھان
تیز و نرم انگیز، دیوار مہنسی سے خندہ زن
بال بکھرے دانت سیلے پیر ہیں
دھجیوں کا ایک سوزا اور ناپید اگلاں، تاریک بن!
نور۔ ہولکے ایک جھونکے سے اڑی ہیں ناگہاں
ہاتھ سے اس کے سر لاسے کاغذ دل کی بالیاں
اور وہ آچے سے باہر ہو گئی
اس کی حالت ادا بشر ہو گئی
سہ سے گاؤں پر گرا زباں

اب ہوا سے بار تک کر جھک گئی بت پیرو زن
جھک گئی ہے باؤں پر میسے دینہ ہواں!
زندگی تو اپنے ماحمی کے کنوئیں میں جھانک کر کیا باتے گی؟
اس پر لے اندھ بہرلی ہوائی سے بھرے سونے کنوئیں
میں
جھانک کر۔ اس کی خبر کیا لائے گی؟

کتنے ہیں لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں باہمی دھونڈتا تری عقل میں یہ گھیا

اچھی شاعری سے دلہانہ لگاؤ ہے بالآخر اس
عقل میں لاکھڑا کیا کیونکہ شاعری میں جذبات روح کا تھا
رکھتے ہیں اور جذبات کا اگر اظہار کیا جائے تو نا انصافی
ہوگی۔ بہر حال میرا انتخاب سب قارئین کی نذر۔ اپنی
بقیہ ادا سے مستفید کیجئے گا۔

شاعر مشرق کے کلام سے آواز کرتی ہوں۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یہ جنت مل سکے رہے ناہد دل کو
کہ میں آپ کا سنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوق اتنا
وہی لب ترائی مستنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہل ہوں اے اہل عقل
ہزار بے سحر ہوں بکھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں لازم کی بات کہہ دی
بڑا ہے لادب ہوں سزا چاہتا ہوں

اب کچھ کلاسیک شاعری سے انتخاب حاضر ہے۔
وکی دکنی جمال دوست شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ
غزلت زبانی فارسی، ہندی ادا و دکنی آئینہ شش
خوبصورتی سے کرتے نظر آتے ہیں۔
مت مٹنے کے شے میں ملے کوں بھلائی جا
نک مہر کے پانی سول ہے آگ بھجائی جا

فرحت غلام نبی
کیا حال پوچھتے ہو میرے کا دیوار کا
آئینے بچتا ہوں اندھوں کے شہر میں

شبنم ششاد
ہم اپنی ویران دنیا میں ہی اچھے لگتے ہیں حسن
جو ستارے چاند کے ہاں ہیں وہ بھی بگیا آئینے کے

صائمہ جمیل
جو حرف حق تھا وہی جا بجا کہا ہو گیا
پلا سے شہر میں میرا ہو بیسا سو بیسا
فلکست و قح مرا مسئلہ تین ہے خیز
میں زندگی سے نہ بد آزار اموں کا

عرفان طارق
آئے جلتے موسم اس کو ڈستے تھے
بنتے بنتے پکوں سے رو پتی تھی
آدھی رات گواہی تھی چپہرہ کر
آدھی رات کے چاند سے بے گشتی تھی

نڈا کاشان
اب وہ منقرض وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مجھے ہیں
ملنے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کب
ایک پل کے لیے کتنے ہیں گزرتے ہیں

فوزیہ غنڈلیب
مگر تغزل تھا عید و فاقے ہوتے ہوئے
سوچ رہا ستم نادر واکے ہوتے ہوئے
کے خبر ہے کہ کاسر بدست جھرتے ہیں
بہت سے لوگ سروں پر تاج کے ہوتے ہوئے

صائمہ عبد الجید
زندہ برگد کے اکیلے ہیں میں
اپنی تنہائی کے منظر دیکھوں
موت کا ڈانٹ لکھنے کے لیے
چند لمحوں کو ذرا مرد مچوں

بشری فرید بابو
وہ مجھ کو چھوڑ گیا تو مجھے یقین آیا
کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے
سادگی میری بلکہ سجدہ جاہت تھی
کس نے خود کو پیش کیا دل لگی کے لیے

حارثہ
ہم اپنے مزاج میں کسی بھی دھوکے نہ ہو سکے
کسی سے ہم ملے نہیں کسی سے دل ملا نہیں
غزوہ چوہدری
سفر تو شاید کھٹ گیا
میں کہ جیوں میں بٹ گیا

رضاء نشاط
کوئی بن ہو میرے ساتھ کامی میری جگہ کو سمیٹ لے
میں نہ اقل کے سامنے سزا کی ایک لک بن کر ادا
شبنم ششاد احمد
دہکتی ہے میرے اندر فصل مغفیلوں کی
نم بات کرتے ہو یاد کی پھولوں کی
اک لڑکی ہنسی تھی چھوٹی چھوٹی لڑکی پر
مگر یہ بات بڑی ہے جلتے کتے مالوں کی

رمضان شکیل راؤ
کہنے کو اس سے عشق کی تفسیر ہے بہت
بہت بے وقوف تھی، کچھ تو میرے بہت
بھٹا۔ اوہ پاس تو میں سوچتی رہی
ناموشیوں کی اپنی بھی تاثیر ہے بہت

آجالا
ایک تو دل کے دستے دُشوار بہت تھے
پھر میں پیسا سا اچھے سائیں دھپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

ن۔ تحریم
رہے جبر و دود کہ ہم سے جو معاملہ کے چالوں نے
بسی کئی دھرمائی دل میں سے ڈالوں نے
دل کاغذوں سے رش کیا ہے شیش، مائل آئینوں،
ہم کو کتنا درد بلایا ان بے درد سوالوں نے

اس کی تہ میں سسٹر بڈل کے سوا کچھ بھی نہیں
جز صدا۔ کچھ بھی نہیں۔

آٹھ ہی بیس مہر زبلی کی ہوگی شاید...
ایسا ہی اندازہ ہے کچھ ساتھیوں کا
چارا عشریہ چھ بیس سالوں کی عمر قریب تک ہے
کتنی عمر لگتی تھی تم نے کتنے میں...؟
اور اب کل کر کس دنیا کی دنیا لاری سوچ رہی ہو
اور بیس اب...
تین ہی بیس سال بچے ہیں....

احمد اسلام احمد کا شمار میرے پسندیدہ شعرا
میں ہوتا ہے۔ ان کی نمائندگی سے مجھے خود قلمی زندگی ایک
نظم و نثر کا پہلا لڑکی میری نظموں پر مبنی ہے
جیسے ان نظموں کا محور اس کی اپنی ذات ہے
(یعنی انہی سند لڑکی اور کوئی بھی ہو سکتی ہے)
اس لڑکی کے نام سے ملنے سے جو کچھ اپنے نام لکھا ہے
اس سے ہی منسوب ہوا
(شاید میرا دم ہو لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے)

جب میں نظم سناتا ہوں وہ آنکھ پر لگتی ہے
مجھ سے نظموں میں عایش تو وہ شرمائے لگتی ہے
کچھ لکھے وہ پھل لڑکی۔ کم کم سی ہو جاتی ہے
لیکن سوزی و دیر میں پھر سے پھرتی ہو جاتی ہے
جیسے میری نظم کی لڑکی۔

شاہد زکی کی سادہ سسی شاعری نے تلے لفظوں
میں "اندر" کھل میں "باہر" لانے کا ہنر جانتی ہے۔ ان
کی نظم "نیشیت" ملاحظہ ہے۔
اپنے بلبلے میں سوچتا ہوں تو
مجھ کو اکثر گمان ہوتا ہے
میرے محبوب اترے ہاتھوں میں
بری، سستی بھی ایک سسٹر شیبے
جس کی قسمت فقط سلگنا ہے
جس کو میں چند ثانیوں کے لیے... اپنے ذاتی سکون
کی خاطر
تو بولوں سے لگا کے رکھے گا
آخری کش لگائے گا... اور پھر...
اپنے پاؤں تلے مل دے گا

گوارا آگہی کا سفر طے کرنے اور روانے میں بے مثال

یا

نغمہ سنان



13 جنوری 2011ء۔ میرے ابا اپنے خالق
حق سے جا ملے۔ جو دنیا میں آیا اسے جانا ہی ہے۔
آگے بچھے خلد بدیر ہر ایک کو یہ دنیا چھوٹی ہی ہے
اس حقیقت کا علم ہر ایک کو ہے مگر جب یہ حقیقت
اپنے کسی بہت ہی پیارے فرد اور عزیز رشتے کے
حوالے سے سامنے آتی ہے تو بہت دنوں تک تسکین
نہیں آتا۔ آج پندرہ دن بعد بھی میں خود کو تسکین دلا رہی
ہوں کہ واقعی ایسا ہو چکا ہے مجھے وہاں دے والے
میرے لیے دعا کرنے والے سب خاموش ہو چکے ہیں۔
میرے گھر آنے کی راہ دیکھتی خود انتظار آکھیں بند
ہوئی ہیں اور مجھ سے یہ سوال کرتی زبان ساکت ہو گئی
ہے کہ۔
"تو پھر کب آئے گی؟"

اب کی یاد جب میں سسرال سے میکے جاؤں گی تو
میری متعلقہ نگاہیں کرے گا وہ کونہ خالی نہیں کی جہاں
وہ اپنے بید پر لیٹے یا بیٹھے ہوتے تھے۔ اور میرے سلام
کرتے سے پہلے ہی سب سے پہلے یہی بات کہتے۔
"طیبرہ آئی۔"

"یہ سوال ہے یا خوشی کا اظہار۔" میں ان کے پاس
جا کر بیٹھ جاتی۔

وہ اپنے کسی روایتی ابا تھے جیسے عمو "کمائیوں میں
بیان کیے جاتے ہیں۔ دوست اور میاں۔ سخت گیری
اور سخت دلی سے کوسوں دور خوش مزاج اور ملنسار
فطرت۔

میں ان کے بارے میں کیا بیان کر دوں۔ 78 برس
کی زندگی چند صفحات میں بیان کرنا بہت ہی مشکل

والدین۔ زندگی کا سب سے قیمتی رشتہ محبت کا۔ جو بیکراں جو زندگی کی گڑی دھوپ میں ابر رحمت ہے۔ ان کی
جدائی بہت برا سا محسوس ہوتا ہے۔ مگر جیسے ہی وقت گزر جائے یہ غم ہمیشہ تازہ رہتا ہے اور زندگی کے ہر لمحہ میں یہ کمی محسوس
ہوتی ہے۔ لیکن یہ غم یہ مضمون اپنے والد کی یاد میں لکھا ہے۔

ہے۔ اور مجھے تو دنیا کو کوڑے میں بند کرنے کا ہنر بھی
نہیں آتا۔ مگر پھر بھی اپنے غم اور لفظوں کا قرض تو
دا کر رہا ہے۔
پتہ نہیں کس کا کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عالم افراد
بہت پسند ہیں اس لیے دنیا میں ان ہی کی کثرت ہے۔
میرے ابا ایک عام انسان تھے ان کے پاس کوئی اعلا
ذکری بھی نہیں تھی مگر اچھائیاں اور اخلاقی خوبیاں
اور ذہنی و جسمانی صلاحیتیں، کسی ذکری کے محتاج
نہیں ہوتے۔

اپنے بچپن کے دور میں ذرا بھانک کر دیکھوں تو
محبت بھری یادوں کے کتنے ہی پھول ادھر ادھر ٹکھڑے
ہوتے ہیں۔ جب لایا تو کمری بی آئی اسے میں بھی۔ ان
کے ڈیوٹی سے آتے ہی ہم بچے ان کے ارد گرد جمع
ہو جاتے اور پھر وہ اپنی پیش کی جب سے جس نکلتے،
کبھی کبھی میٹھی رنگ برنگی گولیاں، کبھی ٹافیاں،
چاکلیٹ، کبھی بسکٹ، منٹوں سینڈل میں جیسے خلی
ہو جاتے۔

جب بھی ان کی ڈیوٹی رات کی ہوتی۔ ان کا دن
سوئے میں کم ہمارے ساتھ باتوں اور کھیل میں زیادہ
گزرتا۔ گرمیوں کی لمبی دھوپ میں ریڈیو پاکستان سنتے
ہوئے ہمیں اپنی ناگواری یہ جھولا جھلاتے۔

جو جو کے ناموں کے چند اے اٹھ اٹھ ٹے
نہیں۔

ہم ان محدودوں کے مزے لیتے ہوئے اس
مخصوص آواز اور انداز کا بھی لطف اٹھاتے جس کا مظاہرہ
ریڈیو پاکستان کا ناؤ نرسا اپنے پروگرام میں کرتا۔
”اب آپ سٹیل کے پروگرام“ آئیڈیل کی تلامذہ۔

آخری لفظ بڑا کھینچ کر ادا کیا جاتا اور لبا کے ساتھ
ساتھ ہم بھی جسے تن گوش ہو جاتے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں نی آئی اے
کی نشین ٹھیکہ پر دے کر ہزاروں ملازمین کو یکے بعد دیگرے
قلم بے روزگار کر دیا گیا۔ میرے لبا بھی انہی مصیبت
زدگان میں شامل تھے۔ آخری بار ٹھیکوں کی سمولت
ملی۔

”عمو کر آؤ سچ اللہ بھائی!“ کسی نے مشورہ دیا۔

”ارے ہماری ٹیکم اپنے نیسے والوں سے مل آئے۔
میں ہمارا راج بھی ہے مڑو بھی۔“ میرے لبا نے اس
سمولت کو مشقی پاکستان جانے کے لیے استعمال کرنے
کا فیصلہ کیا۔ جہاں میری لباں کا مکہ تھا۔ دوران
فوری لبا و پار بیوی بچوں کو وہاں لے جا چکے تھے۔ اب
یہ تیسرا موقع تھا۔

پتہ نہیں آگے کیسے حالات ہوں۔ پھر جانے کا
موقع ملے نہ ملے۔ لبا ابا میں اور میرے دو چھوٹے
بھائی۔ ہم مشرقی پاکستان چلے گئے جو کئی سال پہلے بنگلہ دیش
بن گیا تھا۔ اس سے پہلے 70 میں یہ لوگ وہاں
گئے تھے۔ اور لبا اپنے ماضی کی داستانیں اور قیام پاکستان
اور اس کے بعد سیاسی اگھاؤ بچھاڑ سب ہمیں سنایا
کرتے تھے۔ ایک بار سوط و دھاکہ کے متعلق باتیں
کرتے ہوئے بتاتے لگے۔

”بھلا تو ریڈیو پاکستان اور بی بی سی سے آخری وقت
تک بھی بڑی اچھی اچھی خبریں آتی رہیں مگر وہاں اس
سے پہلے ہی بہت کچھ فضا بن چکی تھی کہ
دارالحکومت دھاکہ سے کئی میل دور ضلع میمن سنگھ
کے گاؤں چاند پور کے شہر خواجہ کسانوں نے لبا سے

سیاسی حالات و معاملات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔
”میں اب آخری بار اس پاسپورٹ پر آئے ہوں انکی
بار و بار لے کر آتا رہے گا۔“
بقول لبا کے۔

”میں فیس پرا کہ اب حالات اتنے بھی خراب
نہیں کہ خدا خواست یہ قیمت آئے۔“

یہ 70 کی بات ہے۔ اور فقط ایک ڈیڑھ سال بعد ہی
یہ فیس ”تسوؤں میں بدل گئی۔“

”تمہاری لباں کو بہت دکھ ہوا تھا بنگلہ دیش بننے کا یہ
بہت دوری تھی۔“ لبا ماضی کے اور فاقے ملتے تو بہت کچھ
سنایا کرتے تھے۔ بتایا کرتے تھے۔

”صدمہ تو خیر ہمیں بھی بہت ہوا تھا۔ جب
ہمارا پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی بہت
دکھ ہوا تھا جب لبا (قائد اعظم) فوت ہوئے میں اس
وقت سندھ میں تھا ہم سوچتے تھے کہ پتہ نہیں اب
پاکستان کا کیا ہے؟ پھر لیاقت علی خان کو شہید کر دیا
گیا۔ میں اس وقت پٹی میں آیا (بڑی بہن) کے پاس
تھا۔ طے کا سنا تو ہم بھی بڑے شوق سے وزیر اعظم
صاحب کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے گئے۔ لوگوں کے
جوم میں ہم کئی پیچھے تھے۔ اچانک شور مچا رہا ہوں
لگا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ پتہ چلا کہ وزیر اعظم کو کسی نے گولی
مار دی ہے پھر وہ بے چارے بھی شہید ہو گئے۔“

”پھر؟“ محبت سے سنتے سنتے میں نے بے ساختہ
سوال کیا۔

”پھر کیا؟ پھر تو بس یہ ہوا کہ ٹوچل میں آیا۔ ایک
مظنون آئے اور فوج گرا بڑی مشکل سے گئے۔ پھر تو
جو کیا پہلے سے بتا رہا تھا۔ ہم میں بھی تو برائیاں ہیں۔
اللہ کا قانون ہے جسے قوم ہوتی ہے وہی ہے ہی حکمران
مسلمہ کیے جاتے ہیں جس جو وقت گزر گیا وہی اچھا
ہے۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو جاتے۔
میں بچپن میں کئی نام ہوائے قسم کی تھی۔ لڑکوں
کے ساتھ لڑکوں والے سارے ہی کھیل کھیلے پھر میرا
قد بھی چھوٹی عمر سے ہی لبا ہو گیا تھا۔ محلے کے بستر
گھر لے ایک مخصوص پروردی سے تعلق رکھتے تھے۔

مخصوص رسم و رواج تھے جہاں لڑکیاں بہت جلد گھر
بٹھائی جاتی تھیں۔ باج چھ جہاں عیس پر ہذا کافی سمجھا جاتا
تھا۔ کوئی کوئی تو وہ بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ میری
سب ہم چولیوں کا گھر سے لگنا نہ ہو گیا تھا۔ ایک میں
ایک دو لڑکیاں اور میں جو لبا کی دکان کے سامنے ہی
کھیل کو میں لگی رہتی تھیں۔

”سچ اللہ بھائی! لبا بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اب
لڑکوں کے ساتھ کھیلنا دینا چھاپنا نہیں لگتا۔“ محلے کے
کوئی بزرگ تاج من جاتے۔ وہ دور بھی اچھا تھا۔ لوگ
خیر خواہی کے جذبے سے تنقید کرتے تھے اور سننے
والے بھی برا نہیں مانتے تھے۔

”ارے بھئی دن میں کھیلنے کو دینے کے پھر بڑی کا اس
میں چلی جائے گی۔ پڑھائی سے ہی نام نہیں ملے گا۔“
لبا ان کی بات سن کر بڑی مصوویت سے مسکراتے
ہوئے اپنا نکتہ نظر بیان کر رہے تھے۔

انہوں نے نہ بھی بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق
کیا۔ نہ ہی لڑکیوں کو وہ سب لڑکوں سے کوئی الگ
مخلوق سمجھتے تھے۔ وہ ہم سے کہا کرتے تھے۔

”اب وہ دور گیا کہ لڑکیاں گھروں میں بیٹھ کر چوما
پکی سنبھالتی تھیں۔ اب تو وہ جہاز اڑا رہی ہیں۔ لڑکوں
سے بھی آگے آگے ہیں ہر شعبے میں۔“

”اور گھر واری؟“ میری لباں ذرا تیز بھی نظروں سے
دیکھتیں۔

”ہاں ہاں! وہ بھی ضروری ہے بہت ضروری ہے۔“
وہ فوراً ”لائسنس بدل کر لباں کی لباں میں مل جاتے۔“

ایسا ماضی پاکستان کی سیاسی تاریخ اور دنیا جہاں کے
تھے کتنا کچھ ہم ان سے سنا کرتے تھے میں اکثر سوچتی
ہوں کہ مجھ میں جو تھوڑی بہت لکھنے کی صلاحیت ہے
وہ میرے لبا اور لباں دونوں سے ہی دور ہے میں ملی ہے۔
دونوں کو ہی ماضی کی کہانیاں سنائے کا شوق ہے۔ بڑی
دلچسپ انداز میں کہانی کی طرح دوانی سے یوں بیان
کرتے تھے کہ سننے والا اور بہت محسوس نہ کرتا۔

جنگ اخبار کے سٹڈے میگزین میں ایک سلسلہ
”زمین جینیندہ جینندہ گل حشر“ کے نام سے ہے جس

میں ان افراد کے انٹرویوز شائع ہوتے ہیں جو فطری
عرصے سے ایک سی جگہ قیام پذیر ہوں۔ میرے لبا 56
یا 57 سے اسی گھر میں رہائش پذیر تھے اور ہمارے گھر
میں KDA کا قدیمی کمپو بھی اپنی اصل حالت میں
موجود تھا۔ میں نے سٹڈے میگزین میں خط لکھ کر بھیج
دیا۔ وہاں سے لکھے ہی دن فون آیا۔ اور ایک مہینے بعد
ماجد فرید سالی انٹرویو کے لیے آئے۔ وہ انٹرویو شائع ہوا
تو لبا سے زیادہ ان کے وہ دوست احباب خوش ہوئے
جن کے ساتھ روزانہ ان کی محفل جعتی تھی۔
”تمہاری بیٹی نے تمہارا نام اونچا کر دیا۔“ ان کے
دوستوں نے بھڑکیا۔

مجھے یہ بات بتاتے ہوئے ان کا چہرہ خوشی اور خسرے
چمک رہا تھا۔ اور یہ چمک اس وقت بھی ان کے چہرے
پہ آئی جب میری پہلی تحریر شائع ہوئی تھی۔ وہ تب بھی
بہت خوش ہوئے اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

قیام پاکستان کے بعد جب وہ گرا بی میں تھے تو کچھ
سال مولانا ظفر احمد انصاری کے گھر ملازم رہے۔ وہاں
کے بارے میں وہ کچھ جانتے۔ پہلے پہل تو ہم اسے
دلچسپی کے ساتھ سنا کرتے تھے کہ یہ بھی ان کی داستان
حیات کا ایک ورق ہے پھر میں نے بدورتی ایک ناول کی
شکل میں لکھا۔ اک خواب تھا جو کچھ دیکھا۔ کے نام
سے یہ تحریر خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوئی۔ اس کے
شائع ہونے کے بعد مولانا صاحب کی بیٹیاں اور داماد لایا
سے ملے گھر آئے۔

”مجھے پچھانا؟“ سلام دعا کے بعد ان کے داماد نے
پوچھا۔

”ہاں تم عمر ہو۔“ لبا نے تقریباً ”پچاس برس بعد
بھی انہیں با آسانی پہچان لیا تھا۔“

پھر جو گزرے وقت کی یادیں تازہ ہوئیں تو وقت
گزرنے کا پتہ ہی نہیں چا اُن لوگوں سے ملاقات کے
بعد لبا بہت خوش تھے اور ہر آگے گئے کو یہ بتاتے کہ
پچاس پچپن سال پرانے شناساؤں سے ملاقات ہوئی
ہے۔ ان کی خوشی دیکھ کر اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا
کہ اللہ نے جو تھوڑی بہت صلاحیت لکھنے کی دی ہے

اس کا معمولی صاحب کو ادا ہوا ہے شاید...

ہماری ذات سے ہمارے والدین کو تھوڑی سی بھی کوئی خوشی ملے تو اس سے جو خوشی ہمارے دل کو ہوتی ہے اس کا بیان زبان و لہجہ سے کرنا بہت مشکل ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر اور علاقے سے ان کو عجیب طرح کا لگاؤ بلکہ محبت تھی۔ ہم یمن بھائی جب بھی انہیں فوس کرتے کہ یہ گھر کھینچ کر لیں اور خرید لیں۔ کسی اتنے علاقے میں تو بس بھٹ کا ایک باب کھل جاتا۔

”اچھا علاقہ کیا ہوتا ہے؟ کیا وہاں سونے چاندی کے گھر ہوتے ہیں؟“ وہ سوال کرتے۔
”بڑے لکھے لوگ ہوتے ہیں ماحول اچھا ہوتا ہے۔“ ہم میں کوئی دلیل دیتا۔

”سارے بڑے لکھے ہمارے جیسے علاقوں سے ہی جاتے ہیں جب کچھ بن جاتے ہیں تو سب سے پہلے پرانا گھر اور علاقہ چھوڑتے ہیں اور یہاں سے اچھا ماحول کہاں کا ہوگا۔ ذرا سے دکھ لکھ میں سب لوگ شریک ہو جاتے ہیں۔“

ان کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوتا تھا۔
”سب رشتے دار یہاں سے چلے گئے۔ ایک ایسے ہم ہی ابھی تک کنوئیں کے مینڈک بنے ہوئے ہیں۔“

”ہاں ہم مینڈک ہی ٹھیک ہیں۔ ہماری لہل اور چار بچے ہمیں سے رخصت ہوئے اور ہمیں دفن ہیں ہم بھی اسی گھر سے رخصت ہوں گے، ہم ہمیں نہیں جائیں گے۔“ وہ قطعیت سے کہتے۔

”ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانا گوارا نہیں اور اپنے بزرگوں کی ہڈیاں چھوڑ کر ایک ملک سے دوسرے ملک آگئے۔“

”وہ تو پاکستان کی بات تھی۔ اس کے لیے سب کچھ چھوڑا تھا۔“ وہ بات ہی ختم کر دیتے۔
قرآن میں ایک جگہ قرآن الہی کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ۔

”اور ہم ضرور حمیں خوف، بھوک، تباہی اور مال

کی آزمائش سے دوچار کریں گے۔ اور جو لوگ صبر سے کام لیں گے۔ ان کے لیے بہترین اجر کی خوشخبری ہے۔“

”اللہ کی طرف سے ان کو یہ آزمائشیں پیش آئیں۔ پہلو بھی کی بی بی دس ماہ کی عمر میں ٹائفلوئڈ کا شکار ہوئی اور 28 برس کی عمر میں فوت ہوئی اور اس عمر تک اس کی بیٹی نشوونما 6.7 برس کی بچی سے زیادہ نہ تھی۔ 28 برس تک اس آزمائش میں پورا اترتا۔

بے شک اللہ ہی کی نصیب تھی۔ وہ بیٹی لایا کی بہت لائق اور عزیز بیٹی تھی۔ ماں تو اپنی ممتا سے غبور ہوتی ہے کہ اولاد جتنی بھی ہو اس سے محبت کی جائے مگر میرے ابا نے بھی باپ ہونے کا کیا حق ادا کیا۔ بڑے سخت پروردہ تو سوتی بھی ابا کے ساتھ تھی۔ وہ میری تقریباً ”روزہ بی چاول“ جلتے تھے۔ ابا اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول بچا کر بیٹی کو دیتے تھے وہ بہت خوش ہو کر کھاتی کبھی اگر انا سے چاول بچا کر نہ دیتے تو بیٹی ناراض ہو جاتی۔ اس کے بعد اس شریک کی حقدار میں بھی اور میری شادی کے بعد میری چھٹی بیٹی اس کی عادت تھی کہ گھر میں جو کوئی بھی جان بچاؤں کے لوگ آتے یا کوئی اجنبی سمان ان کی چادر میں یا برقع اور جو تیاں قورا اپنے قبضے میں کر لیتی اور مہمانوں کو واپس نہیں جانے دیتی۔ ابا کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو اسے بسا پھسلا کر اس سے چیزیں واپس لے یا اس کی کوئی ضد ختم کرے۔ نہ ملے اور کبھی کبھی کرواتے کے معاملے میں کبھی ضد پکڑ لیتی۔ ماں ذرا سختی کرتیں تو شام میں دودھ کرایا سے شکایت ہوتی۔

”ایمانی! اس اہل کی بیٹی کو گھر سے نکال دو۔“ شکایت کر کے وہ براہی منی بنا دیتی۔

”پھر بیٹی! اراٹھے کون پائے گا؟“ ابا سوال کرتے۔
”اچھا۔“ مگر آئندہ کے لیے سمجھا دینا اچھی طرح سے کہ بیٹی کو تنگ نہ کرے۔“ وہ تنبیہ کرتی۔

”ہاں ہاں بالکل“ میں ابھی ادا تھا ہوں میری بیٹی کو کیسے رلا دیا۔ ”ابا سے چپکارے اور وہ بیٹی۔“
دو بیچ شیر خوارگی میں فوت ہوئے۔ ایک بیٹا گیارہ

سال کی عمر میں معمولی سا بیمار ہو کر ”انا“ چٹ پٹ ہو گیا۔ ابا اس کا ذکر کرتے تو پتا نہ

”مفتی کے مرنے کا مجھے بہت صدمہ ہوا۔ کئی روز تک صبر نہیں کیا۔ میں روزانہ رات کو جب بھی سوئے کے لیے لیٹا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ بہت خوبصورت اور صحت مند بچہ تھا۔ مجھے بہت رونا آتا تھا۔ پھر ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بہت خوبصورت باپ ہے اور اس میں بہت سارے بچے کھیل رہے ہیں ان ہی میں مفتی بھی ہے۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ کہنے لگا۔ لیا میں یہاں بہت خوش ہوں۔“ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ بس اس خواب کے بعد مجھے صبر آ گیا۔

جب ریڈار سنٹ کے بعد سے اپنی وفات سے ایک ڈیڑھ سال پہلے تک وہ کبھی فادع نہیں بیٹھے۔ اپنی محنت سے روزی کمانے کا چکا اخیر عمر تک ان کے ساتھ رہا۔ حالانکہ ان کو اس محنت کی ضرورت نہیں تھی کہ اللہ نے بہت فرماں بردار اور خدمت گزار بیٹوں سے نوازا تھا مگر پھر بھی وہ کہتے تھے ”جب تک ہاتھ پاؤں میں دم ہے کام کریں گے۔“

اپنی والدہ کی طرح وہ بھی یہی دعا کرتے تھے کہ اللہ چلنے ہاتھ پاؤں سے اٹھائے۔ کسی کا تھکن نہ کرے اور اللہ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ ان کے انتقال سے چار دن پہلے میں ایک ہفتہ گھر رہ کر رہی تھی۔ میرے آنے کے دو سرے میرے دل ان کے پاؤں میں ہلکی سی سوجن آئی تو ہم سب سے کہنے لگے کہ۔

”بس اب وقت قریب ہے۔ یہی علامت ہوتی ہے آخری سفر کی۔ پاؤں میں سوجھ جاتے ہیں۔“

”ابھی تمہیں بتائی ہیں ابا! ان کی خوشیاں دیکھ کر جائے۔“ میں نے ان سے کہا تو وہ بیٹے پڑے۔
”یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دکھائے گا تو دیکھ لیں گے۔“ وہ فوراً ہی کچھ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

”پھر وہ سوجن میرے سامنے ہی اتر بھی گئی تھی۔ اور وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوا شیش شیش تھے مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ کوئی خواب دیکھا تھا یا کچھ محسوس ہوا تھا

کہ اپنے دوستوں کی محفل میں انہوں نے کہا۔ ”میرے کوئی بھی ہودن جھڑت کا ہو گا۔“

اتوار کے دن میں اپنے گھر جا رہی تھی۔ ان سے ہاتھ ملایا۔ خدا حافظہ کہا۔ میری بیٹی کو مبارکباد میرے سر پر ہاتھ بچیر اور آخری بات جو مجھ سے کہی وہ یہ تھی کہ۔

”اللہ خوش رکھے۔“

پھر میں اپنے گھر آ گئی۔ جمعرات کے دن وہ اپنے معمول کے مطابق لیٹے اور بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شام کو بچے کچھ سمان آئے ان کے ساتھ چلنے کی باتیں کیں۔ ایک کھینے بعد طبیعت خراب ہونے لگی۔ آواز کم نکل رہی تھی کہنے لگے کہ ”مفتی میں بلغم پھنس رہا ہے۔“ میرے دونوں چھوٹے بھائی اسپتال لے گئے۔ گھر سے جاتے وقت اپنے پیروں پہ چل کر گئے اور جاتے جاتے ایک سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ادا کر دی۔ اپنی جیب سے سارے پیسے نکال کر وہ ہم کو دے دیے۔

”پیسے میرے پاس ہیں ابا! میں اس سے کما۔“

”جی اور کھلے یا پھر واپس میں دیکھیں گے۔“

ابا نے سارے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیے۔ اور پھر واپس تب آئے جب صبح بدن کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

میرے بھائی بعد میں ہمیں بتا رہے تھے کہ وہ ابا کے پاس ہی مڑے تھے اور انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ یوں خاموشی اور سکون سے انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ جس کی وہ پیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

اب ہمارے پاس ان کے لیے دعائیں ہیں کہ اولاد کی دعا والدین کے لیے حد تک جاری ہے اور یہ احساس کہ اب دنیا میں ہم سے ان سے زیادہ محبت کرنے والے لوگ ہوں گے یا ان سے کم محبت کرنے والے لوگ ہوں گے۔ ہم وہاں سے ہمارے ابا نہیں ہوں گے۔ ان جیسا ہمارے لیے نہ کوئی تھا نہ ہے اور نہ ہو گا۔ ہمارا دواں دواں ان کے لیے دعا کرتا ہے کہ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین!



پندیرانی

جہاں قیمت اپنی عزت اور قوی حیثیت کی ہی چٹائی
ہو۔ ہمارے فنکاروں کے لیے بھارت جا کر کام کرنا
گامیابی کی سندیں چکا ہے اب معروف گلوکار راحت
علی خان کو ہی بچے جو بھارتی حکام کے ہاتھوں ہری
طرح "عزت افزائی" کے بعد بھی ان سے مزید اچھے
تعلقات کے خواستگار ہیں اس لیے زیر حراست اور
تفتیش کے بعد پاکستان واپسی پر کسی کہہ رہے ہیں کہ
اگر عزت سے بلوایا گیا تو دوبارہ بھارت ضرور جائیں
گے۔ اب اسے پیسے کی سرکش نہیں ہو گیا کہ راحت
علی خان دوبارہ وہاں جاتے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ واضح
رہے کہ پہلی ایئر پورٹ پر ایک لاکھ چوبیس ہزار ڈالر کی
کیشرز رقم رکھنے پر مٹی لائڈنگ کیس کے سلسلے میں



تبدیلی

یوں لگتا ہے کہ شان کو ہماری فلم انڈسٹری کی واقعی
فکر ہے۔ اس لیے بے حد تندی سے نئے چہرے
متعارف کروانے کی مہم پر لگے ہوئے ہیں۔ یہ ان ہی
کی کوششیں ہیں کہ اداکار جگن کاظم نے لالی وڈ میں کام
کرنے کی بانی بھری ہے۔ ان دنوں جگن کاظم رقص
سیکھے پر کمر بستہ ہیں اور کوڈو گرافنگ جگن حسین سے
تربیت لے رہی ہیں۔ جتنی متحرک جگن کاظم کی وی پر
نظر آتی ہیں۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جگن جلد
اس مشن میں کامیاب ہو جائیں گی۔ خیر سے یہ تبدیلی
شان کے منسل ہوئی۔ چلیں کسی اداکار کو تو ذاتی فائدہ
کے علاوہ فلم انڈسٹری کی بہتری کا خیال آیا۔ ورنہ اب تو
سب کو بلو وڈ جا کر پیسے کمانے کی فکر ہے۔



راحت علی خان کو شامل تفتیش کیا گیا تھا، ممکن ہے
"پندیرانی" کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے۔ جب
اصلی بائبلٹ کے بجائے ایسے بھائی چارے کا مظاہرہ
ہو گا تو عزت افزائی تو ہونا لازمی ہے۔

مقبولیت

فریڈ پرویز نے "پنگ باز جتنا" کا کرسمس کے
حوالے سے اپنی علیحدہ شہرت پائی۔ اس حوالے سے
وہ کہتی ہیں۔

"میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن مجھے
تو انجینئرنگ کی سولی سے بھی ڈر لگتا تھا۔ میرا پہلا
حشر گلوکاری ہی ہے۔ اگرچہ مجھے متعدد پارفلوں میں
کالم کی پیش کش بھی ہو چکی ہے۔ جہاں تک سوال
میری نجی زندگی کا ہے تو مجھے دس سال گزرنے کے
بلوچہ بھی کچھ بتا نہیں ہوا۔ ہمارے درمیان عمر کا
واحد فرق ہے اس کے بلوچہ میرے شوہر کم اور
بوست زیادہ ہیں۔"

بیان

ہمایوں سعید مجھے ہوئے اداکار ہیں اور جب سے
انہوں نے بلی وڈ میں قدم رکھا ہے خامے "مدر" بھی
نظر آنے لگے ہیں۔ اس لیے بیان داغنے ہوئے
شجیدہ گالان اوڑھ لیتے ہیں۔ گزشتہ بقول وہ کہتے نظر



آئے۔ "مجھے دکھلا کرنے والے لوگ خت برسے
لگتے ہیں (شوہر میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ پائے جاتے
ہیں) اور ایسے لوگ جو محنت کے بجائے شہرت کے
پیشین رکھتے ہیں اور دوسروں کی راہ میں روڑے اٹھاتے
ہیں۔ شوہر میں آمد سے قبل میرے بڑے ختے تھے
خاص طور پر کھانے پینے میں۔ لیکن اب میں بالکل
بدل گیا ہوں۔ اب میں وال چاول بھی شوق سے کھا لیتا
ہوں۔ البتہ بالک اور ماش کی دال مجھے سخت ناپسند ہیں۔
دوسروں کے لیے اپنے آپ کو تبدیل کرنے والے
لوگ میری نظر میں کبھی پر اعتماد نہیں رہتے۔ (ہمایوں!)
راج کہے کیا آپ نے ایسا نہیں کیا؟ میں نے زندگی
میں صرف ایک لوکی سے محبت کی اور اسے اپنی بیگم
بٹالے میں دیر نہیں لگائی (کنے میں کیا حرج ہے) اور یہ
محبت پہلی نظر کی ہے جس کا حرج بھی بدستور قائم
ہے۔"

(کیا واقعی؟)

امستثنیٰ

عتیقہ اوڑھو کو، دونوں شوہر کے منظر نامے سے

غائب ہیں لیکن وقتاً فوقتاً میڈیا پر آکر مکالم کرنا نہیں
بھولتیں۔ اب وہ ایک سیاسی جماعت کی میڈیا
کوآرڈینیٹر بن چکی ہیں اور شہزادی شخصیات کے حوالے
سے رائے دینا بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ ورنہ ملک کے
معاملے کے بعد اب راحت نے علی خان سے کیے گئے
ناورو اسلوک پر ان کا کہنا ہے کہ ”پاکستانی فنکاروں کے
تحفظ (صرف فنکاروں کا؟) کے لیے حکومت کو
اقدامات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مستقبل میں
آئندہ ایسی صورت حال کا سامنا نہ ہو۔ (بی بی شاہد اب
بھول رہی ہیں آپ کی جماعت نے ڈالر لے کر قوم کی
بینی کاسو کیا ہے) میری حکومت سے گزارش ہے کہ
راحت ویسے ہی وہاں خاصا بھگت کر آئے ہیں اس لیے
یہاں قانونی کارروائی کر کے انہیں پریشان نہ کیا
جائے۔“ (غالباً) اب انکم ٹیکس کے ٹککے سے سفارش
کر رہی ہیں بی بی! انکم ٹیکس والے کمائی پر ٹیکس لیتے
ہیں۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔)

کارکردگی

ہماری ٹیم ورلڈ کپ کے ابتدائی میچوں میں بیٹنگ
اور فیلڈنگ میں تو کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے پائی



البتہ بوننگ کے شعبے میں پھر بھی قسمت کی وحشیانہ
ہوئی۔ خاص کر شاہد آفریدی نے ابتدائی تین میچوں
میں 14 وکٹیں لے کر یہ ثابت کیا کہ بطور کپتان ان کا
انتخاب کس حد تک صحیح ہے۔ ساتھ ہی وہ مسلسل
میچوں میں ڈوٹس لےنے والے سب سے پاکستانی بابر بھی من
گئے۔ کوآرڈینیشننگ ٹیم ان کی وکٹوں کی تعداد سترہ ہو
چکی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ بوننگ کے ساتھ ان کی بیٹنگ کا
جلاوٹ کب کام کرے۔ ”یوم بوم آفریدی“ کا مینہ
ایسے تو نہیں استعمال کیا جاتا۔

شہرت

حمیرا ارشد وہ گلوکارہ ہیں جنہوں نے اپنے وقت کی
ہمسور آبادیوں کی موجودگی میں اپنی پہچان بنائی۔ اس
میدان میں آمد کے حوالے سے وہ اگلی ہیں ”میں نے
ملکہ ترنم نور جی کی کاکیت ”صدائوں اپنے پیار کی“ کا
کرشمہ پائی۔ اللہ نے شہرت پانے کی خواہش بہت کم
عمری میں پوری کر دی تھی۔ اب بھی اپنی گائیکی کو مزید
بہتر بنانے کی تک وہ دوش لگی رہتی ہوں۔ میں نے
گائیکی کی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی جبکہ
موسیقی کے کچھ نمونے سیکھنے کا اعزاز نصرت علی خان
سے بھی حاصل ہوا۔ یہ چیزیں آگے چل کر میرے

بے حد کام آئیں۔ سب میرے شوہر احمد بٹ میرے ہر قدم
پر ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ہر طریقے سے میرے کام
کو سپورٹ کرتے ہیں۔ (شوہر، مکمل ویکم کی ایسے ہی
پذیرائی کرتے ہیں) میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ نجی
مصروفیات کو بھی بھرپور وقت دینے کی کوشش کرتی
ہوں۔ شادی کے بعد میں حمیرا احمد بن گئی لیکن چونکہ
میری پہچان اپنے پہلے نام سے ہی ہوئی اس لیے میں
نے اپنا نام بدلتا ضروری نہیں سمجھا۔ احمد بٹ کو بھی
اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے! (اعتراض ہو بھی تو
وقت گھٹاں سلا میں۔)

یہ بیان کا مینہ

کیونکہ مسلکوں، فرقوں، زبانوں، صوبوں اور لسانی
فرق کی بنیاد پر پہلی گئی جماعتیں نہ ہماری سیاسی رہنمائی
کر رہی ہیں نہ ہمیں دین کی تبلیغ سمجھا رہی ہیں اور نہ
ہی ہمیں ایک قوم کی روح پر متحد کر رہی ہیں۔ آج
ہماری قوم کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ (حنا خواجہ بیات
آؤ کہنا ضروری ہے۔“)

بلا وفاق حکومت کی ملازمتوں میں مختص کوئٹہ کو
مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے اندرون سندھ کے 35
ہزار 317 بل فوجیوں نوکریوں سے محروم ہیں البتہ
سندھ کے شہری (کراچی، حیدر آباد) کوئٹہ میں اضافہ کر
دیا گیا ہے۔ (عاجز جملی روزنامہ عبرت)

پاکستان کو جتن نقصان فوجی آمریتوں نے پہنچایا
ہے ”جتن نقصان سیاست دانوں نے نہیں پہنچایا۔ جب
ملک ٹوٹا ہے تو فوجی جرنیل کی حکومت تھی۔ ایک
وزیر اعظم کو پچاسویں کی تو جرنیل کی حکومت تھی،
خود کش حملے بھی ایک جرنیل کے دور اقتدار میں شروع
ہوئے اور پھر اسی جرنیل نے ہمیں این آرا کا تحفہ
دیا۔ (حلد میر۔ جنگ)



☆ ہر ٹینسٹر کی طرح مشرف کو امریکی سرپرستی کی
ضرورت تھی۔ تاہم ایون اس کے لیے تکمیل آرزوی
صبح مراد کے طور پر آیا۔ اس نے پاکستان کی بیوری
کھلی اور سب کچھ جانے ڈیوٹیوش کی جھولی میں ڈال
دیا۔ جواب میں اس نے صرف ایک چیز مانگی۔
”میرے اقتدار کی کرسی سلامت رہے۔“ امریکہ
نے ”مستفور سے“ کہا اگلے سات برس تک شہنشاہ عالم
پنہ مشرف کی ٹیم ترسیاہ کاریوں کے باوجود اس کے
اقتدار کو استحکام بخش رہا اور جواباً ”پرویز مشرف“ پاکستان
کی یوشیاں فوج فوج کر عالمی درجوں اور آس پاس
منڈلاتے چیل کوئل کوٹھانا رہا۔

(عرفان صدیقی ”آز نقش خیال“)





تین عبرت ناک واقعات

کہتے ہیں تین ناک خود کو دہرائی ہے۔ ان تین عبرت ناک واقعات کو موجودہ دور کے آپس میں دیکھیں اور اپنیوں کی غداري مسلمانوں کے تفرقہ سے دوسری اقوام نے جو فائدہ اٹھایا اور مسلمان حکمران دولت کی ہوس میں مبتلا ہو کر مال و زر جمع کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو فائدہ نہ پہنچایا تو یہ مال و زر ان کے بھی کسی کام نہ آسکا۔

1۔ بغداد کو فتح کر لینے کے بعد ہلاکو خان نے اپنے ساتھیوں سے مقتصد باند کے قتل کا مشورہ کیا۔ تو سب نے یہ ہی مشورہ دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ مگر وہ نام نہاد مسلمانوں نے یعنی نصیر الدین طوسی ابن علقمی جو کہ دربار میں موجود تھے کہا کہ "بادشاہ سلامت! آپ اس کے گندے خون سے اپنی تلوار کو تپا کر نہ کریں۔ بلکہ اس کو چمڑے میں لپیٹ کر چیل دیا جائے۔" ہلاکو خان نے اس کام کی ذمہ داری ابن علقمی کے سپرد کی جو کہ مقتصد باند کا وزیر رہ چکا تھا۔

ابن علقمی نے اپنے آقا کو چمڑے میں لپیٹ کر ستون سے باندھا اور اس پر لاتوں کی پادش کر دی یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا۔ پھر اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ اس کی لاش زمین پر ڈال کر تانہوں کو اس پر اچھلنے کو دے اور اسے چھلنے کا حکم دیا۔ (استغفر اللہ)

2۔ جب تاتاری عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے اور مسلمانوں کا خون بے دریغ بہا رہا تھا۔ تو امام ابن قیم نے مسلمانوں کو ان کے خلاف جہاد کے لئے ابھارا مگر کئی فقہاء اور علماء کا اس بارے میں

اختلاف ہو گیا کہ تاتاریوں کے خلاف جنگ کرنا جائز بھی ہے یا نہیں! تاتاری جہاں چاہے تھے اور مسلمان آپس میں فرقہ وارانہ جنگ لڑ رہے تھے۔

3۔ بغداد کے خلیفہ نے کئی زمین و درجوں ہمارے تھے۔ جن میں تبریز، ہواہرات اور اشرفیوں کی تھیلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہلاکو خان نے یہ سب خزانے اپنے قبضے میں لے لیے اور خلیفہ کو نظر بند کر دیا۔ جب خلیفہ کو بھوک لگی اور اس نے کھانا مانگا تو ہلاکو خان نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ ہواہرات کا ایک ٹشٹ بھر کر خلیفہ کے سامنے لے جاؤ اور اسے یہ کھانے کے لیے دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تب خلیفہ نے کہا کہ میں انہیں کیسے کھا سکا ہوں۔ میرے لیے روٹی لاؤ۔

تب ہلاکو خان نے ایک بڑی عبرت انگیز بات کہی۔ "جس چیز کو تم کھا نہیں سکتے اسے جو حوضوں میں کیوں بھرا رکھا ہے۔ اسے اپنی اور مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے خرچ کیوں نہ کیا۔ اور سپاہیوں کو کیوں نہ دیا؟ تاکہ وہ تمہاری طرف سے مہماری کے ساتھ لڑتے اور تمہارا ملک بچاتے۔"

(شہناؤ شانزے سیال، ضلع خانیوال)

یاجوج و ماجوج

یاقوت بن فوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک فساد کی کردہ تھا۔ اور ان لوگوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی یہ لوگ ہلاکے جنگجو، خونخوار اور بالکل ہی وحشی اور جنگلی تھے جو بالکل جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ موسم رتھ میں یہ لوگ اپنے غاروں سے نکل کر تمام ہتھیار

اور سبزیوں کھا جاتے۔ اور خشک چیزوں کو لاد کر لے جاتے۔ آدمیوں اور جنگلی جانوروں یہاں تک کہ سانپ، بچھو، گرگٹ اور ہر چھوٹے بڑے جانور کو بھی کھا جاتے تھے۔

حضرت ذوالقرنین سے لوگوں نے فریاد کی کہ آپ ہمیں یاجوج و ماجوج کے شر اور ایذا رسانیوں سے بچائیے۔ اور ان لوگوں نے اس کے عوض کچھ مال دینے کی بھی پیشکش کی تو حضرت ذوالقرنین نے فرمایا۔ "مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ دیا ہے بس تم لوگ میری مدد جسمانی محنت کے ذریعہ کرو۔"

چنانچہ آپ نے دونوں پہاڑوں کے درمیان بنیاد کھدوائی جب پانی نکل آیا تو اس پر پھلائے گئے تانبے کے گارے سے پتھر جمائے گئے اور لوہے کے تختے اوپر نیچے جن کر ان کے درمیان لکڑی اور کوئلہ بھرا دیا۔ اور اس میں آگ لگوا دی اس طرح یہ دیوار پہاڑی کی بلندی تک اونچی کر دی گئی اور دونوں پہاڑوں کے درمیان کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی پھر پھلایا ہوا تانبہ دیوار میں پلا دیا گیا جو سب مل کر بہت ہی مضبوط اور نہایت مستحکم دیوار بن گئی۔

روایت ہے کہ یاجوج و ماجوج روزانہ اس دیوار کو توڑتے ہیں اور دن بھر جب محنت کرتے کرتے اس کو توڑنے کے قریب ہو جاتے ہیں تو ان میں سے کوئی کتا ہے کہ اب چلو پانی دیوار کو کل توڑیں گے۔ دوسرے دن جب وہ لوگ آتے ہیں تو حکم خدا سے دیوار پھٹنے سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ جب اس دیوار کے ٹوٹنے کا وقت آئے گا تو ان میں سے کوئی کتے کا۔

"اب چلو! ان شاء اللہ کل اس دیوار کو توڑ ڈالیں گے۔"

ان لوگوں کے ان شاء اللہ کہنے کی برکت سے اور اس کلمہ کا یہ ثمرہ ہو گا کہ دوسرے دن دیوار ٹوٹ جائے گی۔ یہ قیامت قریب ہونے کا وقت ہو گا۔

دیوار ٹوٹنے کے بعد یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے اور زمین میں ہر طرف فتنہ و فساد اور قتل و غارت کریں گے۔ چشموں اور تالپوں کا پانی بی ڈالیں گے اور جانوروں اور درختوں کو کھا جائیں گے۔ زمین پر ہر جگہ پھیل جائیں گے مگر مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، اور بیت المقدس ان تینوں شہروں میں یہ داخل نہ ہو سکیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان لوگوں کی گردنوں میں کینے پیدا ہو جائیں گے اور یہ سب ہلاک ہو جائیں گے قرآن مجید میں ہے۔

ترجمہ یہاں تک کہ جب کھولے جائیں گے یاجوج و ماجوج اور وہ ہر بلندی سے پھٹکتے ہوں گے۔

نمر بن شہزادی۔ مسلمان

حضرت عمرو بن عبد العزیز

ایک رات امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب اپنے خادم کے ساتھ مدینہ کی گلیوں میں لوگوں کے حالات معلوم کرنے نکلے۔ کچھ دیر بعد تھکاوٹ کے باعث ایک گھری دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اُسے میں صبح روشن ہونے لگی۔ اس گھر کے اندر سے ایک پورھی عورت کی آواز آنے لگی جو اپنی بیٹی کو دودھ میں پانی ملائے گا حکم دے رہی تھی لیکن بیٹی مسلسل انکار کر رہی تھی کہ امیر المومنین نے دودھ میں پانی ملائے سے منع کیا ہوا ہے۔ بیٹی نے کہا۔

"کیا اس وقت عمر تمہیں دیکھ رہا ہے جو تم اس سے ڈر رہی ہو۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"اگر عمر ہمیں نہیں دیکھ رہا تو کیا ہوا۔ عمر کا رب تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔" حضرت عمر اس لڑکی کی دین واری سے بہت متاثر ہوئے غلام سے فرمایا۔

"اس گھر پر نظر رکھو۔" لڑکی کے بارے میں معلوم کیا گیا تو یہ چلا کہ وہ سفیان بن عبد اللہ ثقفی کی بیٹی ام عمارہ ہے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ کنواری ہے تو حضرت عمر بن خطاب نے اپنے تمام بیٹوں کو بلا کر بوجھا کہ تم میں سے کون اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ ان کے

یزید بن عبد الملک کا نام سن کر چپ ہو رہے۔
اور جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنا نام
اچانک سنا تو کہنے لگے "اے کما"۔
"میں نے تو کبھی اس منصب کی تمنا نہیں کی۔"
انہیں کندھے سے پتھر کر مڑا کیا گیا تو پتھروں
سے رو رہے تھے ذرا سکون ہوا تو کہا۔
"لوگو! مجھے تمہاری بیعت نہیں چاہیے جسے چاہو
اپنا غلیفہ بناؤ۔" ہر طرف لوگوں کا شور مچ گیا، کہنے
لگے۔

"ہم آپ کے علاوہ کسی کو نہیں چاہتے۔" آپ
بست مشکل سے اس ذمہ داری پر راضی ہوئے اور پہلا
خطیبہ دیا کہ۔

"قرآن کے علاوہ کوئی کتاب الہی نہیں۔ اللہ کے
رسول کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ جو اللہ نے حلال کیا
وہ قیامت تک حلال ہے۔ جو اللہ نے حرام کیا وہ
قیامت تک حرام ہے۔"

غلیفہ بننے ہی انہیں موت اور قبر کا خوف سونے
نہیں دیتا تھا۔ ابھی صرف ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ وہ
انتہائی کمزور اور لاغر ہو گئے رنگ فق ہو گیا۔ صرف ایک
جوڑا پٹی رہ گیا۔ اپنی ساری جائیداد لاج عائدہ کے لیے
وقف کر دی۔

امراء نے ہوامیہ جن کی جاگیریں چھین کر بیت المال
کو دے دی تھیں وہ برہم تھے انہوں نے آپ کے قتل
کی سازش تیار کی آپ کے ہی ایک نوکر کو ایک ہزار
اشرفیاں دے کر اس کے ذریعہ زہر کھلا دیا۔
آپ پر اس سازش کا بھید کھلا۔ تو کہا کہ "تو کر کو
بلاؤ۔" اس سے ایک ہزار اشرفی لے کر بیت المال میں
جمع کرا دیں۔

وہ ذاتی انتقام لینا اپنی توہین سمجھتے تھے تو کر سے کہا۔
"چکے سے بھاگ جاؤ۔ لیانا ہو کہ میری موت
کے بدلے تمہیں قتل کر دیا جائے۔" اسی زہر کی وجہ
سے 101 یعنی 720ء میں وفات پانگے۔ (اللہ و
انا الیہ راجعون)

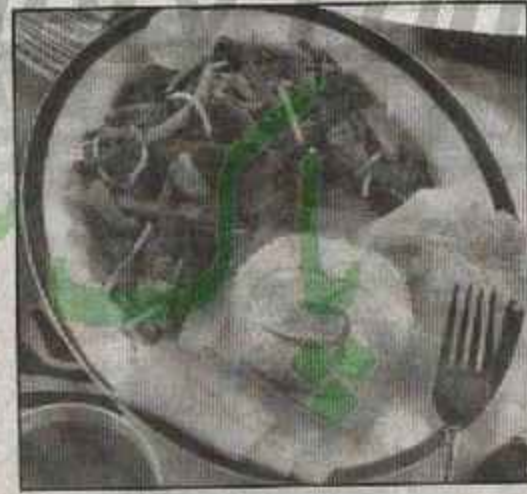
(عذر اعرام ملکان)

میں عامہ نے کہا میں شادی کرنا چاہتا ہوں پتا نیچر رشتہ
مانگنے پر عامہ کی شادی اس ایک بخت لڑکی سے ہو گئی
عامہ کے بل بھی پیدا ہوئی اس کا نام اب عامہ رکھا گیا۔
یہ حضرت عمر کی پوتی ہوئیں۔ جب جوان ہوئیں تو ان
کی شادی مروان بن حکم کے بیٹے عبد العزیز سے ہوئی۔
اب عامہ عامہ کے بل بھی پیدا ہوا۔ اس کا نام انہوں نے
اپنے دلوانے نام پر مقرر کھلا یہ وہی عمر بن عبد العزیز
ہیں جو خلیفہ المسلمین بنے جنہیں پانچواں خلیفہ
راشد کہا گیا یہ تھا ایک عظیم الشان پھل ایک خوش
بخت لڑکی کی خدا بخشی تھی۔ آئیے ان کے بارے میں کچھ
جانتے ہیں۔

حضرت عمر عبد العزیز کا شمار خلافت امویہ کے امراء
میں ہوتا تھا۔ ایک دن میں کئی لباس بدلتے۔ سونے
چاندی کے برتن میں کھانا کھاتے نوکروں کی کوئی کمی نہ
تھی جو آرزو کرتے پوری کی جاتی مگر جیسے ہی منصب
خلافت سنبھالا۔ مسلمانوں کے معاملات کی ذمہ داری
کا بھرموں پر پڑی انہوں نے ناز و نعم کی تمام اشیاء ترک
کر دیں۔ آپ کا دور زندگی 681ء سے 720ء تک
ہے۔

یزید بن عبد الملک کو ولی عہد نامہ کر دیا۔ غلیفہ نے
یہ پیغام ایک سربراہ لفظی میں لکھوا کر کہا کہ "میں
ابھی زندہ ہوں اس حکم پر میرے مرنے کے فوراً بعد
سب کی بیعت لے لینا۔" جیسے ہی غلیفہ کا انتقال ہوا
انہوں نے اپنا معتبر شخص دوواڑے پر کھڑا کر کے کہا
"اگر خلیفہ کی المیہ بھی اندر چلنا چاہے تو کہہ دنا کہ وہ
آرام کر رہے ہیں۔ لہذا ان کے پاس جانے کی اجازت
میں پھر انہوں نے "واقع" کی جامع مسجد میں تمام
امراء کو اکٹھا کر کے کہا کہ "آؤ اس کی بیعت کرو جن کا
نام اس لفظ میں درج ہے۔" ہشام نے اعتراض
کیا۔

"ہمیں پہلے نام بتاؤ۔" آپ نے کڑک کر اسے
خاموش کر دیا۔ سب نے اس لفظ کے نام پر بیعت
کر لی جب لفظ کھولا گیا تو حضرت عمر بن عبد العزیز کا نام
لکھا۔ مسلمان کے بھائیوں کے شور مچانا چاہا تو ان کے بعد



موم کے پیکوان

خالہ جیلانی

اچاری پکھن بھرے کر لیے

ضروری اجزا :

مرغی	آدھا کلو
کر لے	ایک کلو
کلوچی	کھانے کے دو چمچے
سوکھی میتھی	کھانے کے دو چمچے
سوف	کھانے کا ایک چمچ
اورک پیٹ	چائے کا ایک چمچ
لال مرچ پاؤڈر	حبہ اقلہ
نمک	حبہ اقلہ
سوکھا دھنیا	چائے کے دو چمچے
گرم مسالا پاؤڈر	چائے کا ایک چمچ
انار دانه	کھانے کے دو چمچے
پیاز (درمیانی سائز کی)	ایک عدد (باریک کٹ لیں)
دہی	ایک پیالی
تیل	حسب ضرورت

کر لے اچھی طرح چھیل لیں اور ان کے پیچ نکال دیں۔ اب کر لوں کو نمک لگا کر رکھ دیں۔ مرغی میں اورک نمک لال مرچ گرم مسالا پیسی ہوئی کلوچی میتھی اور سوف ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ (کلوچی اور سوف کو بیل پر پیں لیں پھر دہی میں ڈالیں) ایک گھنٹہ کے بعد کھانے کے دو چمچے تیل گرم کر لیں اور پیاز کو کچا پکا کر لیں۔ اس میں فریج میں رکھی ہوئی مرغی ڈال دیں۔ مرغی کو اس وقت تک پکائیں جب تک دہی کا پانی خشک نہ ہو جائے۔ دہی کا پانی خشک ہونے کے بعد گوشت کو ہڈیوں سے الگ کر لیں۔ اس کے بعد کر لوں کو دھو کر نیچوڑ لیں۔ سوکھا دھنیا اور انار دانه کو تیل میں اور اوپر سے ڈال دیں۔ چکن کے آئیرے کو کر لوں سے بھر دیں اور دھانے سے کر لے بند کر دیں۔ ایک پیالی میں تھوڑا سا تیل ڈال کر گرم کر لیں اور کر لے ڈال دیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ رہیں

(نمک کر لے چھیل نہیں) پھر ہلکی آگ کر کے رکھ کر دم پر رکھ دیں۔ اہلی کی چٹنی اور سندور کی روٹوں کے ساتھ پیش کریں۔

مرچوں کا سامن

ضروری اجزا :

برہی مرچ	آدھا کلو
سفید زیرہ	کھانے کا ایک چمچ
سفید ل	کھانے کے دو چمچے
ثابت دھنیا	کھانے کے دو چمچے
خشکی ش	کھانے کے دو چمچے
کھوپرا	ایک چھوٹا سا ٹکڑا
اوپر دی گئی ان سب چیزوں کو توے یا فرائنگ سین میں بھون کر پیں لیں۔	
اورک لسن پیسا ہوا	کھانے کا ایک چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کلوچی	چائے کا ایک چمچ
پیاز	تین ڈلی (بہی چٹیں لیں)
ہندی	چائے کا ایک چمچ
اہلی کارس	ایک پیالی
بھار کے لیے :	
ثابت لال مرچ	چار عدد
سفید زیرہ	چائے کا ایک چمچ
اہلی کارس	ایک پیالی
کر لے پتہ	چند پتے
میتھی دانہ	چند دانے
تیل	ایک پیالی

ترکیب :

مرچوں کو اچھی طرح سے دھو کر چھیلی میں رکھ لیں اور پانی خشک ہو جائے ایک پیالی میں تیل ڈال کر گرم کر لیں۔ جب گرم ہو جائے تو مرچوں میں تھوڑا سا نمک ملا کر تیل میں ڈال دیں ہلکا سا فرنی کر لیں۔ فرنی کی دہی مرچیں نمک کر لال ثابت مرچ میتھی دانہ کر لے پتہ اور سفید زیرہ ڈال کر سیاہ کر لیں۔ جب سیاہ ہو

جائے تو پیسی ہوئی یا زڈال کر ہلکی گالی کر لیں۔ پھر ہندی اورک لسن پیسے ہوئے مسالے مرچیں نمک کر لے پتہ اہلی کارس کلوچی اور ہری مرچیں ڈال کر ہلکی آگ میں دم میں رکھ دیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو مرچوں کا سامن تیار ہے۔

کھٹھے آلو

ضروری اجزا :

آلو	ایک کلو (چھوٹے سائز کے)
سفید زیرہ (بنا اور پیسا ہوا)	کھانے کا آدھا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا	آدھی گھی (باریک کٹا ہوا)
اہلی کا لالہ کارس	ایک پیالی
کالی مرچ کٹی ہوئی	چائے کا ایک چمچ
تیل	ایک پیالی
لال مرچ کٹی ہوئی	کھانے کا ایک چمچ
چٹنی	چائے کا ایک چمچ
برہی مرچ	تین عدد (باریک کٹی ہوئی)
پودینہ	آدھی گھی (باریک کٹا ہوا)
رائی پیسی ہوئی	چائے کا ایک چمچ
لیوں	دو عدد

ترکیب :

آلو اچھی طرح سے دھو کر ایک پیالی میں پانی کے ساتھ ڈال کر ہلکی سی بھاپ دے لیں۔ پھر چمک اٹار لیں۔ ایک کڑائی میں تیل گرم کر لیں۔ تھوڑے تھوڑے آلو لے کر شری مائل ہونے تک پکائیں۔ جب سارے آلو لے جائیں تو تیل سے نکال لیں۔ کڑائی میں تلے ہوئے آلو اور سارے مسالے ڈال کر ہلکا سا بھونیں۔ دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ تیار ہونے پر کھنے کو گرم گرم پوری کے ساتھ پیش کریں۔

مسالے بھری بھنڈی

ضروری اجزا :

بھنڈی	آدھا کلو
(دھو کر چھیلی میں رکھ لیں)	

سفید زیرہ
نمک
ہلی
ثابت و حنیا
سولف
تیل
ترکیب :

کھانے کا ایک چمچ
حسب ذائقہ
کھانے کے دو چمچے
کھانے کے دو چمچے
کھانے کا ایک چمچ
ایک پیالی

پہلے سارے سالہ جات تو بے شمار استہرا بھون لیں۔ پھر یاد رکھیں۔ اسی کو تو مٹی پانی گرم پانی میں ڈال کر گاڑھا رس نکال لیں۔ اس میں یہ یاد رکھنا سالہ ملائیں۔ چاہیں تو بالکل چٹکی بھر نمک ملا دیں۔ اب بھنڈی میں چیرا لگا کر سالہ بھرو دیں۔ ایک فرانک چین میں تیل گرم کریں۔ پھر تھوڑی تھوڑی بھنڈیاں لے کر کھلی آگ میں قرانی کریں اور سب نمک ڈال کر زیر پانچ منٹ دھکیں دھانپ کر دم پر رکھ دیں۔ گرم گرم پوری کے ساتھ پیش کریں۔

وہی تیل جل فری
ضروری اجزاء :

پانڈا (بڑی)
شملہ مرچ
نمک
بند گو بھی
نمک
پھول گو بھی
سرخ مرچ یا ڈور
بلدی یا ڈور
اورک (تازہ)
لسن
سفید سرکہ
نماؤ پوری
نمک کالی مرچ یا ڈور
ترکیب :

پیار کو کٹ لیں۔ شملہ مرچ نمک بڑ گو بھی اور

پھول گو بھی کو ایک مربع آج کے نمکوں میں کٹ لیں۔ نمکوں کو پھل کر اس میں پانڈا لیں۔ اس میں تمام سبزیاں ڈال کر درمیانی آگ پر پانچ منٹ تک قرانی کریں اور چمچ چلاتی رہیں۔ اس کے بعد اس میں سرخ مرچ یا ڈور بلدی یا ڈور اورک لسن اور سرکہ شامل کر دیں۔ نماؤ پوری ڈال کر 10 منٹ تک بھونیں۔ حسب ذائقہ نمک اور پانی ہوتی سیاہ مرچ چھڑک کر پیش کریں۔

لوکی کارائینہ
ضروری اجزاء :

لوکی
دہی
نمک
کالی مرچ یا ڈور
سفید زیرہ یا ڈور
ہری مرچ
بھار کے لیے
کڑھی پتہ
زیرہ
ثابت لال مرچ
تیل
ترکیب :

لوکی اہل لیں اور بھنڈی کر کے گرائنڈ کر لیں۔ دہی نمک کھلی مرچ ہری مرچ سفید زیرہ ڈال کر تھوڑا سا گرائنڈ کر لیں۔ لوکی پوری طرح گرائنڈ نہ ہو۔ سو رنگ ڈش میں نکال لیں۔ قرانی چین میں تیل گرم کریں۔ زیرہ ثابت مرچ کڑھی پتہ ڈال دیں۔ بھار تیار ہو جائے تو لوکی کے رائتے پر بھار لگا دیں۔ اب بے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔



حاملہ خواتین کی غذائی ضروریات

اسلام میں والدین بالخصوص ماں کے احرام کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں کہ ماں حالت حمل میں کئی اقسام کی تکالیف برداشت کرتی ہے۔ وضع حمل کے وقت موت و زندگی کی تکفیش میں مبتلا ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پرورش بہترین تربیت اس کی خوراک و صحت کا خیال رکھنا بھی ماں کے ہی فرائض میں شامل ہے۔ لیکن یہ فرائض عورت تب ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے جب وہ خود تندرست و توانا ہو۔ اسی بنا پر کہا ہے کہ عورت پر صرف ایک بچے کی تربیت کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک نسل کو تربیت دیتی ہے۔ ماں کا صحت مند ہونا ہی گھر کے تمام افراد کی اچھی صحت کا ضامن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کی بزرگ خواتین "لوکیوں کو ہمیشہ اچھی خوراک لینے کی تاکید کرتی ہیں کیونکہ "جان ہے تو جہاں ہے۔" اس تمسید کا مقصد خواتین کو نہ صرف ان کے فرائض کی یاد دہانی کرنا ہے بلکہ ان کی توجہ مناسب اور صحت بخش غذا کی جانب بھی مبذول کرنا ہے۔ اس دوران میں خالص اور تازہ غذا کا حصول ناممکن ہی نظر آتا ہے لیکن ہماری تھوڑی سی محنت اور اچھی عادات اسے ممکن بنا سکتی ہیں۔

حمل خواتین کے لیے وہ دور ہوتا ہے جس میں ان کی غذائی ضروریات بڑھ جاتی ہیں جنہیں اگر مناسب خوراک کے ذریعہ پورا نہ کیا جائے تو ماں اور بچہ دونوں کے لیے مشکلات اور تباہیوں کا باعث بنتا ہے۔ دورانِ حمل خواتین کو پروٹین، مختلف وٹامنز اور آئرن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی ایک غذا کا روزانہ استعمال یہ کی پوری نہیں کر سکتا اس لیے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ مختلف قسم کی غذا میں اپنی روزمرہ خوراک میں شامل کریں۔ جیسے پھل اور سبزیاں بے شمار وٹامنز اور معدنیات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ گوشت، مرغی، انڈا اور مچھلی جسم کو پروٹین، حیاتین ب، فولاد فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسری خیر



دریغہ نسیم



اور وہ بچے سے بنی مختلف اشیاء، ٹیٹیم اور وٹامن ڈی کے حصول کا سترن ذریعہ ہیں۔ حمل کے پہلے تین ماہ میں اضافی 100 کیلو گرام وزن ہوتی ہیں۔ مثلاً "سوئے سے پہلے ایک گلاس "دودھ" چند بکٹ یا پھر کوئی پھل آپ کو یہ اضافی حرارے فراہم کر سکتا ہے۔ اس مرحلے پر فولک ایسڈ کی جسم کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ہر پتے والی سبزیوں اور گندم میں پایا جاتا ہے۔ لیکن صرف غذا سے اس کی مناسب مقدار حاصل نہیں ہو پاتی اس لیے ڈاکٹر فولک ایسڈ کی گولیاں بھی تجویز کرتے ہیں۔

دوسری سہ ماہی میں حاملہ خواتین پروٹین اور ٹیٹیم کو اپنی غذا کا لازمی حصہ بنائیں۔ کیونکہ اس مرحلے پر نومولود کی ہڈیاں اور نشوونما کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چائے

ہو جاتی ہے۔ اس سے بچاؤ کے لیے کھانے کے بعد ریٹ وان بجی سڑیاں جن میں کھیر، گاجر، بند گوبھی، سارو کے پتے وغیرہ شامل ہیں لازمی کھائیں۔ کھانے سے پہلے پانی پئیں، اسپینول حل کر کے پئیں پانی روزانہ سے زیادہ پئیں آٹھ سے دس گلاس پانی روزانہ پینے سے قبض اور ہسملی سوجن وغیرہ کی شکایت دور ہوتی ہے۔ اگر اتنے گلاس پانی نہ پیا جائے تو پھلوں کا تازہ جوس بھی ساتھ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمیشہ تازہ اور خالص غذا کے حصول کی کوشش کریں۔ پیکٹ میں محفوظ اشیاء آسانی تو فراہم کر سکتی ہیں مگر صحت نہیں۔ ایک آم نکتہ جس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ حملہ عورت کا وزن ہے۔ بچے کی پیدائش کے لیے جسم میں اضافی خون اور پانی درکار ہوتا ہے۔ دوران حمل اوسطاً 35-30 پونڈ وزن کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ پر خاتون کے قدر اور وزن کی مناسبت سے مختلف ہو سکتا ہے۔ قدر اور وزن کے اس تناسب کو BMI یعنی Body mass index کہا جاتا ہے۔

تارمل ریٹ۔ BMI۔ اضافی وزن کم وزن 19.8 سے کم۔ 28.40 پونڈز تارمل وزن 19.8-26.0۔ 25.35 پونڈز زائد وزن 26.0-29.0۔ 15.25 پونڈز فربہ 29.0 سے زیادہ 15.0 پونڈز

اگر کم جسم میں خون کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے جو نومولود کی نشوونما کے لیے از حد ضروری ہے۔ آخری تین ماہ میں آئرن کا استعمال زیادہ کریں۔ یہ گوشت، کچلی، گندم، پالک اور ڈرائی فروٹس (خشک میوے) میں واقع مقدار میں پایا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی آئرن کے supplement بھی ضرور لینے چاہیں۔ اچھی غذا کے علاوہ ہلکی پھلکی ورزش اور چھل قدمی ضرور کریں۔ خوش اور مطمئن رہیں کیونکہ خوش رہنا بھی صحت مند کی علامت ہے اور یہ بچے کی نشوونما پر اچھا اثر دلاتی ہے۔

کافی کور کولا مشروبات کا استعمال مت کریں کیونکہ ان میں شامل کھٹین بچہ کی ذہنی نشوونما کے لیے نقصان دہ ہے۔ آخری چھ ماہ میں حملہ خواتین اپنی غذا میں 300 کیلوریز کا اضافہ نہ کریں چونکہ یہ مصروفیت ہے۔ جن حملہ خواتین کے خون میں شوگر کی مقدار زیادہ ہو انہیں خاص طور پر شوگر سے پرہیز کرنا چاہیے البتہ شہد کا استعمال فائدہ مند ہے کیونکہ یہ توانائی پہنچاتا ہے اور اس میں ضروری وٹامنز کا ایک خاص تناسب موجود ہوتا ہے۔

حملہ خواتین کو آخر کے چھ ماہ میں جو اضافی خوراک اور غذا استعمال کرنی چاہیے اس کے لیے ذیل میں ایک چارٹ دیا جا رہا ہے۔

غذائیں مقدار حرارت 300 calories۔ چار سے چھ مرتبہ گندم کی روٹی یا چاول وغیرہ پروٹین 60-75 mg۔ گوشت مرغی یا مچھلی دن میں ایک مرتبہ کالیم 1200 mg۔ تین سے چار گلاس دودھ روزانہ

فولک ایسڈ 15 mg۔ ٹماٹر، ہری سبزیوں، پالک، ترش آئرن 30 mg۔ پھل دن میں ایک مرتبہ وٹامن 200 IU۔ دو اونڈے روزانہ یا دس پیئیر وغیرہ

کئی دہائیوں سے غذائیت اور فائٹ فوڈ کا استعمال کم سے کم کریں کیونکہ یہ اشیاء معدے پر اضافی بوجھ کا باعث بنتی ہیں اور کم تیل میں تیار کردہ گوشت یا مرغی کا سائز سبزیوں والیں تازہ پھل بہترین نعم البدل ہیں۔ کوشش کریں کہ تمام کھانے تازہ ہوں۔ ڈبے میں بند دودھ یا دوسرے وغیرہ آپ کو طاقت تو فراہم کرتے ہیں لیکن ان سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو تازہ اور خالص اشیاء سے ہوتے ہیں۔

دوران حمل میں بعض خواتین کو قبض کی شکایت

